ترتیب و تہذیب اور اہم اضافوں سے مزین

حافظ صلاح الدین یوسف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

خواتین
کے
امتیازی مسائل

نئی ترتیب و تہذیب
اور
اہم اضافوں سے مزیّن
علمی و تحقیقی ایڈیشن

خواتین کے امتیازی مسائل

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ
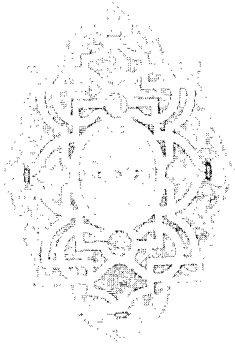
دارُالسّلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شارجہ • لاھور • کراچی
اسلام آباد • لندن • ھیوسٹن • نیو یارک

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

پرنس عبدالعزیز بن جلاوی سٹریٹ پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب

فون: 4033962-4043432 1 00966 فیکس: 4021659 www.darussalamksa.com

Email: darussalam@awalnet.net.sa info@darussalamksa.com

الریاض • العلیا فون: 4614483 1 00966 فیکس: 4644945 • الملز فون: 4735220 1 00966 فیکس: 4735221
• سویدی فون: 4286641 1 00966 • سویلم فون/فیکس: 2860422 1 00966

جدہ فون: 6879254 2 00966 فیکس: 6336270 مدینہ منورہ فون: 8234446,8230038 4 00966 فیکس: 8151121 04

الخبر فون: 8692900 3 00966 فیکس: 8691551 3 00966 خمیس مشیط فون/فیکس: 2207055 7 00966

ینبع البحر فون: 0500887341 فیکس: 8691551 قصیم (بریدہ) فون: 0503417156 فیکس: 3696124 6 00966

امریکہ • نیویارک فون: 5925 625 718 001 • ہیوسٹن: 0419 722 713 001 کینیڈا • نصیر الدین خطاب فون: 4186619 416 001

لندن • دارالسلام انٹرنیشنل پبلیکیشنز لمیٹڈ فون: 77252246 20 0044-85394885 20 0044 • دارالسلام انٹرنیشنل: 7739309 0121 0044

متحدہ عرب امارات • شارجہ فون: 5632623 6 00971 فیکس: 5632624 فرانس فون: 52928 480 01 0033 فیکس: 52997 480 01 0033

انڈیا • دارالسلام انڈیا فون: 45566249 44 0091 موبائل: 12041 98841 0091 • اسلامک بکس انٹرنیشنل فون: 4180 2373 22 0091
• نوری بک ڈسٹری بیوٹرز فون: 4892 2451 40 0091 موبائل: 30850 98493 0091 • ایم ایچ بک سیلرز اینڈ پبلشرز فون: 42157847 44 0091

سری لنکا • دارالکتب فون: 358712 115 0094 • دارالایمان ٹرسٹ فون: 2669197 114 0094

پاکستان ہیڈ آفس و مرکزی شوروم

لاہور 36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ لاہور فون: 00 4 32 372,24 400 372,34 240 373 42 0092 فیکس: 72 540 373 042

• غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 54 200 371 42 0092 فیکس: 03 207 373 042

• Y بلاک، گول کمرشل مارکیٹ، دکان: 2 (گراؤنڈ فلور) ڈیفنس، لاہور فون: 10 926 356 42 0092

کراچی مین طارق روڈ، ڈالمن مال سے (بہادر آباد کی طرف) دوسری گلی کراچی فون: 36 939 343 21 0092 فیکس: 37 939 343 21 0092

اسلام آباد F-8 مرکز، ایوب مارکیٹ، شاہ ویز سنٹر: 13 815 22 51 0092

info@darussalampk.com | www.darussalampk.com

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ
عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ
دستور کے مطابق عورتوں کا (مردوں پر) اسی طرح
حق ہے جس طرح (مردوں کا حق ہے) عورتوں پر

مضامین

عرضِ ناشر

کسی معاشرے اور تمدن کے استحکام کی بنیاد ازدواجی تعلقات کے حسن اور کمال پر منحصر ہے۔ اسلام اس بنیاد کو ان تعلیمات کی روشنی میں پیش کرتا ہے جو کتاب و سنت کے پاکیزہ اور مستند ماخذ سے ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب و معاشرت میں عورت کو انتہائی تعظیم و تکریم کا درجہ دیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رُو سے:

- اس کی پیدائش پر اس کی تربیت کا ایک خاص نصاب اور نظام مقرر کیا گیا ہے۔
- جوان ہونے پر عفت و عصمت کے ساتھ نکاح جیسی تقریب کے حوالے سے اُسے ایک دوسرے خاندان کی تشکیل اور تربیت کی ذمے داری سونپی جاتی ہے۔
- ماں کی حیثیت سے وہ ایک صحت مند، مہذب اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی نسل اسلامی معاشرے کے سپرد کرتی ہے۔

اس کے برعکس مغربی تہذیب اور معاشرہ عورت کی نہایت المناک مظلومیت اور محرومی کی تصویر پیش کرتا ہے۔ وہاں بچیوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے، بے لگام آزادی اور مخلوط معاشرت کے کیا نتائج مرتب ہو رہے ہیں، نیز فرنگی تہذیب و تمدن کے دوسرے اوضاع و اطوار کے نتیجے میں کیسے کیسے جرائم پرورش پا رہے ہیں اور کس قدر ہلاکت انگیز فسادات رُونما ہو رہے ہیں، ان پر خود مغرب کے صاحبِ ضمیر دانشور بھی چیخ اُٹھے ہیں اور نوبت یہ آ گئی ہے کہ حال ہی میں برطانوی چرچ کے ایک درد مند پادری نے برطانوی

ذرائع ابلاغ کو ایک مراسلہ بھیجا ہے۔ اس میں اس نے تجویز پیش کی ہے کہ مغربی معاشرے کو تباہی سے بچانے کے لیے اسلام کے خاندانی نظام سے استفادہ کرنا چاہیے۔

اسلام نے عورت کو اتنا محترم درجہ دیا ہے اور اس کے لیے حقوق و رعایات کا ایسا سامان فراہم کیا ہے جس کی مثال کسی اور مذہب اور معاشرت میں نہیں ملتی۔ بالخصوص وراثت کے احکام میں تو مردوں کے حصے کا تعین کرنے کے لیے عورت کے حصے کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اگر شریعت کے مجموعی مزاج کو پیش نظر رکھا جائے تو وراثت میں بیٹے کی نسبت بیٹی کو نصف حصہ ملنے کا جو قطعی قانون ہے اس کی حکمتیں انسان پر واضح ہو جاتی ہیں۔ اس کا اندازہ محض اس بات سے لگائیے کہ گھر کی معاشی ذمہ داریاں، اہل خانہ کی خوراک و پوشاک، بچوں کی تعلیم و تربیت، ان کی صحت کی حفاظت، علاج و معالجہ نیز ان کے شادی و نکاح کے معاملات عورت کے نہیں مرد کے ذمے ہیں۔ ان مصارف کی وجہ سے مرد کی جائیداد تو مسلسل کم ہوتی رہے گی مگر عورت کا حصہ نہ صرف برقرار رہے گا بلکہ بعض حالات میں اس کی حقیقی منفعت مرد کے حصے سے بھی بڑھ جائے گی۔ ذرا اسلام میں خاتون کی منزلت پر غور فرمائیے۔ اگر وہ بیٹی ہے تو اس کی کفالت والدین کے ذمے ہے، بیوی ہے تو اس کی کفالت شوہر کی ذمہ داری ہے اور اگر ماں ہے تو اولاد اس کے لیے سامان راحت فراہم کرے گی، اگر بہن ہے تو بھائی اس کی نگہداشت اور ضروریات کے تکفل کے خواہاں ہوں گے۔ یوں عورت زندگی کے کسی درجے، کسی مرحلے اور عمر کی کسی بھی سطح پر کسی طرح بھی معاشی یا معاشرتی پریشانی کا شکار نہیں ہوتی۔ حفاظت، عافیت اور طمانیت کا یہ حصار، اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین مہیا نہیں کرتا۔

بدقسمتی سے بعض اسلامی ممالک میں مقامی اور علاقائی رسوم و رواج کو عالمگیر اسلامی تہذیب و معاشرت کی اقدار و روایات سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ شریعت سے متصادم یہ

روایات سراسر جہالت پر مبنی ہیں۔ اگر حقیقی اسلام کو سمجھا جائے اور شریعت کے ضابطے پیش نظر رکھے جائیں تو معاشرتی زندگی میں جو حقوق اسلام عورت کو عطا کرتا ہے، وہ کسی دوسرے دین یا تہذیب میں دستیاب ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ مثلاً:

- مرد کے طلاق کے حق کے مقابلے میں عورت کو خلع کا حق عطا کرنا، عدل کی بہترین صورت ہے۔
- شادی کے موقع پر عورت کو ادائے مہر حسنِ سلوک کا بہترین عمل ہے۔
- شادی پر ولیمے کی تقریب کا انعقاد، دلہن کے استقبال کا بہترین اور بابرکت اسلوب ہے۔
- پھر قرآن مجید نے دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار دے کر انھیں ایک دوسرے کے اعتبار اور وقار کا ضامن ٹھہرایا ہے اور ان کی سماجی حیثیت کا تعین کر دیا ہے۔

آج دنیا میں حقوق نسواں کے نام پر بڑی بڑی تحریکیں اٹھائی جا رہی ہیں مگر عورت سے بڑھ کر کوئی مظلوم نہیں۔ اسلام نے عورت کے لیے جو دائرۂ عمل بنایا ہے، اس میں عزت اور عافیت کا مکمل انتظام موجود ہے۔ اس نے عبادت، وراثت، نکاح اور شہادت جیسے موضوعات پر جن ضوابط کا تعین کیا ہے، وہ سب عورت کے صنفی حالات اور نسوانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔

خواتین کے انھی امتیازی مسائل کی حکمتوں اور فوائد پر یہ کتاب ممتاز دینی سکالر حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ کے قلم کا شاہکار ہے۔ جس کا اب یہ دوسرا ایڈیشن نہایت مفید اضافوں اور حسنِ طباعت کی نئی سج دھج کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے مطالعے سے مغربیت زدہ لوگوں کا اٹھایا ہوا وہ گرد و غبار کافور ہو جائے گا، جو اسلامی تعلیمات سے بے خبری کے نتیجے میں پھیلایا جا رہا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ محترم خواتین ہی کے لیے نہیں، مردوں کے لیے بھی ضروری ہے

تا کہ وہ اپنی خانگی زندگی میں اسلامی احکام پر بخوبی عمل کر سکیں۔

میں اس کتاب کی اشاعتِ نو پر مدیر دارالسلام لاہور عزیزی حافظ عبدالعظیم اسد، فاضل مصنف اور شعبہ فقہ ومتفرقات کے انچارج حافظ محمد ندیم اور ان کے معاونین کرام پروفیسر عبدالرحمٰن ناصر، مولانا مشتاق احمد، مولانا تنویر احمد اور کمپوزنگ سیکشن کے محمد رمضان شآد، خرم شہزاد، ابومصعب کا شکر گزار ہوں اور ان کی کاوشوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے بہترین اجر کی دعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس علمی کاوش کو تمام مسلمانوں کے لیے مفید بنائے۔ آمین یارب العالمین۔

خادم کتاب وسنت

عبدالمالک مجاہد

مینجنگ ڈائریکٹر دارالسلام، الریاض، لاہور

اگست 2008ء

عرض مؤلف

زیر نظر کتاب ''خواتین کے امتیازی مسائل'' ...... ''عورتوں کے امتیازی مسائل و قوانین'' کے نام سے چند سال پہلے شائع ہوئی تھی اب یہ اس کا دوسرا ایڈیشن ہے، یہ کتاب راقم کے مختلف اوقات میں تحریر کیے گئے مضامین کا مجموعہ ہے، مثلاً: عورت کی سربراہی کا مسئلہ، جو اس کتاب میں شامل ہے، ان مضامین پر مشتمل ہے جو پہلی مرتبہ بے نظیر بھٹو کے پاکستان کے وزیر اعظم (یا وزیرۂ عظمیٰ) بننے کے فوراً بعد تحریر کیے گئے تھے، اسی لیے اس کے جواز میں اس وقت جو جو ''دلائل'' یا مغالطات وشبہات پیش کیے گئے، ان مضامین میں ان پر بحث وتبصرہ ہے۔ اسی طرح جنرل ضیاء الحق کے دور میں جب حدود وقصاص کا آرڈی ننس نافذ کیا گیا، جس میں شریعت کے عین مطابق عورت کی گواہی کو مرد کی گواہی کے مقابلے میں نصف قرار دیا گیا، جیسا کہ شرعی دلائل کی رُو سے علمائے اسلام کا موقف ہے، تو مغرب زدہ طبقے نے اس کے خلاف بہت شور مچایا اور اسے عورت کی توہین قرار دیا، حتی کہ اس نے آرڈی ننس کی اس شق کو شرعی عدالت میں چیلنج کر دیا۔ راقم نے اس وقت شرعی عدالت کی درخواست پر اس پر ایک مفصل مقالہ تحریر کیا تھا، اس کا ایک حصہ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔

عورت کی نصف میراث پر سندھ ہائی کورٹ کے ایک جج نے ژاژ خائی کی تھی اور اپنے ذہنی ارتداد کا اظہار کیا تھا، اس پر بھی راقم نے ایک تبصرہ کیا تھا۔ 1976ء میں مسٹر بھٹو

کے دور حکومت میں قائم کردہ ایک خواتین کمیشن کی تجاویز پر تبصرہ ہے۔ اسی طرح پرویز مشرف کے دور میں حدود آرڈی ننس کا تیا پانچہ کر کے جو ''تحفظ حقوق نسواں ایکٹ'' نافذ کیا گیا ہے، اس کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ امریکہ میں وقوع پذیر ہونے والے فتنۂ امامتِ زن پر تبصرہ ہے جو اسلامی تاریخ کے چودہ سو سال میں پہلی مرتبہ مغربی استعمار کی سازشوں اور شرارتوں کے نتیجے میں ظہور میں آیا ہے۔ آخر الذکر تین مضامین اس ایڈیشن میں مزید اضافہ ہیں۔ اسی طرح دیگر وہ مضامین ہیں جن میں مرد و عورت کے درمیان شریعت کے امتیاز کردہ احکام و مسائل پر بحث اور اس فرق و امتیاز کی ان حکمتوں کا بیان ہے جو ان میں پنہاں ہیں اور ان حکمتوں اور فوائد ہی کی وجہ سے اسلام کی تعلیمات، دیگر مذاہب و ادیان سے مختلف اور ممتاز ہیں۔ اس قسم کے 17 مسائل ہیں جو اس کتاب میں شامل ہیں۔ یہ سب وہ مسائل ہیں جن میں شریعت اسلامی نے مرد اور عورت کے درمیان امتیاز کیا ہے۔ ان مَابِهِ الْاِمْتِیَاز مسائل میں یہ فرق کیوں ہے؟ اور ان میں کیا حکمتیں ہیں؟ یہی اس کتاب کا موضوع ہے۔

مغربی استعمار کا اس وقت جو سیاسی استبداد اور فکری غلبہ ہے، اس کی وجہ سے اس کی کھوکھلی اور حیا باختہ تہذیب کا اثر و نفوذ بھی عالم اسلام میں روز افزوں ہے، حالانکہ اس مغربی تہذیب کا اسلامی تہذیب سے قدم قدم پر ٹکراؤ ہوتا ہے، لیکن بدقسمتی سے اسلامی ملکوں پر جو قیادت مسلط ہے چاہے وہ فوجی ہو یا سیاسی۔ ان کے فکر و نظر کے سوتے مغربی ہیں، ان کا ذہنی سانچہ مغرب کے کارخانے کا ڈھلا ہوا ہے اور وہ از فرق تا بہ قدم مغربیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس لیے انھوں نے وہی تعلیمی نصاب، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مسلط کیا ہوا ہے جو مسلمانوں کو مسلمان نہ رہنے دینے کے لیے ان کے ایک مفکر لارڈ میکالے نے برصغیر پاک و ہند کے باشندوں کے لیے تجویز کیا تھا۔ اس کا

نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل اپنے جامع و نافع پُر حکمت دین اور اس کی بہترین تعلیمات سے بیزار اور مغربی تہذیب کی پرستار ہے۔

عورتوں کے ان امتیازی مسائل پر بھی یہ طبقہ چیں بہ جبیں ہوتا، ناک بھوں چڑھاتا اور انگشت نمائی کرتا رہتا ہے۔ بنا بریں ضرورت محسوس ہوئی کہ اسلام کی مذکورہ ممتاز تعلیمات کے امتیازات اور ان کی خوبیوں اور حکمتوں کو واضح کیا جائے اور ان اعتراضات کا جائزہ لیا جائے جو ساحرانِ مغرب کے شکار اور شاہدانِ یورپ کی عشوہ طرازیوں کے اسیر حضرات کی طرف سے ان تعلیمات پر کیے جاتے ہیں، تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ عورت کے خلاف امتیازی مسائل نہیں، بلکہ مسلمان عورت کا حقیقی اعزاز، امتیاز اور تشخص انھی تعلیمات کی بدولت استوار اور اُجاگر ہوتا ہے اور اس کے احترام و تقدس کی ضامن یہی تعلیمات ہیں۔

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

(حافظ) صلاح الدین یوسف

جمادی الاخریٰ 1429ھ جون 2008ء
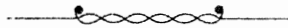
اسلام میں عورت کا مقام

اسلام سے قبل عورت کی جو حالت تھی، محتاجِ وضاحت نہیں، اہل علم اس سے پوری طرح باخبر ہیں۔ اسلام نے اسے قعرِ مذلت سے نکالا اور عزت و احترام کے مقام پر فائز کیا۔ وہ وراثت سے محروم تھی، اسے وراثت میں حصے دار بنایا۔ نکاح وطلاق میں اس کی پسندیدگی و ناپسندیدگی کا قطعاً کوئی دخل نہ تھا، اسلام نے نکاح وطلاق میں اسے خاص حقوق عطا کیے۔ اسی طرح اسے وہ تمام تمدنی ومعاشرتی حقوق عطا کیے جو مَردوں کو حاصل تھے۔

عورت کی بابت اسلامی تعلیمات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

عورت کے شرف و وقار کے تحفظ کے لیے اسلامی تعلیمات کا خلاصہ

① بحیثیت انسان عورت بھی مرد ہی کی طرح انسانی شرف و احترام کی مستحق ہے۔ اس لحاظ سے مرد وعورت کے مابین کوئی فرق نہیں۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے:

﴿خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾

”تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا۔“[1]

اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّمَا النِّسَاءُ شَقَائِقُ الرِّجَالِ»

---

[1] النسآء 4:1 .

''عورتیں مردوں ہی کی شقیقہ (ہم جنس) ہیں۔''[1]

''شقیقہ'' کا مطلب ہے ''پیدائش اور طبیعت میں یکساں ہونا۔'' چنانچہ امام خطابی لکھتے ہیں:

''(اس حدیث سے مراد ہے کہ) عورتیں پیدائش اور طبعی اوصاف میں مَردوں ہی کی طرح ہیں، گویا کہ وہ مردوں ہی سے نکلی ہوئی ہیں۔''[2]

یوں اسلام نے عورت کے بارے میں اس تصور کو کہ عورت مرد کے مقابلے میں ذلیل وحقیر مخلوق ہے، باطل قرار دیا اور واضح الفاظ میں صراحت کر دی کہ تکریمِ آدمیت اور شرف انسانیت کے لحاظ سے مرد وعورت میں فرق روا نہیں رکھنا چاہیے۔

② اسی بنیاد پر، اسلام میں وجہ فضیلت اور وجہ ذلت یہ نہیں ہے کہ فلاں مرد ہے، اس لیے افضل ہے اور فلاں عورت ہے، اس لیے ذلیل ہے بلکہ شرف وفضل کا معیار ایمان وتقویٰ ہے۔ فرمایا:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾

''اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے، جو تم میں سب سے زیادہ متقی اور پرہیز گار ہے۔''[3]

اس نکتے کو قرآن کریم نے دوسری جگہ کھول کر بیان فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً ۖ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝﴾

''جس کسی نے بھی، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، عمل صالح کیا درآں حالیکہ وہ مومن ہے تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ان کے بہترین عملوں کا

---

1 سنن أبي داود، الطهارة، باب في الرجل يجد البلة في منامه، حديث: 236.
2 معالم السنن: 162/1. 3 الحجرات 13:49.

انھیں ضرور بدلہ دیں گے۔''[1]

اور اس مفہوم کو سورۂ احزاب میں مزید تفصیل سے بیان کیا۔ فرمایا:

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾

''بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں، راست گو مرد اور راست گو عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں، صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں، روزے دار مرد اور روزے دار عورتیں، شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں، اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور اللہ کو بہت یاد کرنے والی عورتیں، اللہ تعالیٰ نے ان سب کے لیے مغفرت اور اجر عظیم تیار کیا ہے۔''[2]

غرض ایمان اور اعمالِ صالحہ، جو فلاحِ ابدی کے ضامن ہیں، ان میں مرد و عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ جو بھی اپنی سیرت و کردار کو اس سانچے میں ڈھال لے گا، وہ اللہ کی بارگاہ میں سرخرو ہوگا اور جو ایمان و عمل صالح سے محروم ہوگا، وہ مستحق عذاب ہوگا۔ قطع نظر اس بات کے کہ اس کا تعلق صنف ذکور سے ہے یا صنف اناث سے۔

③ اسلام سے قبل لڑکی کی ولادت کو منحوس سمجھا جاتا تھا حتی کہ بعض درندہ صفت افراد لڑکی کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کے اس رویے کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

[1] النحل 97:16. [2] الأحزاب 35:33.

﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۚ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ﴾

''جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی نوید سنائی جاتی ہے تو اس کا چہرہ (مارے غم اور افسوس کے) سیاہ ہو جاتا ہے اور دل میں وہ گھٹ رہا ہوتا ہے وہ اس خبر کو برا سمجھتے ہوئے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس ذلت کو برداشت کرے یا اس کو مٹی میں دبا دے۔''[1]

اسلام نے ان کے اس رویے کی سخت مذمت کی اور بچیوں کو اس طرح زندہ درگور کرنے سے یہ کہہ کر منع فرمایا کہ اگر کسی نے اس فعل شنیع کا ارتکاب کیا تو اس سے بارگاہ الٰہی میں باز پرس ہوگی۔

﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝﴾

''اور جب زندہ درگور کردہ لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم میں قتل کی گئی۔''[2]

نبی اکرم ﷺ نے بھی لڑکے کے مقابلے میں لڑکی کو حقیر سمجھنے اور اسے زندہ درگور کرنے کی مذمت بیان فرمائی اور بچیوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کے فضائل بیان فرمائے۔ فرمایا:

«مَنْ كَانَتْ لَهُ أُنْثٰى فَلَمْ يَئِدْهَا وَلَمْ يُهِنْهَا وَلَمْ يُؤْثِرْ وَلَدَهُ عَلَيْهَا قَالَ: يَعْنِي الذُّكُورَ ـ أَدْخَلَهُ اللهُ الْجَنَّةَ»

''جس کے ہاں لڑکی ہوئی اس نے اسے زندہ درگور کیا نہ اسے حقیر سمجھا اور نہ لڑکے کو اس پر ترجیح دی تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔''[3]

اور فرمایا:

---

1 النحل 59,58:16 . 2 التكوير 9,8:81 . 3 سنن أبي داود، الأدب، باب فضل من عال يتامى، حديث: 5146، إسناده ضعيف، ضعفه الألباني وعليزئى .

«مَنْ عَالَ ثَلَاثَ بَنَاتٍ، فَأَدَّبَهُنَّ وَزَوَّجَهُنَّ، وَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ، فَلَهُ الْجَنَّةُ»

''جس نے تین لڑکیوں کی پرورش کی، ان کی تعلیم و تربیت کی، ان کی شادیاں کیں اور ان کے ساتھ حسن سلوک کیا تو اس کے لیے جنت ہے۔''[1]

ایک اور روایت میں یہ الفاظ اس طرح ہیں:

«ثَلَاثُ أَخَوَاتٍ أَوْ ثَلَاثُ بَنَاتٍ، أَوِ ابْنَتَانِ أَوْ أُخْتَانِ»

''جس نے تین بہنوں یا تین بیٹیوں یا دو بیٹیوں یا دو بہنوں کی پرورش کی (اس کے لیے جنت ہے۔'')[2]

اس مفہوم کی متعدد روایات کتب حدیث میں موجود ہیں جن میں لڑکیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اسلام کی انھی تعلیمات و ہدایات کا نتیجہ ہے کہ بہت سے گھرانوں میں اگر چہ جہالت کی وجہ سے لڑکیوں کی پیدائش پر کراہت کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن جہاں تک ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا تعلق ہے، کسی بھی مسلم گھرانے میں اس میں کوتاہی نہیں کی جاتی اور بچیوں کو شہزادیوں کی طرح پالا اور رکھا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں عورت کی چار حیثیتیں ہیں۔ وہ کسی کی بیٹی ہے، کسی کی بہن ہے، کسی کی بیوی اور کسی کی ماں ہے۔ اسلام نے ان چاروں حیثیتوں میں اس کی عزت و احترام کی تلقین و تاکید کی ہے۔ بیٹی اور بہن کی حیثیت سے اس کی تعلیم و پرداخت کا مختصر ذکر تو گزر چکا ہے۔ بہ حیثیت بیوی کے اس کے لیے جو تعلیم دی گئی ہے، وہ حسب ذیل آیات و احادیث سے واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

1 سنن أبي داود، الأدب، باب في فضل من عال يتامٰى، حديث: 5147. 2 سنن أبي داود، الأدب، باب في فضل من عال يتامٰى، حديث: 5148.

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھارے لیے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمھارے درمیان مودت و رحمت پیدا فرما دی۔''[1]

اس آیت کریمہ میں ایک تو عورت کو مرد کے لیے باعثِ تسکین بتلایا، جس سے اس کی اہمیت و عظمت واضح ہے۔ دوسرے، دونوں صنفوں کے تعلق کی نوعیت کو واضح کیا کہ ان کے مابین کشاکش اور تناؤ کی بجائے الفت و محبت اور شفقت و رحمت کا رشتہ قائم ہونا اور رہنا چاہیے۔ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے عورت کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید اس طرح فرمائی:

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝﴾

''اور عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اگر وہ تمھیں ناپسند ہوں (تب بھی ان سے نباہ کرو) ہوسکتا ہے کہ جس چیز کو تم ناپسند کرتے ہو، اس میں اللہ تعالیٰ خیر کثیر پیدا فرما دے۔''[2]

ایک اور مقام پر عورت کے حقوق کا ان الفاظ میں تذکرہ فرمایا:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾

''ان عورتوں کے لیے (مردوں پر) معروف طریقے کے مطابق وہی (حقوق) ہیں جو عورتوں پر (مردوں کے لیے) عائد ہوتے ہیں۔''[3]

اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ نے بھی اپنی امت کو بڑی تاکید فرمائی ہے۔

---

1 الروم 21:30 . 2 النسآء 19:4 . 3 البقرة 228:2 .

آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ مِنْ أَكْمَلِ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَأَلْطَفُهُمْ بِأَهْلِهِ»

''کامل ترین مومن وہ ہے جو اخلاق میں سب سے بہتر اور اپنے بیوی بچوں پر سب سے زیادہ مہربان ہو۔''[1]

اور فرمایا:

«خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ، وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي»

''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی کے حق میں سب سے بہتر ہے اور میں اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہوں۔''[2]

حجۃ الوداع کے موقع پر نبی ﷺ نے جو اہم باتیں اپنی امت کو ارشاد فرمائیں، ان میں ایک یہ بھی تھی:

«اِسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَإِنَّهُنَّ عِنْدَكُمْ عَوَانٍ»

''عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، وہ تمھارے پاس اسیر (قیدی) ہیں۔''[3]

ایک حدیث میں نیک عورت کو بہترین متاع قرار دیا گیا ہے۔

«خَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ»[4]

ماں کی حیثیت سے اسلام میں عورت کا مقام بہت اونچا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ﴾

---

1 جامع الترمذي، الإيمان، باب في استكمال الإيمان والزيادة والنقصان، حديث: 2612 .

2 سنن ابن ماجه، النكاح، باب حسن معاشرة النساء، حديث: 1977 . 3 سنن ابن ماجه، النكاح، باب حق المرأة على الزوج، حديث: 1851 . 4 صحيح مسلم، النكاح، باب خير متاع الدنيا المرأة الصالحة، حديث: 1469 .

''اورہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں (حسن سلوک کی) بڑی تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری برداشت کرتے ہوئے حمل کی مدت پوری کی اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے (یہ اس لیے) کہ وہ میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرے۔''[1]

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا﴾

''اورہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے، اس کی ماں نے اسے مشقت کے ساتھ حمل میں رکھا اور مشقت و تکلیف کے ساتھ اس کو جنا۔''[2]

ان دونوں آیات میں اگرچہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم اور اس کی تاکید کی گئی ہے لیکن ماں کے حمل و ولادت کی تکلیف کا بطور خاص جس طرح ذکر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں کا حق باپ سے کئی گنا زیادہ ہے اور حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا:

«مَنْ أَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صَحَابَتِي؟ قَالَ: أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ثُمَّ أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ثُمَّ أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ثُمَّ أَبُوكَ»

''میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپ نے فرمایا: ''تمھاری ماں۔'' اس نے پوچھا: پھر کون؟ آپ نے فرمایا: ''تمھاری ماں۔'' اس

1 لقمان 14:31 . 2 الأحقاف 15:46 .

نے پھر پوچھا: پھر کون؟ آپ نے فرمایا: ''تمھاری ماں۔'' اس نے کہا: پھر کون؟ آپ نے جواب میں فرمایا: ''پھر تمھارا باپ۔''[1]

اس حدیث میں تین مرتبہ ماں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تاکید فرمانے کے بعد چوتھی مرتبہ باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ تین تکلیفیں ایسی ہیں جو صرف ماں برداشت کرتی ہے، بچے کے باپ کا اس میں حصہ نہیں۔ ایک حمل کی تکلیف جو نو مہینے عورت برداشت کرتی ہے۔ دوسری وضع حمل (زچگی) کی تکلیف، جو عورت کے لیے موت و حیات کی کشمکش کا ایک جاں گسل مرحلہ ہوتا ہے۔ تیسری رضاعت (دودھ پلانے) کی تکلیف، جو دو سال تک محیط ہے۔ بچے کی شیر خوارگی کا یہ زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ ماں راتوں کو جاگ کر بھی بچے کی حفاظت و نگہداشت کا مشکل فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ اس دوران میں بچہ بول کر اپنی ضرورت بتلا سکتا ہے نہ اپنی کسی تکلیف کا اظہار ہی کر سکتا ہے۔ صرف ماں کی ممتا اور اس کی بے پناہ شفقت اور پیار ہی اس کا واحد سہارا ہوتا ہے۔ عورت یہ تکلیف بھی ہنسی خوشی برداشت کرتی ہے۔

یہ تین مواقع ایسے ہیں کہ صرف عورت ہی اس میں اپنا عظیم کردار ادا کرتی ہے اور مرد کا اس میں حصہ نہیں۔ انھی تکالیف کا احساس کرتے ہوئے شریعت نے باپ کے مقابلے میں ماں کے ساتھ حسن سلوک کی زیادہ تاکید کی ہے۔

شادی سے قبل اور شادی کے بعد

شادی سے قبل اس کی تعلیم و تربیت کی فضیلت اور شادی کے بعد عورت سے حسن معاشرت کی تاکید کی تفصیل بیان ہو چکی ہے لیکن عورت کے لیے دو مرحلے اس کی زندگی

[1] صحيح البخاري، الأدب، باب من أحق الناس بحسن الصحبة، حديث:5971، وصحيح مسلم، البر والصلة والأدب، باب بر الوالدين و أيهما أحق به، حديث: 2548 واللفظ له.

میں بڑے اہم موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک مرحلہ شادی سے قبل رشتۂ ازدواج قائم کرنے میں اس کی پسند اور ناپسند کا مسئلہ ہے اور دوسرا مرحلہ وہ ہے کہ شادی کے بعد اگر خاوند صحیح کردار کا حامل ثابت نہ ہوتو اس سے گلو خلاصی کی کیا صورت ہے؟ ان دونوں مرحلوں کے لیے بھی اسلام نے عورت کے جذبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت معقول ہدایات دی ہیں تاکہ عورت پر کسی طرح سے بھی جبر وظلم نہ ہو سکے۔

(۱) نکاح میں عورت کی پسند اور اس کے اختیار کے مسئلے میں بالعموم بڑی افراط وتفریط پائی جاتی ہے۔ کہیں تو عورت کو بالکل بے دست و پا بنا دیا گیا ہے، اس کی پسند و ناپسند کی قطعاً کوئی پروا نہیں کی جاتی اور کہیں ایسا بااختیار بنا دیا گیا ہے کہ ماں باپ اور اس کے سرپرستوں کی رائے اور مشورے کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ اسلام نے اس افراط وتفریط کے مقابلے میں یہ راہِ اعتدال اختیار کی کہ ایک طرف ولی (سرپرست) کی ولایت اور اجازت ضروری قرار دی اور فرمایا:

«لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ»

''ولی کے بغیر کوئی نکاح نہیں ہے۔''[1]

اس حدیث کی روشنی میں اکثر ائمہ کے نزدیک ایسا نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا، تاہم فقہاء کا ایک گروہ اس حدیث کی تضعیف یا تاویل کی وجہ سے انعقادِ نکاح کا تو قائل ہے لیکن اس کے ناپسندیدہ ہونے میں اسے بھی کلام نہیں اور بعض شکلوں میں ان کے نزدیک سرپرستوں کو ایسا نکاح فسخ کرانے کا اختیار رہتا ہے۔[2]

دوسری طرف عورت کی رضامندی اور اس کی اجازت بھی ضروری قرار دی گئی ہے اور فرمایا:

1 سنن أبي داود، النكاح، باب في الولي، حديث: 2085 . تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، فتح الباري : 184/9 تحت حديث: 5127-5130,5135 ، ونيل الأوطار: 6/252-256 .

2 فتح القدير لابن الهمام: 255/3 .

«لَا تُنْكَحُ الْأَيِّمُ حَتَّى تُسْتَأْمَرَ»

''بیوہ عورت کا نکاح اس کے مشورے کے بغیر نہ کیا جائے۔''[1]

نیز فرمایا:

«لَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتَّى تُسْتَأْذَنَ»

''کنواری لڑکی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے۔''[2]

کنواری عورت کے اندر شرم و حیا زیادہ ہوتی ہے، اس لیے اس سے اجازت طلبی کا مسئلہ مشکل تھا، اسے بھی شریعت نے اس طرح حل فرما دیا کہ ''کنواری کی خاموشی ہی اس کی اجازت اور رضامندی ہے۔''[3]

عورت کی رضامندی اور اس کی اجازت کی شریعت میں کتنی اہمیت ہے، اس کا اندازہ عہد رسالت مآب ﷺ کے ایک واقعے سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک خاتون خنساء بنت خِذام انصاریہ کا نکاح ان کے والد نے ان کی اجازت کے بغیر کر دیا۔ انھیں یہ رشتہ ناپسند تھا۔ انھوں نے آ کر نبی ﷺ کی خدمت میں باپ کی شکایت کی تو آپ نے اسے ناپسند فرمایا اور نکاح رد کر دیا، یعنی کالعدم قرار دے دیا۔[4]

⁘ شادی کے بعد اگر خاوند عورت کے نزدیک ناپسندیدہ ہو تو اس سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے لیے، اسی طرح عورت کو خلع کا حق دیا گیا ہے، جس طرح مرد کو ناپسندیدہ بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے طلاق کا حق حاصل ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مرد کو تو

1 صحيح البخاري، النكاح، باب لا ينكح الأب وغيره البكر والثيب إلا برضاهما، حديث: 5136. 2 صحيح البخاري، النكاح، باب لا ينكح الأب وغيره البكر والثيب إلا برضاهما، حديث: 5136. 3 صحيح البخاري، النكاح، باب لا ينكح الأب وغيره البكر والثيب إلا برضاهما، حديث: 5136. 4 صحيح البخاري، النكاح، باب إِذَا زَوَّجَ الرَّجُلُ ابْنَتَهُ وَهِيَ كَارِهَةٌ فَنِكَاحُهُ مَرْدُودٌ، حديث: 5138.

طلاق کا حق ہے لیکن اس کے مقابلے میں عورت مجبور ہے۔ وہ اگر خاوند کو ناپسند کرتی ہے تو اس کے لیے اس سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ یہ تصور صحیح نہیں۔ عورت کو مرد کے حق طلاق کے مقابلے میں اسلام نے حق خلع عطا کیا ہے، البتہ اس نے مرد و عورت دونوں کو یہ تاکید کی ہے کہ دونوں اپنا یہ حق انتہائی ناگزیر حالات ہی میں استعمال کریں۔ محض ذائقہ بدلنے کے لیے استعمال نہ کریں۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو سخت گناہ گار ہوگا۔

اسی طرح شریعت اسلامیہ نے مرد کو طلاق دینے کے بعد رجوع کا حق دیا ہے اس میں عورت پر ظلم کی صورت ہوسکتی تھی کہ طلاق دینے کے بعد عدت کے اندر بار بار مرد رجوع کر لے اور یوں عورت کو نہ آباد کرے اور نہ مکمل آزاد کرے اور وہ بیچ میں معلق رہے، جس طرح زمانۂ جاہلیت میں عورت کو اس طرح تنگ کیا جاتا تھا کہ وہ اس کو طلاق دیتے تھے نہ آباد کرتے تھے بلکہ طلاق دیتے اور عدت گزرنے سے قبل ہی رجوع کر لیتے، پھر طلاق دیتے اور پھر عدت گزرنے سے قبل رجوع کر لیتے اور یہ سلسلہ سالہا سال تک اس طرح معلق چلتا رہتا۔ شریعت نے اس ظلم کے انسداد کے لیے حق طلاق کو محدود کر دیا کہ مرد دو مرتبہ تو طلاق دینے کے بعد رجوع کر سکتا ہے لیکن تیسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد رجوع کا بالکل حق نہیں رہتا۔ ماسوا اس کے کہ وہ دوسرے خاوند سے نکاح کرے اور وہ اپنی مرضی سے اسے طلاق دے دے۔

یہ چند مختصر اشارات ہیں جن سے واضح ہے کہ اسلام نے عورت کو عزت و احترام کا وہ مقام عطا کیا ہے جو کسی بھی مذہب اور نظام نے نہیں دیا۔

مرد اور عورت کے دائرۂ کار کا اختلاف

اسی طرح اسلام کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے مرد اور عورت دونوں کے دائرۂ کار کو بھی متعین کر دیا ہے۔ اس امر میں تو اختلاف کی کوئی ادنیٰ سی گنجائش بھی

نہیں کہ قدرت نے مرد اور عورت دونوں کو الگ الگ مقاصد کے لیے پیدا فرمایا ہے، لہٰذا دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں صنفوں کی ذہنی و عملی صلاحیتوں میں قدرتی فرق کو بھی تسلیم کیا جائے اور اس فرق کی بنیاد پر دونوں کے دائرۂ کار کے اختلاف کو بھی۔ اگرچہ دونوں اپنے اپنے دائرے میں انسانی زندگی کے لیے ناگزیر اور ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عورت مرد سے بے نیاز نہیں رہ سکتی اور مرد عورت کو نظر انداز کر کے زندگی کی شاہراہ پر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، تاہم دونوں کی ذہنی صلاحیتوں میں فرق ہے، دونوں کا مقصد تخلیق الگ الگ ہے اور دونوں کے دائرۂ کار ایک دوسرے سے مختلف اور جداگانہ ہیں۔

بنابریں شریعت اسلامیہ نے ذہنی و عملی فرق و تفاوت اور دائرۂ کار کے اختلاف کی وجہ سے بہت سی چیزوں میں مرد و عورت کے درمیان فرق ملحوظ رکھا ہے۔ بعض ذمے داریاں صرف مردوں پر عائد کی ہیں، عورتوں کو ان سے مستثنیٰ رکھا ہے۔ اسی طرح بعض خصوصیات سے عورتوں کو نوازا ہے، مردوں کو ان سے محروم رکھا ہے لیکن ان فطری صلاحیتوں کے فرق و تفاوت کا مطلب کسی صنف کی برتری اور دوسری صنف کی کمتری و حقارت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر مرد کے اندر اللہ تعالیٰ نے صلاحیت رکھی ہے کہ وہ عورت کو بارآور کر سکتا ہے لیکن خود بارآور نہیں ہو سکتا، اس کے برعکس عورت کے اندر صلاحیت رکھی ہے کہ وہ بارآور ہو سکتی ہے لیکن وہ بارآور کر نہیں سکتی۔ گویا مرد کے اندر تخلیق و ایجاد کا جوہر رکھا گیا ہے تو عورت کو اس تخلیق و ایجاد کے ثمرات و نتائج سنبھالنے کا سلیقہ اور ہنر عطا کیا گیا ہے۔ اسی طرح اگر مرد کو حکمرانی و جہانبانی کا حوصلہ عنایت کیا گیا ہے تو عورت کو گھر بسانے کی قابلیت بخشی گئی ہے۔ مرد کے اندر قوت و عزیمت کے اوصاف رکھے گئے ہیں تو عورت کو دلکشی و دل ربائی کا وصف عطا کیا گیا ہے، چنانچہ اس کارخانۂ عالم کی زیب و زینت کسی ایک ہی صنف کے اوصاف سے نہیں ہے بلکہ دونوں قسم کے اوصاف سے ہے اور دونوں

ہی انسانی معاشرے کے اہم رکن ہیں۔

انسانی معاشرے کا وجود اور بقا ان دونوں میں سے کسی ایک ہی پر منحصر نہیں ہے کہ ساری اہمیت بس اسی کو دے دی جائے اور دوسرے کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے بلکہ اس پہلو سے دونوں مساوی حیثیت رکھتے ہیں، البتہ خصوصیات اور صلاحیتیں دونوں الگ الگ لے کر آئے ہیں، لہٰذا مرد جو کام کر سکتے ہیں، عورتیں وہ سارے کام نہیں کر سکتیں لیکن ایسے مردانہ کام نہ کر سکنا، عورت کی تحقیر نہیں ہے۔ اسی طرح عورت کے بعض کام مرد نہیں کر سکتے تو اس میں ان کے لیے حقارت کا کوئی پہلو نہیں۔ دونوں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق اعمال کے مکلّف ہیں، اسی لیے اسلام کی منشا یہ ہے کہ دونوں صنفیں اپنے اپنے دائرے میں کام کر کے منشائے قدرت کی تکمیل کریں اور ایک دوسرے کے کاموں میں دخیل ہو کر فسادِ تمدن کا باعث نہ بنیں۔ وہ ایک دوسرے کے معاون ہوں، متحارب نہ ہوں۔ حلیف ہوں، حریف نہ ہوں۔ جو انسانی معاشرہ اس فطری اصول سے انحراف کرے گا، امن وسکون سے محروم ہو جائے گا۔

اس لیے اسلام نے انسانی معاشرے کو فساد سے بچانے کے لیے مرد و عورت دونوں کے دائرۂ کار کو ان کی فطری صلاحیتوں کے مطابق متعین کر دیا ہے۔ مرد کا دائرۂ کار گھر سے باہر اور عورت کا اصل دائرۂ کار گھر کی چار دیواری ہے اور اسی بنیاد پر اس نے مرد اور عورت کے درمیان بہت سے امور میں فرق کیا ہے، جس کی مختصر تفصیل آپ آنے والے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

مرد اور عورت کے درمیان چند بنیادی فرق

① معاشی کفالت کا ذمے دار اور خاندان کا سربراہ

اسلام نے عورت کو کمانے (ملازمت کرنے یا تجارت و کاروبار کرنے) سے مستثنیٰ رکھا ہے اور نان و نفقہ کی ساری ذمے داری مرد پر ڈالی ہے، چنانچہ عورت جب تک غیر شادی شدہ ہے، ماں باپ یا بھائی یا بصورت دیگر چچا وغیرہ اس کے کفیل ہوں گے اور شادی کے بعد اس کا خاوند یا بیٹا۔ اسی اعتبار سے مرد کو عورتوں کا قوام (سربراہ، حاکم اور نگران) کہا گیا ہے۔

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴾

''مرد عورتوں پر قوام (نگران) ہیں، بہ سبب اس کے جو اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور بہ سبب اس کے جو وہ مرد اپنے مالوں سے خرچ کرتے ہیں۔''[1]

مرد کی جس فضیلت کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ چونکہ خاندان کا کفیل وہ ہے اور تجارت و کاروبار اسی کی ذمّے داری ہے۔ اس کو اسی قسم کی صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے اور وہی یہ بوجھ اٹھانے کے قابل بھی ہے، اس لیے اس کی ذمّے داری کی نسبت سے اس کا حق بھی زیادہ ہے اور وہ حق یہ ہے کہ وہ سربراہ خاندان ہو۔ مرد کی اس فضیلت و فوقیت کو دوسری آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ﴾

1 النسآء 34:4.

''مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ (مرتبہ) حاصل ہے۔''[1]

عورت کے لیے پردے کا حکم

اسلام نے عورت کو چونکہ بیرون خانہ کی ذمے داریوں سے مستثنیٰ رکھا ہے، اس لیے اس نے عورتوں کے لیے یہ تاکید کی ہے کہ وہ اپنا وقت گھر کے اندر گزاریں۔

﴿ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى ﴾

''اور تم اپنے گھروں میں ٹِک کر رہو اور پہلے زمانۂ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار کا اظہار نہ کرتی پھرو۔''[2]

اس آیت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا منصب یہ قطعاً نہیں ہے کہ وہ بازار کی تاجر، دفتر کی کلرک، عدالت کی جج، فوج کی سپاہی، کسی افسر کی سیکرٹری، کسی دکان میں ماڈل گرل یا ائرہوسٹس بنے بلکہ اس کے عمل کا حقیقی میدان اس کا گھر ہی ہے، چنانچہ امام جصاص رحمہ اللہ اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں:

«وَفِيهِ الدَّلَالَةُ عَلٰى أَنَّ النِّسَاءَ مَأْمُورَاتٌ بِلُزُومِ الْبَيْتِ مَنْهِيَّاتٌ عَنِ الْخُرُوجِ»

''یہ آیت اس امر پر دلیل ہے کہ عورتیں اپنے گھروں میں ٹک کر رہنے پر مامور ہیں اور باہر نکلنا ان کے لیے ممنوع ہے۔''

یہ آیت ازواج مطہرات کے ضمن میں نازل ہوئی تھی لیکن اس میں جو احکام دیے گئے ہیں وہ تمام مسلمان عورتوں کے لیے عام ہیں، چنانچہ امام جصاص رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں:

«فَهٰذِهِ الْأُمُورُ كُلُّهَا مِمَّا أَدَّبَ اللهُ تَعَالٰى بِهِ نِسَاءَ النَّبِيِّ ﷺ صِيَانَةً لَهُنَّ وَسَائِرُ نِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ مُرَادَاتٌ بِهَا»

1 البقرة 2:228 . 2 الأحزاب33:33 .

”یہ تمام امور وہ ہیں جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو ان کی عزت و حرمت کی حفاظت کے لیے آداب سکھلائے اور ان سے مراد تمام مومن عورتیں ہیں۔“[1]

البتہ ضرورت کے وقت وہ گھر سے باہر نکل سکتی ہیں لیکن پردے کی پابندی کے ساتھ جس کا حکم بھی قرآن مجید میں موجود ہے اور احادیث میں بھی یہ تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

شریعت کی نگاہ میں عورت کے لیے اپنے گھر ٹھہرنے کی جتنی اہمیت ہے، اس کا اندازہ اس سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ عبادات ہوں یا دیگر فرائضِ حیات، ان کو عورت پر اجتماعی شکل میں فرض ہی نہیں کیا گیا ہے۔ نماز جو سب سے اہم عبادت ہے۔ مرد پر تو باجماعت فرض ہے اور بغیر جماعت کے پڑھنے پر سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں لیکن عورت پر نماز تو ضرور فرض ہے لیکن اس کے لیے جماعت ضروری نہیں ہے۔ اگرچہ اسے یہ اجازت تو حاصل ہے کہ اگر وہ مسجد میں آ کر باجماعت نماز پڑھنا چاہتی ہے تو پردے کے اہتمام کے ساتھ آ کر ادا کر سکتی ہے لیکن اسے ترغیب یہ دی گئی ہے کہ اس کے لیے زیادہ بہتر گھر کے اندر ہی نماز پڑھنا ہے بلکہ گھر کے اندر بھی وہ حصہ زیادہ بہتر ہے جو گھر کا زیادہ سے زیادہ اندرونی حصہ ہو، چنانچہ فرمایا:

«خَيْرُ مَسَاجِدِ النِّسَاءِ قَعْرُ بُيُوتِهِنَّ»

”عورتوں کے لیے بہترین مساجد (جائے عبادت) ان کے گھروں کے سب سے اندرونی حصے ہیں۔“[2]

مشہور صحابی حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی اہلیۂ محترمہ حضرت ام حمید رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: میں آپ کے ساتھ نماز پڑھنا پسند

1 أحكام القرآن: 443/3. 2 مسند أحمد: 297/6، حديث: 27077.

کرتی ہوں۔تو آپ نے فرمایا: ''مجھے یقین ہے کہ تمھاری خواہش یہی ہے لیکن تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمھارا اپنے مکان کی کسی تنگ کوٹھڑی میں نماز پڑھنا تمھارے لیے کشادہ کمرے میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور تمھاری جو نماز کمرے میں ادا ہو وہ مکان کے وسط میں ادا کی جانے والی نماز سے اولیٰ ہے اور تمھاری وسط مکان میں پڑھی جانے والی نماز اس نماز سے افضل ہے جو تم اپنے محلے کی کسی مسجد میں پڑھو۔اسی طرح تمھاری جو نماز اپنے محلے کی کسی مسجد میں ادا ہو وہ تمھارے حق میں میری مسجد (مسجد نبوی) میں پڑھی جانے والی نماز سے بہتر ہے۔''

اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن سوید رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی پھوپھی (ام حمید رضی اللہ عنہا) نے اپنے لیے مکان کا سب سے اندرونی اور تاریک حصہ نماز کے لیے متعین کر لیا تھا اور وہیں ساری عمر نماز پڑھتی رہیں۔[1]

جمعہ بھی اجتماعی عبادت کا ایک اہم مظہر ہے۔اس میں بھی عورتیں اگرچہ شرکت کر سکتی ہیں لیکن یہ اجتماعی عبادت بھی عورت پر فرض نہیں ہے۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«اَلْجُمُعَةُ حَقٌّ وَّاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ فِي جَمَاعَةٍ إِلَّا أَرْبَعَةً: عَبْدٌ مَّمْلُوكٌ أَوِ امْرَأَةٌ أَوْ صَبِيٌّ أَوْ مَرِيضٌ»

''جمعہ ہر مسلمان پر با جماعت پڑھنا واجب ہے، البتہ غلام، عورت، بچہ اور مریض اس (وجوب جمعہ) سے مستثنیٰ ہیں۔''[2]

شریعت نے مسلمانوں کو اپنے مرنے والے مسلمان بھائیوں کی نماز جنازہ پڑھنے کی بڑی تاکید کی اور اس کی خاص فضیلت بیان کی ہے لیکن عورتوں کے لیے اس کو ضروری نہیں سمجھا بلکہ ان کو جنازوں میں شرکت سے منع کر دیا گیا۔حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں:

1 مسند أحمد: 371/6. 2 سنن أبي داود، الصلاة، باب الجمعة للمملوك والمرأة، حديث: 1067.

«نُهِينَا عَنِ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ وَلَمْ يُعْزَمْ عَلَيْنَا»

''ہمیں (عورتوں کو) جنازے کی متابعت کرنے سے منع کر دیا گیا ہے، تاہم اس میں زیادہ سختی نہیں کی گئی۔''[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس ضمن میں ابن منیر رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''امام بخاری نے عورتوں کو جنازے کی ممانعت کے متعلق باب اور نماز جنازہ پڑھنے کی فضیلت کے بَاب کے درمیان متعدد ابواب کے ساتھ فاصلہ کر دیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں مرد و عورت کے درمیان فرق ہے اور جنازے میں شرکت کی جو فضیلت ہے، وہ صرف مردوں کے ساتھ خاص ہے۔ عورتیں اس کی مخاطب نہیں کیونکہ عورتوں کو جنازے میں شرکت سے منع کیا گیا ہے۔ یہ ممانعت تحریم یا کراہت کی مقتضی ہے۔ جبکہ فضیلت استحباب پر دال ہے اور تحریم یا کراہت فضیلت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔''[2]

جہاد بھی اسلام کا ایک اہم فریضہ ہے لیکن اسے بھی مردوں ہی پر فرض کیا گیا ہے، عورتوں پر نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

کیا عورتوں پر بھی جہاد فرض ہے؟ آپ نے فرمایا:

«نَعَمْ! عَلَيهِنَّ جِهَادٌ لَا قِتَالَ فِيهِ: اَلْحَجُّ وَالْعُمْرَةُ»

''ہاں! ان پر بھی جہاد فرض ہے لیکن لڑائی والا جہاد نہیں، ان کا جہاد حج اور عمرہ ہے۔''[3]

غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت ام ورقہ بنت نوفل رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: مجھے بھی اجازت دیجیے کہ آپ کے ساتھ جنگ میں چلوں اور زخمیوں اور بیماروں کی دیکھ بھال کا کام کروں، شاید اس طریقے سے اللہ تعالیٰ مجھے بھی رتبۂ شہادت سے

---

1 صحيح البخاري، الجنائز، باب اتباع النسآء الجنازة، حديث:1278 . 2 فتح الباري: 185/3 . 3 سنن ابن ماجه، المناسك، باب الحج جهاد النسآء، حديث:2901 .

سرفراز فرما دے۔ آپ نے فرمایا:

«قَرِّي فِي بَيْتِكِ ، فَإِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ يَرْزُقُكِ الشَّهَادَةَ»

''تم اپنے گھر ہی میں ٹک کر رہو، تمھیں اللہ تعالیٰ ایسے ہی شہادت کا رتبہ عطا فرما دے گا۔''

راوی کا بیان ہے: چنانچہ ان کا نام ہی ''شہیدہ'' پڑ گیا تھا۔[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض غزوات میں چند خواتین اسلام نے حصہ لیا ہے لیکن وہ محض گنتی کی چند عورتیں تھیں اور انھوں نے بھی وہاں جا کر مردوں کے دوش بدوش مورچے سنبھالے تھے نہ توپ و تفنگ سے وہ مسلح تھیں بلکہ صرف پیچھے رہ کر فوجیوں کی خوراک اور مرہم پٹی کا کام کرتی رہی تھیں۔ جس طرح حضرت ام عطیہ انصاریہ رضی اللہ عنہا نے وضاحت کی ہے:

«غَزَوْتُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ سَبْعَ غَزَوَاتٍ ، أَخْلُفُهُمْ فِي رِحَالِهِمْ ، فَأَصْنَعُ لَهُمُ الطَّعَامَ ، وَأُدَاوِي الْجَرْحَى ، وَأَقُومُ عَلَى الْمَرْضٰى»

''میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سات غزوات میں شرکت کی میں ان کے خیموں میں پیچھے رہتی، ان کے لیے کھانا تیار کرتی، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی اور بیمار پرسی کرتی۔''[2]

ان احادیث سے واضح ہے کہ جمعہ، جماعت، جنازہ اور جہاد وغیرہ فرائض میں عورتوں کی شرکت کو ضروری قرار نہیں دیا گیا ہے بلکہ ان کے ساتھ یہ خصوصی رعایت کی گئی ہے کہ

1 سنن أبي داود ، الصلاة ، باب إمامة النساء ، حديث: 591 . 2 صحيح مسلم ، الجهاد ، باب النساء الغازيات ..... الخ ، حديث: 1812 ، وسنن ابن ماجه ، الجهاد ، باب العبيد والنساء يشهدون مع المسلمين ، حديث: 2856 .

گھر بیٹھے ہی انھیں ان فرائض کا اجر و ثواب مردوں ہی کی طرح مل جائے گا بشرطیکہ وہ گھریلو امور پوری ذمے داری سے ادا کریں۔

وراثت میں عورت کا نصف حصہ

وراثت میں بھی مرد و عورت کے درمیان فرق ہے۔

﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾

''مرد کے لیے دو عورتوں کی مثل ہے۔''[1]

اور اس کی وجہ بھی وہی مرد و عورت کے دائرۂ کار کا اختلاف ہے۔ اسلام میں چونکہ نان ونفقہ کا ذمے دار مرد کو بنایا گیا ہے، عورت کو نہیں، اس لیے مرد کی ذمے داریوں کے بوجھ کے حساب سے اسے وراثت میں حصہ بھی دگنا دیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو مرد پر ظلم ہوتا۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے۔

ایک شخص فوت ہو جاتا ہے، اس کے ورثاء میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔ اس کی جائیداد میں سے ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ کے تحت لڑکے کو ایک لاکھ کی رقم ملتی ہے اور لڑکی کو پچاس ہزار روپے۔ لڑکی کے یہ پچاس ہزار روپے نہ صرف محفوظ رہیں گے بلکہ ان میں اضافہ ہوگا اگر وہ اس کو کسی کاروبار میں لگا دے تو نفع آئے گا۔ علاوہ ازیں شادی پر اسے خاوند کی طرف سے مہر ملے گا۔ جس سے اس کی مالی حیثیت میں اضافہ ہی ہو گا، جبکہ اس کے برعکس لڑکے کو اپنی شادی پر بھی خرچ کرنا پڑے گا اور آنے والی بیوی کو مہر بھی ادا کرے گا، اس کے نان نفقہ کا بھی ذمے دار ہوگا اور شاید اپنی بہن کی شادی کا خرچ بھی اسے ہی برداشت کرنا پڑے۔ مکان اگر نہیں ہے تو بیوی بچوں کے لیے مکان کا بھی انتظام کرے گا۔ جبکہ اس کی بہن ان تمام جھمیلوں اور کھکھیڑوں سے محفوظ ہے۔ اس سے

1 النسآء 4:11 .

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام کا نظام وراثت کس طرح حکمت سے پُر اور عدل و انصاف کے عین مطابق ہے۔

مرد کو ایک سے زیادہ چار تک شادیاں کرنے کی اجازت

اسلام میں مرد کو حسب ضرورت و اقتضا ایک سے زیادہ، یعنی چار تک بیویاں رکھنے کا حق حاصل ہے اور مغرب زدہ طبقہ اس پر کتنا بھی چیں بہ جبیں ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے مرد کو یہ حکیمانہ اجازت دے کر انسانی معاشرے کو بہت سی خرابیوں سے بچانے کا اہتمام کیا ہے جس کا اعتراف اب مغرب کے وہ دانشور بھی کر رہے ہیں جن کے ہاں قانونی طور پر تو ایک سے زیادہ بیوی نہیں رکھی جا سکتی لیکن داشتائیں رکھنے اور باہمی رضامندی سے زنا کاری کی عام اجازت ہے۔

عورت کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ بیک وقت کئی خاوندوں کی بیوی بن کر رہے اور اس میں حکمت یہی ہے کہ ایک تو خلقی طور پر عورت مرد کے مقابلے میں کمزور ہے۔ وہ زیادہ مردوں کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی۔ دوسرا سب سے اہم مسئلہ نسب کی حفاظت کا ہے۔ عورتوں کو بھی مردوں کی طرح ایک سے زیادہ خاوندوں کی اجازت ہوتی تو ہونے والا بچہ مجہول النسب رہتا۔ آخر کس کی طرف یقین کے ساتھ اسے منسوب کیا جاتا؟ اس کے علاوہ اس کی متعدد حکمتیں ہیں، جس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

مرد کا حق طلاق اور اس کی حکمت

حق طلاق بھی وہ حق ہے جو اسلام نے مرد کو تو دیا ہے، عورت کو نہیں دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں زود رنج، زود مشتعل اور جلد بازی میں جذباتی فیصلہ کرنے والی ہے، نیز عقل اور دور اندیشی میں کمزور ہے۔ عورت کو بھی اختیار دیے جانے

کی صورت میں، یہ اہم رشتہ جو خاندان کے استحکام و بقا اور اس کی حفاظت و صیانت کے لیے بڑا ضروری ہے، تارِ عنکبوت سے زیادہ پائیدار ثابت نہ ہوتا۔ علمائے نفسیات و طبیعیات بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ علامہ فرید وجدی لکھتے ہیں:

''عورت کی جسمانی ساخت بچوں کی جسمانی ترکیب سے قریب تر ہوتی ہے، اس لیے عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ وہ بچوں ہی کی طرح جلد متأثر اور منفعل ہو جاتی ہے۔ فرحت و کلفت، خوف و مسرت کے احساسات جلد ہی اس پر طاری ہو جاتے ہیں اور چونکہ اس میں عقلیت اور غور و فکر کی قوت کو زیادہ دخل نہیں ہوتا، اس لیے جلد ہی یہ تأثرات اس سے زائل بھی ہو جاتے ہیں اور اکثر دیرپا ثابت نہیں ہوتے۔ اس بنا پر عورت متلون اور غیر مستقل مزاج ہوتی ہے۔''

ایک اور اشتراکی فلسفی کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''عورت کا وجدان مرد کے وجدان سے کمزور ہوتا ہے، جتنی کہ اس کی عقل مرد کی عقل سے کم ہوتی ہے، اس کے اخلاقی پیمانے بھی مرد سے مختلف ہوتے ہیں، اس لیے بالکل ضروری نہیں کہ جس کو وہ اچھا یا برا بتائے، واقعی وہ اچھا یا برا ہی ہو۔''[1]

مشہور حنفی فقیہ علامہ ابن ہمام، عورت کو حق طلاق نہ دیے جانے کے ضمن میں لکھتے ہیں:

«جَعَلَهُ بِيَدِ الرِّجَالِ دُونَ النِّسَاءِ لِاخْتِصَاصِهِنَّ بِنُقْصَانِ الْعَقْلِ وَغَلَبَةِ الْهَوٰى ـ وَمِنْ ذٰلِكَ سَاءَ اخْتِيَارُهُنَّ ـ وَسُرْعِ اغْتِرَارِهِنَّ وَنُقْصَانِ الدِّينِ وَمِنْهُ كَانَ أَكْثَرُ شُغْلِهِنَّ بِالدُّنْيَا وَتَرْتِيبِ الْمَكَائِدِ وَإِفْشَاءِ سِرِّ الْأَزْوَاجِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ»

[1] دائرۃ المعارف (عربی) فرید وجدی: 596/8، بحوالہ ''معاشرتی مسائل دین فطرت کی روشنی میں'' مؤلفہ مولانا برہان الدین سنبھلی۔ شائع کردہ مکتبۃ الحسن، لاہور

''طلاق کا اختیار صرف مرد کے ہاتھ میں دینے کے وجوہ میں سے چند یہ ہیں: عورتیں ناسمجھ (نقصان عقل) اور غلبۂ ہویٰ (جذباتی ہونے) کی وجہ سے اختیارات کا غلط طور پر استعمال کرنے لگتی ہیں اور جلد فریب کا شکار ہو جاتی ہیں اور دینی حیثیت سے کمزور (نقصان دین) ہونے کی وجہ سے دنیا کے کاموں (بناؤ سنگھار، غیبت اور بدگوئی وغیرہ) میں زیادہ منہمک رہتی ہیں، مکر کے جال بنتی رہتی ہیں اور شوہروں کے رازوں کو ظاہر کر دیتی ہیں اور اس طرح کی اور چیزیں ہیں۔''[1]

اس لیے شریعت اسلامیہ نے طلاق کا حق بھی صرف مرد کو دیا ہے جو عقل وفہم، تدبر، دور اندیشی اور حوصلہ وعزم میں عورت سے فائق ہے۔ ہر سمجھ دار طلاق دینے سے پہلے بہت کچھ سوچتا ہے اور بدرجۂ آخر یہ حق طلاق استعمال کرتا ہے جس طرح کہ شریعت نے بھی اسے بدرجۂ آخر ہی استعمال کرنے کی تاکید کی ہے۔ عورت کی اس کمزوری کا ذکر احادیث میں اس طرح کیا گیا ہے۔ فرمایا:

«اِسْتَوصُوا بِالنِّسَاءِ، فَإِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ، وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ، فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ، وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ، فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ»

''عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی وصیت مانو! عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے زیادہ کجی اوپر کی پسلی میں ہوتی ہے۔ پس اگر تم اسے سیدھا کرنے لگو گے تو توڑ دو گے اور یوں ہی چھوڑ دو گے تو کجی باقی رہے گی۔ پس عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی وصیت قبول کرو۔''[2]

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

1 فتح القدير، الطلاق: 365/3. 2 صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب خلق آدم وذريته، حديث: 3331.

«وَفِيهِ سِيَاسَةُ النِّسَاءِ بِأَخْذِ الْعَفْوِ مِنْهُنَّ وَالصَّبْرِ عَلٰى عِوَجِهِنَّ، وَأَنَّ مَنْ رَامَ تَقْوِيمَهُنَّ فَاتَهُ الْاِنْتِفَاعُ بِهِنَّ مَعَ أَنَّهُ لَا غِنَيٍ لِلْإِنْسَانِ عَنِ امْرَأَةٍ يَسْكُنُ إِلَيْهَا وَيَسْتَعِينُ بِهَا عَلٰى مَعَاشِهِ، فَكَأَنَّهُ قَالَ: الْاِسْتِمْتَاعُ بِهَا لَا يَتِمُّ إِلَّا بِالصَّبْرِ عَلَيْهَا»

"مطلب اس کا یہ ہے کہ عورت کے مزاج میں تھوڑی سی کجی ہے (جو ضد وغیرہ کی شکل میں بالعموم ظاہر ہوتی رہتی ہے۔) پس اس کمزوری میں اسے معذور سمجھو کیونکہ یہ پیدائشی ہے۔ اسے صبر وحوصلے کے ساتھ برداشت کرو اور ان سے عفو ودرگزر کا معاملہ کرو اگر تم انھیں سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکو گے درآں حالیکہ ان کا وجود انسان کے سکون کے لیے ضروری ہے اور کشمکش حیات میں ان کا تعاون ناگزیر ہے، اس لیے صبر کے بغیر ان سے استمتاع اور نباہ ناممکن ہے۔"[1]

ایک دوسری حدیث میں عورت کے سریع الغضب (زود رنج ہونے) اور ذرا سی بات خلاف طبیعت پیش آجانے پر ایک دم سارے احسانات فراموش کر دینے کی فطرت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

«لَوْ أَحْسَنْتَ إِلٰى إِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا قَالَتْ: مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ»

"تم ایک عورت کے ساتھ عمر بھر احسان کرتے رہو لیکن اگر وہ کسی وقت تم سے کوئی معمولی بات بھی (خلاف طبیعت) دیکھ لے گی تو فوراً کہہ اُٹھے گی، میں نے تو تیرے ہاں کبھی سکھ دیکھا ہی نہیں۔"[2]

---

1 فتح الباري: 315/9. 2 صحيح البخاري، النكاح، باب كفران العشير وهو الزوج وهو الخليط من المعاشرة، حديث: 5197.

⑥ مسئلۂ شہادتِ نسواں اور مرد وعورت کے درمیان فرق واختلاف کی تین صورتیں

ان تفصیلات سے واضح ہے کہ بہت سے معاملات میں مرد وعورت کے درمیان ان کی فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے اور دائرۂ کار کے اختلاف کی وجہ سے فرق کیا گیا ہے۔ اس فرق واختلاف کی بالعموم تین صورتیں ہیں:

① بعض کام تو ایسے ہیں جنھیں صرف مرد ہی کر سکتے ہیں، عورتیں نہیں کر سکتیں اور بعض کام عورتیں کر سکتی ہیں، مرد نہیں کر سکتے دنیا کی کوئی طاقت ان میں تبدیلی کرنے پر قادر نہیں جیسے مرد کا بار آور کرنا اور عورت کا حاملہ اور مرضعہ ہونا۔

② اور بہت سے کام ایسے ہیں کہ جنھیں اگرچہ مردوں کی طرح عورتیں بھی کر سکتی ہیں لیکن ان کاموں کو عورتوں پر فرض نہیں کیا گیا ہے تاکہ عورت کا اصل دائرۂ کار (گھریلو زندگی) متأثر نہ ہو اور مردوں کے ساتھ عام اختلاط نہ ہو جو اسلام کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے۔ نماز باجماعت، جمعہ، جنازے اور جہاد میں شرکت سے عورتوں کا استثنا اسی اصول پر مبنی ہے اور کسب معاش کے بوجھ سے بھی اسے اسی بنیاد پر فارغ رکھا گیا ہے۔

اسلام کے نزدیک عورت کا اپنے آپ کو صرف امور خانہ داری تک محدود رکھنا، اس عزت وشرف کے بقا کے لیے بھی ضروری ہے جو اس نے عورت کو عطا کیا ہے۔ خاندان کی حفاظت و صیانت کا بھی عین تقاضا ہے اور انسانی معاشرے کو فسادِ قلب ونظر سے بچانے کے نقطۂ نظر سے بھی یہ ایک امر ناگزیر ہے۔

③ بہت سے معاملات ایسے ہیں کہ عورت اپنی فطری کمزوری کی وجہ سے انھیں اس طرح انجام نہیں دے سکتی جس طرح مرد اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے ان پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مرد کو جسمانی قوت عورت سے زیادہ عطا کی ہے، اسی طرح ذہنی و دماغی صلاحیتوں میں بھی وہ عورت سے فائق ہے۔ اس فطری کمزوری، یا فطری خوبیوں کی

وجہ سے کسی کو حقیر سمجھنا اور کسی کو بالاتر مخلوق قرار دے دینا بلاشبہ صحیح نہیں ہے۔ قدرت کو جس سے جو کام لینا ہے، اُسی کے مطابق اس کو مخصوص صلاحیتیں بھی عطا کی ہیں۔ ان فطری صلاحیتوں کا انسانی شرف و کرامت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس اعتبار سے مرد و عورت دونوں یکساں ہیں۔ صلاحیتوں کے تفاوت کا مطلب، شرف و کرامت میں تفاوت نہیں ہے، تاہم صلاحیتوں میں فرق و تفاوت کو جھٹلانا بھی آفتاب نیم روز کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔

اس تیسری قسم میں عورتوں کی شہادت کا مسئلہ بھی ہے۔ جب یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ عورت بعض باتوں میں مرد سے مختلف اور ممتاز ہے، مثلاً:

- اس میں شرم وحیا کا مادہ زیادہ ہے۔
- وہ مرد کی طرح فصیح و بلیغ نہیں ہے۔
- وہ دماغی و ذہنی صلاحیتوں میں کچھ کمزور ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ضعف حافظہ، نسیان اور ذہول کا زیادہ شکار ہوتی ہے۔ جسے حدیث میں نقصانِ عقل اور قرآن کریم میں ﴿ أَن تَضِلَّ إِحْدَىٰهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَىٰهُمَا الْأُخْرَىٰ ﴾ (البقرة 282:2) سے تعبیر کیا گیا ہے۔
- اسلام نے عورت کا مردوں کے ساتھ اختلاط اور گھر سے زیادہ باہر نکلنے کو ناپسند کیا ہے۔

اگر یہ ساری باتیں تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں تو پھر اس بات کے ماننے میں تأمل کیوں ہے کہ مسئلۂ شہادت میں بھی شریعت نے مرد کو فوقیت اور ترجیح دی ہے اور عورت کی گواہی کو بہ وقت ضرورت ہی تسلیم کیا ہے۔ عام حالات میں مردوں کی موجودگی میں اس کے گواہ بننے کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا ہے کیونکہ شہادت کے تقاضوں کو عورتیں

مردوں کی طرح نبھانے پر فطری طور پر قادر نہیں ہیں۔ (اس کی مزید تفصیل مسئلۂ شہادت نسواں، عقل و نقل کی روشنی میں...... کے عنوان سے کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں)۔

عورت کی امتیازی خصوصیات کے بارے میں یہ چند اشارات ہیں، آئندہ صفحات میں ان کی تفصیل ہے اور ان شبہات کا ازالہ بھی جو اس ضمن میں پیش کیے جاتے ہیں۔

(حافظ) صلاح الدین یوسف
124/40 شاداب کالونی، علامہ اقبال روڈ،
گڑھی شاہو۔ لاہور
فون (گھر): 042-6316931
موبائل: 0321-4133675
جمادی الاخریٰ 1429ھ...... جون 2008ء

عورت، خانگی امور اور پرورشِ اولاد کی ذمے دار

تربیت اولاد میں عورت کا کردار

اللہ تعالیٰ نے عورت کی تخلیق کا مقصد یہ بیان فرمایا ہے کہ یہ مرد کی رفیقۂ حیات ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے درمیان مودّت و محبت کا ایسا تعلق قائم کر دیا ہے جو بے مثال ہے اور انسانی زندگی دونوں کی رفاقت و محبت کا نام ہے۔

اس تعلق کا ذریعہ اللہ نے نکاح کو بنایا ہے۔ حیوانوں کی طرح محض جنسی خواہش پوری کر کے علیحدہ ہو جانا اور کسی بات کا ذمے دار نہ بننا، اسلام نے اسے سخت ناپسندیدہ قرار دیا ہے، اس لیے وہ مرد اور عورت کو اس وقت تک ایک دوسرے کے قریب ہونے کی اجازت نہیں دیتا، جب تک وہ دونوں نکاح کے ذریعے سے ایک عقد میں نہیں بندھ جاتے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک اور جیون ساتھی ہونے کا اقرار و اعتراف نہیں کر لیتے۔

اس عقد نکاح یا معاہدۂ رفاقت کے بعد جب ایک مرد اور عورت کے مابین رشتۂ ازدواج قائم ہوتا ہے تو اس سے ایک نئے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے اور وہ حسب مشیت الٰہی دو سے تین، چار، حتیٰ کہ درجن یا اس سے کم و بیش ہو جاتے ہیں۔ اس بڑھتے ہوئے خاندان کی کفالت و تربیت بھی ان دونوں ہی کی ذمے داری ہوتی ہے جو آپس میں تو میاں بیوی ہوتے ہیں لیکن خاندان کے نئے افراد کے ماں باپ کہلاتے ہیں۔

ماں کو اللہ تعالیٰ نے معاش کی ذمے داریوں سے فارغ رکھا ہے۔ یہ ذمے داری

کلیتاً باپ کے سپرد کی گئی ہے کہ وہ گھر سے باہر جا کر کاروبار، ملازمت، محنت مزدوری یا کھیتی باڑی کرے۔ کسب معاش کے لیے جو بھی جائز صورت وہ اختیار کرے، اپنی صلاحیت اور پسند کے مطابق وہ کر سکتا ہے۔ وہ اپنے لیے اور بیوی بچوں کے لیے کمائے، ان کے لیے رہائش، خوراک و پوشاک، علاج اور دیگر ضروریات زندگی مہیا کرے۔ ماں گھر کی چار دیواری کے اندر رہ کر امور خانہ داری کے ساتھ ساتھ خاوند کی خدمت اور بچوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کا کام کرے تاکہ بچوں کا باپ یکسوئی اور بےفکری کے ساتھ کسب معاش کے لیے محنت اور جدوجہد کرتا رہے۔ گھر سے نکلنے کے بعد اسے یہ فکر نہ ہو کہ گھر کی حفاظت کون کرے گا؟ اس کے معصوم بچوں کو کون سنبھالے گا اور ہانڈی روٹی پکانے کا کام کون انجام دے گا؟

گویا اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کا دائرۂ کار متعین کر دیا ہے تاکہ زندگی کی گاڑی، جس کے وہ دونوں ہی پہیے ہیں، شاہراہ حیات پر گامزن اور رواں دواں رہے۔ مرد کا دائرۂ کار بیرونِ در، یعنی گھر سے باہر کے امور ہیں اور عورت کا دائرۂ کار اندرونِ در، یعنی گھر کی چار دیواری ہے۔ مرد اپنے دائرے میں محنت اور جدوجہد کرے اور اپنے فرائض ادا کرے اور عورت اپنی ذمے داری پوری کرے اور اس میں کوتاہی نہ کرے کیونکہ دونوں ہی کی مشترکہ کاوشوں سے یہ باغ ثمر آور ہو گا جس کے بوٹوں کو انھوں نے اپنے خون جگر سے سینچا ہے، یہ خاندان پروان چڑھے گا جو ان دونوں کے ملاپ سے معرض وجود میں آیا ہے اور یہ نونہال معاشرے کے بہترین فرد بنیں گے جو ان کے مستقبل کی امیدوں کا مرجع اور حسین آرزوؤں کا محور ہیں۔

اس اعتبار سے تربیت اولاد میں ماں کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

اولاً: تو اس لیے کہ ماں کی گود ہی بچے کا وہ پہلا گہوارہ ہے جہاں وہ آنکھیں کھولتا ہے۔

اس کی کل کائنات ماں کی شفقت ومحبت ہی ہوتی ہے۔ ماں کی محبت آمیز مسکراہٹ اور شفقت بھرا ہاتھ ہی اس کا سہارا ہوتا ہے اور ماں کی چھاتی سے اسے وہ لطیف غذا ملتی ہے جس سے اس کی جسمانی نشو ونما ہوتی ہے۔

ثانیًا: جب وہ چلنے پھرنے لگتا ہے اور کچھ بول اس کی زبان سے نکلنے شروع ہوتے ہیں تو باپ تو باہر کسب معاش میں سرگرداں ہوتا ہے، ماں کی گود ہی اس کا پہلا مدرسہ بنتی ہے، جہاں سے اس کی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ تعلیم نہایت بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اس وقت بچے کا ذہن سلیٹ یا بلیک بورڈ کی طرح بالکل صاف ہوتا ہے۔ اس پر جو بھی لکھ دیا جائے، یعنی اسے ذہن نشین کرایا جائے، وہ اس کے دل ودماغ میں نقش ہو جاتا ہے۔ اسی بات کو نبیٔ کریم ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

«كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ»

''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔''[1]

یعنی اس کے ذہن کے تختۂ سیاہ پر جس مذہب کی بھی تحریر درج کر دی جائے وہ اَلنَّقْشُ في الحَجَر (پتھر پر لکیر) کی طرح اس کے لوح قلب پر ثبت ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مائیں اگر صحیح مسلمان ہوں گی، اسلامی تعلیم وتربیت کے زیور سے آراستہ ہوں گی اور اسلامی جذبات واحساسات سے سرشار ہوں گی تو ان کی گودوں میں پلنے والے بچے بھی صحیح مسلمان ہوں گے، ان کی تعلیم وتربیت سے اسلام کی حقانیت و صداقت کا نقش ان کے دل ودماغ میں ثبت ہو جائے گا اور اس کی تعلیمات کو اپنانے کا سچا

[1] صحيح البخاري، الجنائز، باب ما قيل في أولاد المشركين، حديث: 1385.

جذبہ ان کے اندر پیدا ہوگا۔

ایک عورت کو اسلامی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کا مطلب ہے کہ ایک پورے خاندان کو اسلامی سانچے میں ڈھال دینے کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ یہ اسلامی معاشرے کو سدھارنے کا ایک فطری طریقہ ہے کیونکہ خاندانوں ہی سے قبیلے اور برادریاں بنتی ہیں اور قبیلے اور برادریاں ہی پھیل کر معاشرہ بنتی ہیں۔ اگر مذکورہ فطری طریقے کے مطابق ہر خاندان کے سربراہ...... ماں اور باپ...... اپنے اپنے زیر کفالت اور زیر تربیت خاندانوں کی صحیح تربیت کا اہتمام کریں تو معاشرتی اصلاح کا آغاز ہوسکتا ہے، بشرطیکہ ماں ایک معلّمہ، مبلّغہ اور داعیہ کا کردار ادا کرے۔

تجربات نے واضح کیا ہے کہ انتخابات کے ذریعے سے، سیاست کے ذریعے سے، حکمرانوں یا حکمران جماعتوں کی تبدیلیوں سے معاشرہ اصلاح پذیر نہیں ہوگا بلکہ ان سے بگاڑ اور فساد میں مزید اضافہ ہی ہوگا جیسا کہ ہو رہا ہے۔ اصلاح مطلوب ہے تو اس کا آغاز ماں کی گود سے کیا جائے اور یہاں سے آغاز کرنے کا مطلب ہے کہ اس ابتدائی اسکول کو آوارہ، بے پردہ اور اپنے دائرۂ کار سے تجاوز کرنے سے روکا جائے اور اس کے اندر اسلامی احساس وشعور بیدار کر کے اس سے بچوں کی اسلامی تعلیم و تربیت کا کام لیا جائے۔

عورت کے لیے پردے کا وجوب اور اس کے احکام وآداب

پردے کا حکم اور مردوں سے اختلاط کی ممانعت

مسلمان عورت کے لیے پردے کا حکم بھی ان امتیازات میں سے ہے جن کی وجہ سے وہ مردوں سے ممتاز اور اسلام دوسرے مذاہب سے ممتاز ہے، پردے کے حکم کا مقصد مسلمان عورت کا تحفظ ہے۔ مسلمان عورت کی عزت و ناموس اور اس کی کرامت ونجابت کی حفاظت اور اس کو شبہات سے بچانے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک تو مرد اور عورت کو باہمی اختلاط، یعنی مل کر پڑھنے، مل کر کام کرنے، مل کر بے محابا گفتگو کرنے اور بے باکانہ میل ملاقات سے روک دیا ہے۔ اور دوسرے، عورت کے لیے حجاب (پردے) کی پابندی کو ضروری قرار دیا ہے۔ پس عورت کے لیے پردہ ایسے درخت کی حیثیت رکھتا ہے جس کے سائے میں وہ سکون محسوس کرتی اور اس کے دامن میں پناہ حاصل کرتی ہے۔

حجاب، کوئی قید اور قدغن نہیں جس سے گھٹن محسوس کی جائے، کوئی بوجھ نہیں جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیر کی جائے اور کوئی ناروا پابندی نہیں جس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے جیسا کہ اسلام دشمن عناصر، لادین قسم کے لوگ اور مغرب زدہ حضرات باور کراتے ہیں بلکہ پردے کا حکم اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام نے عورت کو ایک نہایت بیش قیمت متاع قرار دیا ہے، اسی لیے اس کی حفاظت و صیانت کا خصوصی اہتمام کیا ہے کیونکہ ہر قیمتی چیز کو چھپا کر رکھا جاتا اور اس کی حفاظت کا اہتمام کیا جاتا ہے،

اس لیے دشمنوں کے مکروفریب کو سمجھنا، ان کے حسین جالوں سے بچنا اور ان کی سازشوں کو ناکام بنانا ضروری ہے۔

بنابریں ہر مسلمان عورت حجاب کے شرعی تقاضوں کی پابندی کر کے اپنے ایمان کی بھی حفاظت کرے اور دشمنانِ اسلام کے مذموم اور مکروہ عزائم کو بھی خاک میں ملا دے۔

پردے کی اہمیت اور اس کی افادیت وضرورت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور مارکیٹ میں اس موضوع پر بہت مواد موجود ہے، اس لیے ذیل میں صرف بے پردگی کی مختلف شکلوں اور ان پر ہونے والی وعید، نیز شرعی پردے کے آداب وشرائط اور اختلاط کی ممانعت کے ضروری مسائل بیان کیے جاتے ہیں تاکہ ہر مسلمان عورت ان کو سامنے رکھے اور ان کی پابندی کرے۔ مَردوں کی بھی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی جوان بچیوں، بہنوں، ماؤں اور بیویوں کو تلقین کریں کہ وہ ہر جگہ، گھر کے اندر ہوں یا گھر سے باہر، ان پابندیوں کا اہتمام کریں۔

بے پردگی پر سخت وعید اور اس کی مختلف شکلیں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«صِنْفَانِ مِنْ أَهْلِ النَّارِ لَمْ أَرَهُمَا ، قَوْمٌ مَعَهُمْ سِيَاطٌ كَأَذْنَابِ الْبَقَرِ يَضْرِبُونَ بِهَا النَّاسَ ، وَنِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مُمِيلَاتٌ مَائِلَاتٌ ، رُءُوسُهُنَّ كَأَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ ، لَا يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ ، وَلَا يَجِدْنَ رِيحَهَا ، وَإِنَّ رِيحَهَا لَتُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ كَذَا وَكَذَا»

''جہنمیوں کی دو قسمیں ہیں جنھیں میں نے دیکھا نہیں، یعنی ابھی ان کا وجود نہیں ہے، مستقبل میں ہوگا۔ ایک وہ لوگ کہ ان کے پاس گائے کی دُموں جیسے کوڑے ہوں گے، وہ ان سے لوگوں کو ماریں گے۔ (دوسری قسم) وہ عورتیں جو لباس پہننے

کے باوجود ننگی ہوں گی، مائل کرنے والی اور مائل ہونے والی ہوں گی، ان کے سر بُختی اونٹ کی کوہان کی طرح جھکے ہوئے ہوں گے۔ یہ عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی بلکہ اس کی خوشبو تک نہ پائیں گی، حالانکہ اس کی خوشبو اتنی مسافت، یعنی بڑی بڑی دور سے آتی ہے۔''[1]

تشریح و توضیح

یہ حدیث نبی ﷺ کے معجزات میں سے ہے، آپ نے اس میں جن دو قسم کے لوگوں کی پیش گوئی فرمائی تھی، آج قدم قدم پر ان کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، خاص طور پر عورت کی جن فتنہ سامانیوں اور حشر انگیزیوں کا اس میں تذکرہ ہے، وہ محتاج وضاحت نہیں۔ بہرحال ذیل میں اس کی کچھ توضیح کی جاتی ہے۔

پہلی قسم سے تو ظالم لوگ مراد ہیں، جو اپنے وسائل، طاقت و اقتدار اور جاہ و منصب کی بنیاد پر لوگوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کا معاملہ کرتے ہیں۔ دنیا میں یہ لوگ طاقت کے نشے میں اندھے اور مغرور ہوتے ہیں، اس لیے رحم و کرم کی بجائے ظلم و ستم ان کا شعار ہوتا ہے۔ آخرت میں اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ایسے لوگ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ [أعاذنا اللّٰه منه]

جہنمیوں کی دوسری قسم فیشن ایبل عورتوں کی ہو گی۔ ان کی حسبِ ذیل علامات اور خصوصیات ہوں گی:

- لباس پہننے کے باوجود ننگی ہوں گی، اس کی تین شکلیں عام ہیں۔

① لباس پہننے کے باوجود، ان کے جسم کے بہت سے قابل ستر حصے ننگے ہوں گے، جیسے چہرہ، ہاتھ یا بازو، گردن اور سینہ (چھاتی اور گردن کا پچھلا حصہ۔) عورتوں کی ایک

---

[1] صحيح مسلم، اللباس والزينة، باب النساء الكاسيات العاريات المائلات المميلات، حديث: 2128 .

بہت بڑی تعداد ایسی ہے جن کے یہ حصے ننگے ہوتے ہیں، حالانکہ یہ سب حصے پردے میں رہنے چاہئیں۔

② ایسا تنگ اور چست لباس پہنیں گی کہ جس سے جسم کے خدوخال ہی نہیں، انگ انگ نمایاں ہوگا۔

③ یا ایسا باریک لباس پہنیں گی کہ جس سے سارا جسم چھلکتا نظر آئے گا اور ان کا حسن نمایاں ہوگا۔

یہ تینوں صورتیں بے پردگی کی ہیں جن سے مردوں کو دعوت نظارہ ملتی ہے۔ مسلمان خواتین کو، جو پردے کی اہمیت کو سمجھتی ہیں، غیرمحرموں کے سامنے مذکورہ تینوں صورتوں سے بچنا چاہیے۔ اس کے بغیر پردے کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔

[مُمِیلاَتٌ]، کے ایک معنی ہیں، دوسری عورتوں کو بھی مردوں کی طرف راغب کرنے والیاں، یا مردوں کو اپنی طرف مائل کرنے والیاں، یا اپنے کندھوں کو ناز و ادا سے مٹکا مٹکا کر چلنے والیاں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی چال ڈھال یا ناز و ادا سے مردوں کو اپنی طرف مائل کرنا اور دوسری عورتوں کو بھی بے حیائی کی اس راہ پر لگانا، جیسے فلموں اور ڈراموں میں کام کرنے والی حیا باختہ عورتوں کا کردار ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ کردار کسی حیادار، باعفت اور پاک باز عورت کا نہیں ہوسکتا۔

[مائلاتٌ] کے معنی ہیں، ناز و ادا سے ایسی چال چلنا یا ایسی حرکات وسکنات کرنا جن سے معلوم ہو کہ عورت مردوں کی طرف میلان رکھتی ہے۔

بختی اونٹ کی کوہان کی مانند ان کے سر ہوں گے، کا مطلب، سر پر جوڑا کر کے بالوں کو سر کے درمیان اونچا کر کے باندھ لینا، یہ فیشن بھی بہت سی عورتیں کرتی ہیں، حتی کہ بعض برقع پوش خواتین کے سروں پر بھی اس طرح کی کلغی نظر آتی ہے۔ اس حدیث کی رُو

سے بالوں کا یہ اسٹائل یا فیشن بھی ناپسندیدہ ہے۔

حدیث میں وارد سخت وعید کی مصداق عورتیں

مذکورہ وضاحت سے یہ بات بطورِ خاص معلوم ہوتی ہے کہ جو عورتیں پردے کے شرعی تقاضوں سے بے اعتنائی برتتی ہیں اور ایسا لباس پہنتی ہیں جس سے جسم کے کچھ حصے ننگے رہتے ہیں، جیسے بے آستین کی قمیص، یا کھلے گلے والی قمیص جس سے ان کی چھاتی نظر آتی ہے، یا ان کی گردن کا پچھلا حصہ ننگا رہتا ہے، یا چہرہ نظر آتا ہے، یا سر ننگا رہتا ہے، یا ساڑھی ہے جس میں پیٹ ننگا رہتا ہے، یا یورپ اور امریکہ میں مروجہ منی سکرٹ ہے جس میں ٹانگیں ننگی رہتی ہیں، یا ایسا باریک لباس جس سے ان کے جسم کا سارا حسن چھن چھن کے باہر آتا ہے، یا ایسا کسا کسایا چست لباس جس سے ان کی جسمانی ساخت اور حسن نمایاں ہوتا ہے۔ یہ سب بے پردگی کی صورتیں ہیں اور ایسا لباس پہننے والی عورتیں مذکورہ وعید کی مصداق ہیں۔

اسی طرح اپنی چال ڈھال، ناز و ادا اور اٹکھیلیوں، اور اشاروں کنایوں پر مبنی بے حیائی کے فیشن اختیار کر کے مردوں کو اپنی طرف راغب کرنا، یہ بھی سخت گناہ ہے جو مذکورہ وعید کا مصداق بنا سکتا ہے کیونکہ عورت کا سارا حسن و جمال اور اس کی زیب و زینت صرف اور صرف اس کے خاوند کے لیے ہے اور جس عورت کا مقصد خاوند کے علاوہ دوسرے مردوں کو اپنی طرف راغب کرنا اور انھیں دعوتِ گناہ دینا ہے، ایسی ہرجائی عورتیں جنت کی خوشبو تک نہیں پائیں گی۔

شادی بیاہ میں ویڈیو اور حسن و جمال کی نمائش کی وبا

آج کل شادی بیاہ کی تقاریب میں عورتوں نے نہ صرف پردے کو خیرباد کہہ دیا ہے بلکہ وہ ایسا فیشن کر کے اور ایسا لباس پہن کے ان میں شریک ہوتی ہیں جیسے وہ مقابلۂ حسن یا

مقابلۂ آرائش وزیبائش یا مقابلۂ زیورات میں شریک ہورہی ہیں، پھر ان کے لباس، میک اپ اور حرکت و ادا میں بے پردگی اور بے حیائی کی تقریباً تمام مذکورہ صورتیں پائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی یہ ساری چیزیں ویڈیو کے ذریعے سے فلم بند ہو جاتی ہیں جنھیں خاندان کے محرم اور نامحرم سب مرد ذوق وشوق سے دیکھتے اور ان کے حسن و جمال سے یا ان کے فیشنی بالوں اور لباسوں سے ان کی چال ڈھال اور ناز و ادا سے متأثر یا محظوظ ہوتے ہیں۔

- کیا ایک اسلامی معاشرے میں مسلمان عورتوں کا یہ رویہ جائز ہے؟
- کیا مسلمان عورتوں کے لیے بے حیائی کا یہ طریقہ اختیار کرنا جائز ہے؟
- کیا مسلمان مردوں کی یہ ذمے داری نہیں ہے کہ وہ اپنی عورتوں (بیویوں، بچیوں) کو اس طرح کا لباس اور فیشن اختیار کرنے سے روکیں؟
- کیا ویڈیو کے ذریعے سے اس بڑھتی ہوئی بے حیائی کا سدِّباب کرنے کی ضرورت نہیں ہے؟
- کیا عورتوں کی اس بے پردگی اور حسن و جمال کی نمائش پر خاموش رہنے والے مرد بھی، عورتوں کے ساتھ، حدیث میں وارد شدید وعید کے مصداق نہیں ہوں گے؟

یہ الم ناک صورت حال ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے، کاش ہم اس پر کچھ غور کرسکیں!

پردے کا حکم اور اس کے آداب

عورت کو پردے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس کے تقاضوں کی ادائیگی کے لیے علماء نے اس کے آٹھ آداب بیان فرمائے ہیں تاکہ صحیح معنوں میں پردہ ہو سکے، ان آداب وشرائط کے بغیر شرعی پردہ نہیں ہوتا، یہ آداب حسب ذیل ہیں:

- چادر یا برقع ایسا ہو جو سر سے لے کر پیروں تک پورے جسم کو ڈھانپ لے، چہرہ نظر آئے نہ بازو، چھاتی نظر آئے نہ گدی، حتیٰ کہ ہاتھ اور پیر بھی نظر نہ آئیں۔
- چادر یا برقع بھی بجائے خود زینت، یعنی جاذب نظر نہ ہو، جیسے اس پر کڑھائی کا کام کیا گیا

ہو یا پرکشش رنگ کا حامل ہو یا اتنا خوب صورت اور نفیس ہو کہ بے اختیار مردوں کی نظریں عورت کی طرف اٹھ جائیں۔ گویا مذکورہ قسم کی چادر یا برقعے سے بھی پردے کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔

- حجاب، ایسے باریک اور شفاف کپڑے کا نہ ہو جس میں عورت کا جسم چھلکے، گویا چادر یا برقعے کا کپڑا سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ موٹا بھی ہو۔
- حجاب ڈھیلا ڈھالا ہو۔ اس طرح تنگ نہ ہو کہ فتنے میں ڈالنے والی جگہیں واضح ہوں یا اس سے جسمانی ساخت اور اس کے خدوخال کی غمازی ہوتی ہو۔
- اس کے کپڑے سینٹ یا خوشبو سے معطر نہ ہوں۔
- مَردوں کے سے لباس کی طرح نہ ہوں۔
- اسی طرح کافر عورتوں کے لباس کی طرح نہ ہوں، جیسے منی سکرٹ، ساڑھی، لہنگا وغیرہ کیونکہ کافروں کی مشابہت بھی ممنوع ہے۔ فرمانِ نبوی ہے:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ»

''اور جو جس کی مشابہت اختیار کرے گا وہ انھی میں سے ہوگا۔''[1]

- شہرت و ناموری والا لباس نہ ہو کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ أَلْبَسَهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِثْلَهُ»

''جس نے شہرت کا لباس پہنا، اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اس جیسا ہی لباس پہنائے گا، پھر اس میں جہنم کی آگ کو بھڑکایا جائے گا۔''[2]

کن کن لوگوں سے پردہ ضروری اور اختلاط (میل جول) منع ہے

[1] سنن أبي داود، اللباس، باب في لبس الشهرة، حديث: 4031. [2] سنن أبي داود، اللباس، باب في لبس الشهرة، حديث: 4029.

لوگ سمجھتے ہیں کہ عورت کے لیے پردہ اسی وقت ضروری ہے جب وہ گھر سے باہر نکلے اور اسی طرح میل جول بھی صرف انھی سے منع ہے جو بیگانے ہیں، ورنہ گھر میں وہ اپنے رشتے داروں کے ساتھ جس طرح چاہے میل جول رکھے، ان سے ہنسی مذاق کرے اور ان سے خلوت وجلوت میں بے باکانہ گفتگو کرے، اس میں کوئی حرج ہے نہ یہ پردے کے منافی ہے، حالانکہ یہ بات غلط ہے۔

ایسے گھروں میں جہاں خاوند کے دوسرے بھائی بھی رہتے ہوں، عورت کو ڈھیلے ڈھالے اور ساتر لباس میں رہنا چاہیے، جس سے عورت کے بازو نظر آئیں نہ چھاتی اور نہ کوئی اور چیز ہی کیونکہ عورت کے لیے دیوروں اور جیٹھوں سے پردہ کرنا بھی ضروری ہے اور یہ پردہ اس طرح نہایت آسانی سے ممکن ہے کہ ایک تو مذکورہ انداز میں ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے جس سے اس کی زینت کا اظہار اور فتنے والی جگہیں آشکارا نہ ہوں۔ دوسرے، دیور اور جیٹھ وغیرہ کے سامنے آنے پر گھونگٹ نکال لے۔ علاوہ ازیں ان سے بے باکانہ انداز میں گفتگو نہ کرے بلکہ حسب ضرورت مختصر بات کرے اور ان کے ساتھ تنہائی بالکل اختیار نہ کرے۔

شرعی ہدایات کی روشنی میں جن جن رشتے داروں سے پردہ کرنا ضروری اور ان سے اختلاط منع ہے، ان کی تفصیل، علماء کی وضاحت کی روشنی میں، حسب ذیل ہے۔

- عورت کا اپنے چچا زاد، ماموں زاد، خالہ زاد اور پھوپھی زاد بھائی سے اختلاط۔
- عورت کا اپنے دیور، جیٹھ، بہنوئی سے اختلاط۔
- عورت کے رضاعی بھائی کا اپنی رضاعی بہن کی دیگر بہنوں سے اختلاط۔

مذکورہ تمام اختلاط ممنوع ہیں۔ اختلاط کا مطلب، ان سے بے پردہ ہو کر بلا تکلف گفتگو اور ہنسی مذاق کرنا اور خلوت میں بھی ان سے ملاقات کرنا ہے۔

- منگیتر کا اپنی منگیتر سے اختلاط بھی ممنوع ہے، البتہ نکاح سے قبل ولی کی موجودگی میں اسے ایک نظر دیکھ لینا مستحب ہے۔
- شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں بیروں یا نوجوان لڑکوں کا عورتوں کی خدمت پر مامور ہونا۔
- دولھا، دلھن کا اپنے رشتے داروں کے ساتھ یا مرد و زن کا گروپ کی صورت میں بیٹھنا اور تصویریں اتروانا وغیرہ۔
- عمر رسیدہ خواتین کا اجنبی مردوں کے ساتھ تنہائی میں خلوت اختیار کرنا۔
- عورت کا اجنبی مردوں کے ساتھ اختلاط، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ تو ہمارے ہی قبیلے یا برادری کے افراد ہیں، یا اصل پردہ تو دل کا پردہ ہے، یعنی دل پاکیزہ ہوں، آنکھ میں حیا ہو تو یہی پردہ ہے، جسمانی پردہ ضروری نہیں۔
- ان بچیوں کے ساتھ اختلاط میں تساہل جو قریب البلوغت ہوں، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ تو ابھی بچیاں ہیں۔
- بغیر محرم کے عورت کا حج کے سفر پر جانا۔
- کالجوں، یونیورسٹیوں اور دیگر مدارس میں یا ہوم ٹیوشن کے نام پر عورتوں کا بچوں اور بچیوں اور مردوں کو پڑھانا یا مَردوں کا عورتوں کو پڑھانا، یا کالجوں وغیرہ میں مخلوط تعلیم کا ہونا۔
- لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے نام پر مغرب کی یونیورسٹیوں میں بھیجنا، انھیں مغربی افکار اور اس کی حیا باختہ تہذیب کا شکار بنانا ہے۔
- اعلیٰ تعلیمی اداروں اور طبی تجربہ گاہوں میں عملی تربیت کے نام پر لڑکے لڑکیوں کا اختلاط۔

- یونیورسٹیوں میں ایم اے اور پی ایچ ڈی وغیرہ کے مقالات کی تیاری میں بطور رہنما اورنگران کے مردوں کا عورتوں کے ساتھ خلوت (تنہائی) میں میل ملاقات۔
- علمی اجتماعات، کانفرنسوں، مشاعروں اور دیگر اس قسم کی تقریبات میں مرد و عورت کا پہلو بہ پہلو بیٹھنا۔
- نرسوں اور خاتون ڈاکٹر کا اجنبی مردوں، حتیٰ کہ ڈاکٹروں اور ہسپتال کے دیگر مرد ملازمین کے ساتھ اختلاط۔
- ڈاکٹر کی غیر محرم مریضہ کے ساتھ خلوت۔
- بغیر حاجت یا ضرورت کے یا لیڈی ڈاکٹر کی موجودگی میں، عورت کا مرد ڈاکٹر کے سامنے چہرہ وغیرہ ننگا کرنا۔
- دکان، شوروم یا مارکیٹوں وغیرہ میں عورت کا مردوں سے اختلاط۔
- بغیر محرم کے عورت کا رکشے، ٹیکسی، بس، ریل یا ہوائی جہاز میں سفر کرنا۔
- عورتوں کا فوٹو گرافروں سے تصویریں کھنچوانا۔
- بدعات پر مبنی اجتماعات (جیسے میلاد وغیرہ) اور تبلیغی جلسوں میں مردوں اور عورتوں کا اختلاط۔

اختلاط کی مذکورہ تمام صورتیں اور اس قسم کی دوسری صورتیں جن کی شرعاً اجازت نہیں، سب ممنوع اور حرام ہیں۔ مغربی تہذیب کی نقالی میں بے پردگی وبائے عام کی شکل اختیار کر گئی ہے، جس کی وجہ سے اب مرد و عورت کے اختلاط میں لوگ کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔

بنابریں مسلمان عورتوں کو اختلاط کی مذکورہ صورتوں سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مردوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی بیویوں، ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو پردے

کی اہمیت وضرورت سے بھی آگاہ کریں اور بے پردگی اور مردوں سے اختلاط کے مفاسد وخطرات سے بھی انھیں خبردار کریں تاکہ وہ ان سے بچنے کا اہتمام کریں۔

محارم کی وضاحت جن سے پردہ ضروری نہیں

عورت کا جن مردوں سے اختلاط ممنوع اور ان سے پردہ ضروری ہے، ان سے مراد اجنبی مرد ہیں اور اجنبی مرد کون ہیں۔ تو یاد رکھیے، خاوند اور محرم کے علاوہ جتنے بھی لوگ ہیں وہ سب شریعت کی رو سے اجنبی ہیں اور محرم سے مراد حسب ذیل رشتے دار ہیں۔

نسبی محارم: باپ، دادا (اوپر تک)، بیٹا، پوتا (نیچے تک)، بھائی، تایا، چچا، ماموں، بھانجا، بھتیجا، نانا اور نواسا۔

سسرالی محارم: سسر، داماد، خاوند کا بیٹا۔

رضاعی محارم: رضاعت سے ثابت ہونے والے مذکورہ رشتے کیونکہ حدیث میں ہے، ''رضاعت سے بھی وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے ہوتے ہیں۔''[1]

ان مذکورہ رشتوں میں سے کسی کے ساتھ عورت کا نکاح نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ سب عورت کے محرم ہیں، ان سے پردہ کرنا ضروری نہیں۔ ان کے علاوہ جتنے بھی لوگ ہیں، سب غیر محرم ہیں اور ان سے پردہ کرنا ضروری ہے۔

مثالی مسلمان عورت کی صفات

اے مسلمان بہن! اپنی حیثیت اور اس عزت وتکریم پر غور کر جس سے اللہ نے تجھے نوازا ہے۔ ہر قیمتی چیز اگر وہ ٹوٹ جائے یا ضائع یا چوری ہو جائے، اس کا بدل ممکن ہے لیکن اگر تیری عفت وعصمت داغ دار ہو جائے، تیری عزت وتکریم کو بٹہ لگ جائے اور تیری

[1] صحيح مسلم، الرضاع، باب يحرم من الرضاع ما يحرم من الولادة، حديث: 1444.

شرافت ونجابت موضوعِ بحث بن جائے تو اس کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔ تیرا سب سے قیمتی جوہر، تیری عزت وعصمت ہے جو لٹ جائے تو کوئی اس کا معاوضہ نہیں دے سکتا۔

تیری ردائے تقدس اگر تارتار ہو جائے تو اس کا ازالہ نہیں ہوسکتا
تیرا آبگینۂ ناموس اگر ٹوٹ جائے تو کوئی اسے جوڑ نہیں سکتا

پس تیری عزت اسی میں ہے کہ تو اپنی عصمت کی، اپنے تقدس کی چادر کی اور اپنے آبگینۂ ناموس کی حفاظت کر۔ یہ حفاظت کس طرح ممکن ہے؟ یہ اس طرح ممکن ہے کہ تو کچھ چیزوں کو اختیار کر اور کچھ چیزوں سے اجتناب کر۔

عورت کے لیے اختیار کرنے والے اہم کام

مسلمان عورت کے لیے جن چیزوں کو اختیار کرنا اور اپنانا لازم ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

- اے مسلمان بہن! تجھے محبت ہو، صرف اللہ سے، اللہ کے رسول سے اور ان لوگوں سے جو اللہ کے دین کے پابند ہیں۔
- تیری خلوت ہو، آخرت کی یاددہانی اور ایسے اعمال پر غور کرنے کے لیے جو تیری قبر سے ظلمتوں کو دور کرنے کا باعث اور لحد کی تنگیوں کو فراخی میں بدلنے کا ذریعہ ہوں۔
- تیری سہیلیاں صرف وہ ہوں جو حقیقی مسلمان ہوں اور اللہ کے دین کی مکمل پابند ہوں۔
- تیرے دشمن ہوں، ہر قسم کے گانے بجانے کے آلات (ریڈیو، ٹی وی، وی سی آر، کیبل، ڈش وغیرہ) اور تمام ایسے رسائل و اخبارات جو بے حیائی پر مبنی مضامین، تصویریں اور گمراہ کن افکار وتصورات شائع کرتے ہیں، بے پردہ اور کھلے عام زیب و زینت کا اظہار کرنے والی ہر عورت اور ہر وہ شخص جو رب کی ناراضی پر مبنی کام کرنے والا ہو۔

- تجھے نفرت ہو، یہود ونصاریٰ سے، منافقین سے، لادینوں سے اور آزادیٔ نسواں کے پرفریب نعرے لگا کر عورتوں کو گمراہ کرنے والوں سے۔
- تجھے حرص ہو، خالص اور سچی توبہ کی، نہ کہ محض زبان سے جھوٹی توبہ کی۔
- تیرا مقصد زندگی ہو، بارگاہ الٰہی میں استغفار، آخرت کی تیاری اور رضائے الٰہی کا حصول۔
- تیری معاشرتی تقریبات، پاک ہوں جاہلانہ رسموں سے، بینڈ باجوں سے، آتش بازی کے خطرناک مظاہر سے، میوزک کی دھنوں سے، رقص و سرود کی محفلوں اور شراب و شاہد کی سرمستیوں سے، ویڈیو سے، زیورات اور کپڑوں کی نمائش اور میک اپ کے ذریعے سے برپا ہونے والے نور ونکہت کے طوفان سے، جہیز اور بَری کی مسرفانہ رسموں سے، بے پردگی اور مردوں کے اختلاط سے۔
- تیری آرزو، خواہش اور کوشش ہو، ایک مسلمان خاندان کی بنیاد ڈالنے کی، اپنی نسل کی اسلامی خطوط پر تربیت کرنے کی اور اس میں اسلامی روح و جذبہ پیدا کرنے کی۔

وہ کام جن سے اجتناب کرنا عورت کے لیے ضروری ہے

مسلمان عورت کو جن چیزوں سے اجتناب کرنا ضروری ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

- دینی اقدار و روایات کا استہزا و استخفاف کرنے والوں سے اجتناب۔
- دین میں بدعات ایجاد کرنے اور بدعات میں حصہ لینے سے اجتناب۔
- نماز چھوڑ دینے یا بلاوجہ اس میں تاخیر کرنے سے اجتناب۔
- غیر مردوں کے سامنے زیب و زینت کے اظہار اور بے پردگی سے اجتناب۔
- غیبت، لعن طعن اور چغل خوری سے اجتناب۔
- کافر اور مغرب کی اخلاق باختہ عورتوں کی تقلید سے اور انھیں اچھا سمجھنے سے اجتناب۔

- بغیر ضرورت کے گھر سے نکلنے سے اجتناب۔
- فکرِ آخرت سے غفلت اور خاوند کی ناشکری کرنے سے اجتناب۔
- خاوند اور والدین کی نافرمانی سے اجتناب۔
- بے حیا بنانے والے اخبارات، رسالوں اور اسی قسم کے دیگر آلات و رسائل سے اجتناب۔

مذکورہ تمام باتوں سے اجتناب، مثالی مسلمان عورت بننے کے لیے ضروری ہے۔

یہ چند ضروری ہدایات ہیں جن کی مخاطب ہر مسلمان ماں، بہن، بیٹی، طالبہ اور استانی اور جوان اور بوڑھی خاتون ہے۔ ان میں دین و دنیا کی سعادتیں ہیں، لہٰذا انھیں چاہیے ان پر عمل کر کے ان سعادتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیں اور فوز و فلاح کو اپنا مقدر بنالیں۔

عورت اور تعلیم؟

آج کل عورت کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا بڑا غلغلہ ہے۔ٹھیک ہے اسلام میں بھی، طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ [1]،فرمانِ رسول کے تحت طلب علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے، اس لیے تعلیم کی اہمیت، افادیت اور ضرورت سے انکار نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون سی تعلیم ہے جس سے عورت کو آراستہ کیا جائے۔ سائنس کی، اقتصادیات کی، سیاست اور تاریخ کی، ریاضی اور فلسفے کی، ادب و صحافت کی، پولی ٹیکنک اور انجینئرنگ کی۔نہیں نہیں! ان میں سے کوئی بھی تعلیم عورت کے لیے ضروری نہیں ہے بلکہ یہ سب شعبے اس کے مقصد وجود اور اس کی فطری صلاحیتوں کے خلاف ہیں، اس لیے ان میں سے کسی بھی شعبے میں اس کو تعلیم دلانا، اسلام کے مقصد و منشا کے خلاف ہے۔تعلیم سے مراد صرف دینی تعلیم ہے۔عورت کو دینی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور کیا جائے تا کہ وہ اپنے گھروں میں یا بہ وقت ضرورت لڑکیوں کے سکول وغیرہ میں (جبکہ وہاں مردانہ سٹاف نہ ہو) بچوں کی دینی خطوط پر تعلیم و تربیت کا اہتمام کر سکے۔

اس کے علاوہ عورتیں میڈیکل کی تعلیم حاصل کر سکتی ہیں، بشرطیکہ ایسے میڈیکل کالج ہوں جہاں پڑھانے والی صرف عورتیں ہی ہوں، اس طرح وہ میڈیکل تعلیم حاصل کر کے عورتوں کا علاج معالجہ کریں کیونکہ اس شعبے میں وہ حجاب کی پابندیوں کے ساتھ عورتوں کی خدمت کر سکتی ہیں۔حجاب کی پابندیوں کو نظر انداز کر کے عورتوں کو مردوں والی تعلیم

[1] صحيح ابن ماجه للألباني: 92/1 ، حديث: 223 .

دلانا، نہ صرف یہ کہ بے مقصد ہے بلکہ دین کے لیے سخت خطرناک ہے۔ اسلامی ملکوں میں مخلوط تعلیم کا فتنہ بھی اسی لیے روز افزوں ہے کہ مسلمان اپنی بچیاں، سوچے سمجھے بغیر اور اپنے مذہب کی تعلیمات پر غور کیے بغیر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے سپرد کر رہے ہیں اور وہ وہاں وہی نصاب پڑھتی ہیں جو لڑکے پڑھتے ہیں اور بالعموم وہ نصاب صرف لڑکوں ہی کے لیے ہوتا ہے اور کوئی لڑکی اسے پڑھ کر لڑکا بنے بغیر، اس کے تقاضوں کی تکمیل نہیں کر سکتی۔

اس لیے ضروری ہے کہ عورت کے دائرۂ عمل کو اگر بڑھانا ہے تو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کے لیے سرگرمیوں کا تعین اور کچھ مخصوص شعبوں کا انتخاب کیا جائے اور پھر اس کے مطابق نصاب تیار کیا اور پڑھایا جائے تاکہ مسلمان عورت اپنے مقصد تخلیق اور اسلام کے منشا کے مطابق حیا و حجاب کی پابندی کے ساتھ، اپنے دائرے میں ملک و قوم کی مزید خدمت کرنا چاہے تو کر سکے ورنہ وہ تربیت اولاد کے سلسلے میں جو خدمت پہلے ہی سے سرانجام دیتی آ رہی ہے اس پر قناعت کرے کیونکہ وہ بھی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس کی اس خدمت کو حقیر سمجھا جائے نہ اس کی وجہ سے اس کی شخصیت کو کم تر خیال کیا جائے کیونکہ یہ دونوں ہی باتیں خلاف واقعہ ہیں۔ عورت بھی مرد کی طرح عظیم اور مرد ہی کی طرح عزت و احترام کی مستحق ہے۔

لاکھوں بے روزگار مردوں کی موجودگی میں عورتوں کی ملازمت کا کوئی جواز نہیں

علاوہ ازیں ایک ایسے ملک میں جہاں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں مرد بے روزگار ہیں، ان کے پاس ڈگریاں موجود ہیں لیکن سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں ان کے لیے کام کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ ڈگریاں لیے در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ وہاں عورتوں کو بھی بلا سوچے وہی تعلیم دینے اور وہی ڈگریاں جاری کرنے کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ پہلے تمام تعلیم یافتہ مرد ڈگری ہولڈروں کے روزگار اور ملازمتوں کا انتظام کیجیے۔

ان کی کھپت کے باوجود بھی کارکنوں، ہنرمندوں اور تعلیم یافتگان کی ضرورت ہو تو پھر بھی مردوں کے میدان اور دائرۂ عمل میں عورتوں کی ملازمت کا کوئی جواز سمجھ میں آ سکتا ہے اور ان کے یکساں نصاب تعلیم کا مسئلہ چل سکتا ہے لیکن موجودہ حالات میں دونوں باتوں کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے۔

عورت اور ملازمت؟

گزشتہ صفحات سے واضح ہے کہ تربیت اولاد میں عورت کا کردار نہایت بنیادی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ماں کی گود ہی سب سے پہلا اسکول ہے۔ اس کی پہلی معلّمہ اس کی ماں ہے اور اس کا پہلا سبق وہ لوری ہے جو ماں اپنے بچے کو ایام شیر خوارگی میں دیتی ہے۔ یہ اسکول جتنا صاف ستھرا ہوگا، اس کی معلّمہ (ماں) جتنی نیک سیرت، پاکیزہ اطوار اور اسلامی جذبات کی حامل ہوگی اور اس کی لوری (سبق) میں جس حساب سے اخلاص اور خیر خواہی ہوگی، اسی حساب سے بچے کی ذہنی نشو ونما اور اس کے کردار کی تربیت ہوگی، اس لیے ضروری ہے کہ اس معلّمۂ اول کی صحیح تعلیم و تربیت ہو، اس کے قلب و ذہن کی جلا ہو اور اس کے دماغ کا تزکیہ ہو تاکہ اس کی گود میں پلنے والا بچہ بھی صحیح ہو، اس کا قلب و دماغ مسلمان ہو اور اسے ایک صحیح ماحول اور صحیح سانچہ میسر آجائے جس میں وہ اپنے اخلاق و کردار کو ڈھال سکے اور قلب و ذہن کی اصلاح و تطہیر کر سکے۔

مسلمانوں میں یہ مدرسۂ اول جب تک صحیح، فعال اور مؤثر رہا، مذکورہ مقصد حاصل ہوتا رہا اور ان کے نونہال اسلامی تعلیم و تربیت سے آراستہ ہوتے رہے اور انھوں نے اپنے عمل و کردار کے انمٹ نقوش صفحۂ ہستی پر ثبت کیے اور اپنی ایمانی قوت اور حسن اخلاق کے ہتھیار سے ایک دنیا کو مسخر کر لیا اور چار دانگ عالم میں اسلامی تہذیب کا پھریرا لہرا دیا۔ صرف باہر ہی فتوحات کے جھنڈے نہیں گاڑے بلکہ اندرونی طور پر بھی مسلمان اپنی مملکت میں جسد واحد کی طرح ایک دوسرے کے ہمدرد و غم خوار رہے۔ بمصداق حدیث نبوی:

«اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا»

''مومن دوسرے مومن کے لیے ایک عمارت یا دیوار کی طرح ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کی مضبوطی کا باعث ہے۔''[1]

لیکن اب بدقسمتی سے یہ خاندانی حصار، جو مسلمانوں کی قوت و استحکام اور وحدت و یک جہتی کا مظہر تھا، ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے، اس اسکول کو اجاڑا جا رہا ہے اور اس کی معلّمہ کو تعلیمی و تربیتی کردار ادا کرنے کی بجائے، معاشی جھمیلوں میں الجھایا جا رہا ہے۔ اسے گھر کی بجائے، دفتروں اور کارخانوں کی زینت اور اس چراغ خانہ کو شمع محفل بنانے پر اصرار کیا جا رہا ہے تاکہ وہ اپنے اصل کردار سے محروم ہو جائے۔

اس سازش کے لیے بڑے حسین جال بچھائے گئے ہیں، اسے خوش نما عنوانات سے معنون کیا گیا ہے اور دل فریب وعدوں کا سبز باغ دکھایا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ عورت آبادی کا نصف حصہ ہے۔ وہ جب تک مردوں کے دوش بدوش ترقی میں حصہ نہیں لے گی، ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ اسے گھروں میں بیکار نہیں چھوڑا جا سکتا، چنانچہ اسے گھر سے باہر دھکیلا جا رہا ہے تاکہ وہ بھی ہر وہ کام کرے جو مرد کر رہا ہے، حالانکہ مساوات مرد و زن کا یہ مغربی نظریہ اسلام کی تعلیمات کے یکسر خلاف ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ مرد اور عورت یقیناً انسانی زندگی کے دو پہیے ہیں جو ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں اور ان دونوں کے مجموعی عمل و کردار کا نام ہی زندگی ہے۔ نہ مرد عورت سے بے نیاز ہو سکتا ہے اور نہ عورت مرد سے بے پروا۔ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت اور ایک دوسرے کے لیے لازم ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ اس حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو الگ الگ مقصد کے لیے تخلیق کیا ہے، اس لیے دونوں کو صلاحیتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف

[1] صحيح البخاري، الأدب، باب تعاون المؤمنين بعضهم بعضا، حديث: 6026 .

اور جداگانہ دی گئی ہیں۔ جو صلاحیتیں اللہ نے عورت کے اندر رکھی ہیں، مردان سے محروم ہیں اور مردوں والی خصوصیات سے عورت محروم ہے۔ انسانی زندگی کا یہ نظام صحیح طریقے سے چلانے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں اپنے اپنے مقصد تخلیق کے مطابق، اپنی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔

مرد کو جو صلاحیتیں اور قوتیں دی گئی ہیں۔ اس کے اعتبار سے اس کا دائرۂ عمل گھر سے باہر کا میدان ہے۔ کاروبار و تجارت ہے، زراعت و باغبانی ہے، فیکٹری اور کارخانے ہیں اور امور سیاست و جہاں بانی ہیں جبکہ عورت کا دائرۂ عمل اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق، گھر کی چاردیواری ہے، وہ گھر کے اندر رہ کر امور خانہ داری سرانجام دے، بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم و تربیت اور خاوند کی خدمت کرے۔ یوں عورت مرد کو خانگی معاملات اور ذمے داریوں سے فارغ رکھے تاکہ وہ یکسوئی سے، گھر سے باہر، کسب معاش کے لیے جدوجہد کرتا رہے اور مرد عورت کو معاشی بکھیڑوں سے بچا کر رکھے تاکہ وہ یکسوئی سے گھریلو کام سرانجام دے سکے۔ مسلمان معاشروں میں صدیوں سے مرد اور عورت اسی انداز سے اپنے اپنے دائرے میں کام کرتے آرہے ہیں، کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ عورت بیکار ہے اور گھر میں اس کی کوئی ذمے داری نہیں ہے کیونکہ واقعتاً عورت گھر میں بیکار نہیں رہتی بلکہ مرد ہی کی طرح سارا دن مصروف جہد و سعی رہتی ہے۔ گھر کی چاردیواری کے اندر گھریلو امور سرانجام دینے والی عورت کو بے کار کہنا یا قرار دینا سراسر خلاف واقعہ بات، بہت بڑا جھوٹ اور ایک عظیم بہتان ہے۔ یہ گھریلو عورت، ملک کی ترقی میں مرد کے برابر حصہ لے رہی ہے، اگر یہ مرد کو وہ سکون خاطر اور بےفکری مہیا نہ کرے، جو گھر کی طرف سے اسے عورت اپنے گھریلو کردار کی وجہ سے مہیا کرتی ہے تو مرد اپنے میدان میں مؤثر اور بھرپور کردار ادا کرنے کے قابل ہی نہیں ہوسکتا۔ مرد کی اس محنت وسعی میں، جو وہ

گھر سے باہر کرتا ہے، یقیناً عورت کا حصہ بھی شامل ہے۔ جو وہ گھر کے اندر رہ کر نہایت خاموشی سے اس میں ڈالتی ہے۔

اس لیے مسلمان عورت کو اس حسین جال میں پھنسنے سے گریز کرنا چاہیے اور قرآن کے حکم:

﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾

''اپنے گھروں میں ٹک کر رہو۔''[1]

پر عمل کرتے ہوئے اپنی سرگرمیوں کو خانگی امور تک ہی محدود رکھنا چاہیے۔ یہی ہمارے مذہب کی تعلیم ہے، یہی مسلمان عورت کی تاریخ ہے اور یہی ہماری تہذیب ہے۔ اس تعلیم، اس تاریخ اور اس تہذیب سے انحراف ''خودکشی'' ہے، تباہی و بربادی ہے اور عورت پر ظلم ہے۔

مردوں کے دوش بدوش کام کرنے والا نعرہ دنیا کی ہوس اور مادیت پرستی کو فروغ دیتا ہے۔ یہ نعرہ دراصل عورت کو اس کے نسوانی وقار سے محروم کرنا اور اسے مرد بنانا ہے، جو عورت پر ایک بہت بڑا ظلم ہے کیونکہ عورت کی تخلیق کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ نسل نو کی ماں بنے۔ یہ مقصد اسے بہرصورت پورا کرنا ہے جس کے لیے وہ نو مہینے مسلسل حمل کی تکلیف برداشت کرتی ہے اور اس کے بعد وضع حمل کا مرحلہ بھی، جو اس کے لیے موت و حیات کی کشمکش کا مرحلہ ہوتا ہے، وہ بھی برداشت کرتی ہے، پھر وہ دو سال تک رضاعت (دودھ پلانے) کی تکلیف بھی برداشت کرتی ہے، اس کے لیے اسے راتوں کو جاگنا پڑتا ہے تو جاگتی ہے، اپنے آرام و راحت کو قربان کرتی ہے اور اپنی جان و صحت کو بھی گھلاتی ہے۔ ان تمام تکلیفوں کی وجہ ہی سے اسلام نے معاشی کفالت کا تمام تر بوجھ مرد پر ڈالا ہے اور عورت کو اس ذمے داری سے کلیتاً فارغ رکھا ہے لیکن مذکورہ نعرے کا مطلب ہے

[1] الأحزاب 33:33.

کہ حمل، ولادت اور رضاعت وغیرہ کی تمام تکلیفوں کے ساتھ، عورت کما کر بھی لائے، اس کے لیے سڑکوں کی خاک بھی چھانے، دفتروں اور کارخانوں کے چکر بھی لگائے اور ہر جگہ مردوں کی ہوس ناک نگاہوں کا ہدف بن کر اپنی عصمت و تقدیس کی چادر کو بھی داغ دار اور تار تار کروائے۔ یہ عورت پر ظلم نہیں تو کیا ہے؟ یہ دہری ذمے داری عورت پر کیا اللہ نے ڈالی ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں! اللہ تعالیٰ اس ظلم سے بری ہے۔

﴿وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾

"تیرا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔"[1]

علاوہ ازیں لاکھوں تعلیم یافتہ بے روزگار مردوں کی موجودگی میں، ہر شعبۂ زندگی میں عورتوں کو ملازمتیں مہیا کرنے کی پالیسی مغرب کی اندھا دھند نقالی کے سوا کچھ نہیں۔ اس سے ملک کو ترقی نہیں، تنزلی ملے گی اور اخلاقی قباحتوں کا جو طوفان برپا ہوگا وہ اس پر مستزاد۔ مغرب کی اس پالیسی سے کارخانوں اور دفتروں میں کچھ "رونق" ضرور بہم پہنچ گئی ہے اور مردوں کی ہوسناکی کی تسکین کا کچھ سامان یقیناً ہو گیا ہے لیکن اس پالیسی نے ان کے خاندانی نظام کا تیا پانچا کر کے رکھ دیا ہے۔ مغرب میں اولاد ماں باپ سے بیزار اور ماں باپ اولاد سے بیزار ہیں۔ میاں، بیوی سے متنفر اور بیوی، میاں سے متنفر ہے۔ بالخصوص بوڑھے ماں باپ کا کوئی پرسان حال نہیں۔ وہ اپنا بڑھاپا، حکومت کے مہیا کردہ "اولڈ ہوموں" میں گزارنے پر مجبور ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلام میں خاندان ایک اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جوان اولاد کو تاکید ہے کہ وہ والدین کی خدمت و اطاعت کریں، ان کے نازک جذبات کو ذرا سی بھی ٹھیس نہ پہنچائیں اور ان کے ادب و احترام میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔

1 حٰمٓ السجدة 46:41 .

جب مادیت کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ گھر کا ہر فرد چاہے وہ عورت ہو یا مرد، جوان ہو یا بوڑھا، معاشی مشین کا کل پرزہ ضرور بنے، ورنہ اس کے لیے گھر میں رہنے کی کوئی جگہ نہیں ہوگی تو پھر از کار رفتہ (معذور)، ریٹائرڈ اور ضعیف و ناتواں ماں باپ کو کون اپنے گھر پر رکھ کر ان کو نان ونفقہ اور ضروریات زندگی مہیا کرنے پر آمادہ ہوگا؟

مادیت کے اس غلبے میں ''معیار زندگی'' بلند کرنے کے نعرے کا بھی بڑا دخل ہے۔ معیار زندگی بلند کرنے کا مطلب یہ لیا اور پھیلایا جا رہا ہے کہ نہایت عالی شان بنگلہ، کوٹھی یا مکان ہو، جس میں دنیا بھر کی آسائشیں بہم ہوں، چنانچہ ان آسائشوں کے حصول کے لیے مرد و عورت کی تمیز کیے بغیر گھر کا ہر فرد کمائی کرتا ہے تاکہ وہ اپنا معیار زندگی بلند کرنے میں کسی سے پیچھے نہ رہ جائے۔ اس نعرے نے بھی بڑی قیامت ڈھائی ہے اور لوگوں نے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے درمیان تفریق کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اولاً تو یہ نعرہ ہی غلط ہے۔ اس کی جگہ معیار اخلاق بلند کرنے کا نعرہ قوم کو دیا جانا چاہیے کہ اصل سکون و راحت، آسائشوں کی فراوانی سے نہیں، حسن اخلاق اور رفعت کردار کی ارزانی ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ معیار اخلاق کے بلند نہ ہونے اور مادیت پرستی کی وجہ سے عموماً آج کل کی خواتین اپنے خاوندوں کی ناشکری کرنے کے مرض میں مبتلا ہیں، حالانکہ یہ ایک نہایت قبیح جرم ہے جس سے ہر خاتون کو پرہیز کرنا چاہیے اور اس سے متعلق نبوی تعلیمات کو سامنے رکھنا چاہیے۔

خاوند کی ناشکری، ایک بڑا جرم اور اس کا نبوی حل

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں سورج گرہن کا واقعہ بیان فرمایا، اس میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو نماز کسوف پڑھائی۔ اس نماز میں آپ کو جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کروایا گیا، نماز کے بعد آپ نے اس کی کچھ تفصیل بیان

فرمائی۔اس میں آپ نے فرمایا:

«وَرَأَيْتُ النَّارَ فَلَمْ أَرَ كَالْيَوْمِ مَنْظَرًا قَطُّ، وَرَأَيْتُ أَكْثَرَ أَهْلِهَا النِّسَاءَ، قَالُوا لِمَ يَارَسُولَ اللهِ؟ قَالَ بِكُفْرِهِنَّ قِيلَ يَكْفُرْنَ بِاللهِ؟ قَالَ يَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ، وَيَكْفُرْنَ الْإِحْسَانَ، لَوْ أَحْسَنْتَ إِلٰى إِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا، قَالَتْ: مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ»

''میں نے جہنم کو دیکھا اور اس جیسا (ہولناک) منظر، جو میں نے آج دیکھا، کبھی نہیں دیکھا اور میں نے جہنم میں اکثریت عورتوں کی دیکھی۔صحابہ نے پوچھا، اللہ کے رسول! اس کی وجہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:''ان کا ناشکری کرنا۔'' پوچھا گیا، کیا اللہ کی ناشکری کرنا؟ آپ نے فرمایا:''(نہیں!) وہ خاوند کی ناشکری کرتی ہیں اور اس کے احسان کو تسلیم نہیں کرتیں۔اگر تم ان میں سے کسی کے ساتھ زندگی بھر احسان کرتے رہو، پھر وہ تم سے کوئی ایسی بات دیکھ لے جو اس کے مزاج اور طبیعت کے خلاف ہو تو وہ کہے گی، میں نے تو تیرے ہاں کبھی سُکھ دیکھا ہی نہیں۔''[1]

اس حدیث میں عورتوں کی ایک بہت بڑی کمزوری کا بیان ہے اور وہ ہے خاوند کی ناشکری۔عورت مرد کی رفیقِ زندگی اور شریکِ سفر ہے۔زندگی میں نشیب وفراز اور حالات میں مدّ و جزر آتے رہتے ہیں۔انصاف اور اخلاق کا تقاضا ہے کہ کبھی مرد مشکلات میں پھنس جائے اور اس پر تنگ دستی کا دَور آ جائے تو ایسے حالات میں بھی عورت مرد کا اسی طرح ساتھ دے جیسے خوش حالی کے دَور میں وہ دیتی رہی تھی اور حرفِ شکایت زبان پر

1 صحيح البخاري، النكاح، باب كفران العشير، وهو الزوج...... ، حديث: 5197

لا کر مرد کی دل شکنی یا اس کی مشکلات میں اضافہ نہ کرے۔

جو عورتیں اس کے برعکس رویہ اختیار کرتی ہیں اور تنگی میں بھی ان کی توجہ اپنے لباس، اپنے زیورات اور اپنی آسائشوں اور سہولتوں ہی پر رہتی ہے اور ان میں کمی آنے پر مردوں کو کوستی اور شکوے شکایتوں سے مردوں کی پریشانیوں میں اضافے کا باعث بنتی ہیں تو یہ ناانصافی ہے اور خاوندوں کی ناشکری ہے جو اللہ کو ناپسند ہے اور یہ صفت اسے اتنی ناپسند ہے کہ اسی وجہ ہی سے اللہ تعالیٰ ایسی عورتوں کو جہنم میں ڈال دے گا۔

بنا بریں ضروری ہے کہ جنت میں جانے کی خواہش مند نیک خواتین، اس حدیثِ رسول کو ہر وقت اپنے سامنے رکھیں اور کسی موقع پر بھی خاوند کی ناشکری کریں نہ اللہ کی کیونکہ یہ دونوں ناشکریاں جہنم میں لے جانے کا باعث بن سکتی ہیں بلکہ بہتر ہے کہ محرومی اور تنگ دستی کے موقع پر نبی ﷺ کی یہ حدیث سامنے رکھی جائے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

«اُنْظُرُوا إِلٰی مَنْ هُوَ أَسْفَلَ مِنْكُمْ، وَلَا تَنْظُرُوا إِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ فَهُوَ أَجْدَرُ أَنْ لَّا تَزْدَرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ»

''ان کو دیکھو جو تم سے کمتر ہیں، ان کو مت دیکھو جو تم سے برتر ہیں۔ اس طرح تم ان نعمتوں کی، جو اللہ نے تمھیں عطا کی ہیں، ناقدری نہیں کرو گے۔'' [1]

یعنی جو شخص دنیوی مال و اسباب یا ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے تم سے برتر ہے، اسے مت دیکھو ورنہ تمھیں جو بے شمار نعمتیں حاصل ہیں، ان کی کوئی قدر تمھاری نظر میں نہیں رہے گی اور یوں تم اللہ کی ناشکری کرو گے۔ اس کے برعکس جب تم اپنے سے کم تر یا اپنے سے بدشکل لوگوں کو دیکھو گے تو تمھارے دل میں اللہ کی نعمتوں کا احساس پیدا ہوگا اور تم اللہ کا شکر کرو گے۔ اس مفہوم کو ایک دوسری حدیث میں اس طرح واضح کیا گیا ہے:

[1] صحيح مسلم، الزهد، باب الدنيا سجن للمؤمن وجنة للكافر، حديث: 2963.

«إِذَا نَظَرَ أَحَدُكُمْ إِلٰى مَنْ فُضِّلَ عَلَيْهِ فِي الْمَالِ وَالْخَلْقِ، فَلْيَنْظُرْ إِلٰى مَنْ هُوَ أَسْفَلَ مِنْهُ مِمَّنْ فُضِّلَ عَلَيْهِ»

''جب تم میں سے کوئی شخص ایسے شخص کو دیکھے جو مال و دولت اور پیدائش (حسن و جمال) میں اس سے زیادہ حیثیت رکھنے والا ہو تو وہ ایسے شخص کو بھی دیکھے جو مذکورہ حیثیتوں کے اعتبار سے اس سے کمتر ہو۔''[1]

ایک اور حدیث میں نقطۂ نظر کے مذکورہ دونوں پہلوؤں کے نتائج کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«خَصْلَتَانِ مَنْ كَانَتَا فِيهِ كَتَبَهُ اللهُ شَاكِرًا صَابِرًا، وَمَنْ لَّمْ تَكُونَا فِيهِ لَمْ يَكْتُبْهُ اللهُ شَاكِرًا وَّلَا صَابِرًا، مَنْ نَّظَرَ فِي دِينِهِ إِلٰى مَنْ هُوَ فَوْقَهُ فَاقْتَدٰى بِهِ، وَمَنْ نَّظَرَ فِي دُنْيَاهُ إِلٰى مَنْ هُوَ دُونَهُ فَحَمِدَ اللهَ عَلٰى مَا فَضَّلَهُ بِهِ عَلَيْهِ، كَتَبَهُ اللهُ شَاكِرًا وَّصَابِرًا وَمَنْ نَّظَرَ فِي دِينِهِ إِلٰى مَنْ هُوَ دُونَهُ وَنَظَرَ فِي دُنْيَاهُ إِلٰى مَنْ هُوَ فَوْقَهُ فَأَسِفَ عَلٰى مَا فَاتَهُ مِنْهُ لَمْ يَكْتُبْهُ اللهُ شَاكِرًا وَّلَا صَابِرًا»

''دو خصلتیں ایسی ہیں جس میں وہ ہوں گی، اللہ تعالیٰ اسے شاکر و صابر لکھ دیتا ہے اور جس میں وہ نہیں ہوتیں، اسے اللہ شاکر و صابر نہیں لکھتا۔ جو شخص اپنے دین کے معاملے میں ایسے شخص پر نظر رکھتا ہے جو اس سے بڑھ کر ہے، پھر اس کی اقتدا کرتا ہے اور دنیا کے معاملے میں اس شخص کو دیکھتا ہے جو اس سے کمتر حیثیت

1 صحيح البخاري، الرقاق، باب لينظر إلى من هو أسفل منه...... ، حديث: 6490 .

کا حامل ہے، پھر اس بات پر اللہ کی حمد کرتا ہے کہ اللہ نے اس کو اس پر فضیلت عطا کی ہے تو (ان دو خصلتوں کے حامل شخص کو) اللہ تعالیٰ شاکر اور صابر لکھ دیتا ہے۔ جو شخص اپنے دین کے معاملے میں اپنے سے کمتر (دیندار) کو دیکھتا ہے اور دنیا کے معاملے میں اپنے سے برتر (مال دار) کو دیکھتا ہے اور پھر جو اسے (دنیا کے مال و اسباب میں سے) میسر نہیں ہے اس پر افسوس کا اظہار کرتا ہے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ شاکر لکھتا ہے نہ صابر۔''[1]

اس حدیث میں مذکورہ دو خصلتوں کی موجودگی یا عدم موجودگی کا نتیجہ بتلایا گیا ہے۔ جس میں پہلی دو خصلتیں ہوں گی، وہ یقیناً ایک تو دین و شریعت کی پابندی کا بھی زیادہ اہتمام کرے گا کیونکہ اس کی نظر اپنے سے زیادہ متقی و پارسا شخص پر ہو گی اور وہ اِسی کو نمونے کے طور پر اپنے سامنے رکھ کر اس کی اقتدا کرے گا۔ دوسرے، وہ شخص اللہ کا شکر بھی خوب ادا کرے گا کیونکہ وہ ہر وقت ان کو دیکھے گا جو اس سے بھی زیادہ محروم قسم کے لوگ ہیں تو قدرتی طور پر ہر وقت اس کی زبان کلماتِ حمد سے تر اور اس کا دل اعترافِ نعمت سے معمور رہے گا۔ اِس کے برعکس جس شخص کے اندر یہ دو خصلتیں نہیں ہوں گی، وہ ایک تو دین و شریعت کی پابندی کا بھی زیادہ اہتمام نہیں کرے گا کیونکہ اس کے سامنے وہ نمونے ہوں گے جو دین کے زیادہ پابند نہیں ہوں گے۔ دوسرے، یہ شخص ہر وقت اپنی محرومی ہی کا گلہ اور اللہ کی نعمتوں کی ناقدری ہی کرے گا کیونکہ اس کے آئیڈیل وہ لوگ ہوں گے جو محض دنیا دار اور ہر طرح کے وسائل سے بہرہ ور ہوں گے۔

رہن سہن میں ناز و نعمت کی بجائے تواضع اور سادگی پسندیدہ ہے

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں یمن بھیجنے

[1] جامع الترمذي، صفة القيامة، باب انظروا إلى من هو أسفل منكم، حديث: 2512.

لگے تو آپ نے فرمایا:

«إِيَّاكَ وَالتَّنَعُّمَ فَإِنَّ عِبَادَ اللهِ لَيْسُوا بِالْمُتَنَعِّمِينَ»

''ناز ونعمت کی زندگی سے اجتناب کرنا کیونکہ اللہ کے بندے ناز ونعمت اختیار کرنے والے نہیں ہوتے۔'' [1]

اس حدیث میں نبی ﷺ نے ناز ونعمت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ناز ونعمت سے کیا مراد ہے؟ پُر تکلف زندگی، ہر وقت دنیاوی آسائشوں کی طلب میں رہنا، لباسِ فاخرہ زیبِ تن کیے رکھنا اور لباس کی کریز کو خراب نہ ہونے دینا، شاہانہ کروفر اور امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ اختیار کرنا، وغیرہ۔

اس کے مقابلے میں جو چیز پسندیدہ اور ایک مومن کی شان کے زیادہ لائق ہے، اسے اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے جو ابوامامہ حارثی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الْإِيمَانِ، إِنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الْإِيمَانِ»

''بلاشبہ بذاذت (لباس اور رہن سہن میں سادگی) ایمان کا حصہ ہے، بلاشبہ بذاذت ایمان کا حصہ ہے۔'' [2]

اس میں بھی تواضع کے طور پر سادگی اختیار کرنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ لَبِسَ ثَوبَ شُهْرَةٍ فِي الدُّنْيَا، أَلْبَسَهُ اللهُ ثَوْبَ مَذَلَّةٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، ثُمَّ أَلْهَبَ فِيهِ نَارًا»

''جس نے دنیا میں شہرت کا لباس پہنا، اسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ذلّت کا

---

1 مسند أحمد: 243/5، 244، وسلسلة الأحاديث الصحيحة، حديث: 353. 2 سنن أبي داود، الترجل، باب النهي عن كثير من الإرفاه، حديث: 4161، وسنن ابن ماجه، الزهد، باب من لا يؤبه له، حديث: 4118، وسلسلة الأحاديث الصحيحة، حديث: 341.

لباس پہنائے گا، پھر اس میں آگ بھڑکا دے گا۔“[1]

شہرت کے لباس سے مراد، فخر و تکبر اور ریا کاری کی نیت سے بیش قیمت لباس کا پہننا ہے، ورنہ فی نفسہ قیمتی لباس پہننا ممنوع نہیں۔

ہمیں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی زندگیوں کو اپنی مشعل راہ بنانا چاہیے۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آج کل ہمارے رہن سہن، معاشرت اور طرز زندگی میں عیش و عشرت اور تکلفات کی جو ارزانی ہوگئی ہے اور آرائش و زیبائش کا جو طوفان برپا ہے، کیا اس کا ادنیٰ سا تعلق بھی نبی ﷺ کے طرزِ زندگی اور آپ کی معاشرت سے ہے؟ یقیناً نہیں ہے۔ آپ نے ان تکلفات کو، جنھیں ہم نے زندگی کے لوازمات بنا لیا ہے، قطعاً پسند نہیں فرمایا ہے بلکہ آپ نے تو دنیا کی آسائشوں اور سہولتوں کی فراوانی کو تباہی و بربادی کا سبب بتلایا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَوَاللهِ مَا الْفَقْرُ أَخْشٰى عَلَيْكُمْ وَلٰكِنْ أَخْشٰى عَلَيْكُمْ أَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا كَمَا بُسِطَتْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ فَتَنَافَسُوهَا كَمَا تَنَافَسُوهَا ، وَتُلْهِيَكُمْ كَمَا أَلْهَتْهُمْ»

”اللہ کی قسم! مجھے تمھارے فقر سے کوئی اندیشہ نہیں، مجھے اندیشہ ہے تو اس بات سے کہ تم پر دنیا فراخ کر دی جائے گی جس طرح کہ تم سے پہلے لوگوں پر فراخ کر دی گئی تھی، پس تم بھی اس دنیا میں اِسی طرح رغبت کرو گے جیسے انھوں نے رغبت کی تھی اور یہ رغبت پھر تمھیں بھی اسی طرح ہلاک کر دے گی جیسے اس نے ان کو ہلاک کر دیا تھا۔“[2]

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خواتین کو دنیا میں نام نہاد معیار زندگی کو بلند کرنے کے نام پر

---

1. سنن ابن ماجه، اللباس، باب من لبس شهرة من الثياب، حديث: 3607. 2 صحيح البخاري، الرقاق، باب ما يحذر من زهرة الدنيا والتنافس فيها، حديث: 6425.

خواتین کو باہر نکالنے کی اس مغربی سازش سے بچنا چاہیے اور اپنی زندگی میں تعلیمات نبوی کو جو خاوند کی اطاعت اور سادگی سکھاتی ہیں انھیں اختیار کرنا چاہیے اور اسلام نے انھیں جو مقام ومنصب عطا کیا ہے اس پر فخر کرنا اور اس پر جمے رہنا چاہیے۔

اسلام نے عورت کو گھر کی ملکہ بنایا ہے۔ اسے بچوں کی اور گھر کی حفاظت کے علاوہ صرف اپنے خاوند کی خدمت واطاعت کی تاکید ہے۔ایک حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! لَا تُؤَدِّي الْمَرْأَةُ حَقَّ رَبِّهَا حَتَّى تُؤَدِّيَ حَقَّ زَوْجِهَا وَلَوْ سَأَلَهَا نَفْسَهَا ، وَهِيَ عَلٰى قَتَبٍ ، لَمْ تَمْنَعْهُ»

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! عورت اس وقت تک اپنے رب کا حق ادا نہیں کرسکتی جب تک وہ اپنے خاوند کا حق ادا نہیں کرتی، خاوند اگر اسے ایسی حالت میں بلائے کہ وہ اونٹ پر (سفر کے لیے) بیٹھی ہو، تب بھی وہ اس کے پاس آنے سے انکار نہ کرے۔''[1]

یہ ہے اسلام کی نیک عورت۔ اسلام نے کمائی کرنے والی عورت کو، ٹائپسٹ، کلرک اور سٹینوگرافر قسم کی عورت کو یا پائیلٹ، ایئرہوسٹس یا سیاست کے پھڈے میں ٹانگ اڑانے والی عورت کو نیک عورت نہیں کہا بلکہ صرف اور صرف گھر کی چاردیواری کے اندر رہ کر خانگی امور سرانجام دینے والی عورت کو ''نیک عورت'' کہا ہے۔ اسی طرح پیغمبرِ اسلام نے فرمایا:

«تَزَوَّجُوا الْوَدُودَ الْوَلُودَ»

''تم زیادہ بچے جننے والی اور زیادہ محبت کرنے والی عورت سے شادی کرو۔''[2]

---

1 سنن ابن ماجه، النكاح، باب حق الزوج على المرأة، حديث: 1853 . 2 سنن أبي داود، النكاح، باب النهي عن تزويج من لم يلد من النساء، حديث: 2050 .

اگر اسلام میں عورت کو بھی سروس، ملازمت اور معاش وتجارت اختیار کرنے کا حکم ہوتا تو زیادہ کماؤ عورت کو بہترین عورت قرار دیا جاتا۔ اسی طرح اسے یہ حکم نہ دیا جاتا کہ ''گھر میں ٹک کر رہو''[1] نہ پردے کی اتنی تاکید کی جاتی، جتنی کہ اس کی تاکید ہے کیونکہ پردے کی پابندی کے ساتھ معاشی جدوجہد میں حصہ لینا نہایت مشکل ہے۔ نہ عورت کے لیے بچے جننے کو مستحسن قرار دیا جاتا کیونکہ بچے بھی ملازمت اور کسب معاش کی راہ کے سنگ گراں ہیں۔

(اسی سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کے ایک نہایت اہم مضمون کا اقتباس اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔)

[1] الأحزاب 33:33.

خواتین کی تعلیم اور ملازمت کا مسئلہ

ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم

امام غزالی اور علامہ اقبال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہیے کہ وہ خدانخواستہ عورتوں کی تعلیم کے مخالف تھے۔ وہ مخالف ہرگز نہ تھے وہ بس یہ چاہتے تھے کہ عورتیں صرف وہ تعلیم حاصل کریں جو ان کی فطرت، خلقت اور فرائضِ مخصوصہ کے مطابق زندگی میں ان کے اور خاندان کے کام آئے اور صحیح یہ ہے کہ قدرت نے عورت کے لیے الگ دائرۂ کار مقرر کیا ہے جس کی تشریح کی یہاں ضرورت نہیں کیونکہ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ بے شمار کام ایسے ہیں جو مرد نہیں کر سکتے اور لاتعداد کام ایسے ہیں جو عورتوں کی طاقت سے باہر ہیں، لہٰذا ہر گروہ کو ان کے کاموں کی نسبت سے تعلیم دینی چاہیے۔ یہ اعلیٰ اور ادنیٰ تعلیم کا معاملہ نہیں بلکہ ہر کسی کو اس کے مزاج اور فطری تقاضوں کے مطابق مناسب تعلیم دینے کا مسئلہ ہے اور یہ خیالات صرف غزالی اور اقبال ہی کے نہیں خود سر سید احمد خان کے بھی ہیں جو مغربی انداز کے ہمارے یہاں اولین بڑے علمبردار تھے۔ سر سید احمد خان کی یہ سرگزشت دیکھنی ہو تو ان کا سفرنامۂ پنجاب مرتبہ سید اقبال علی پڑھیے۔

اور جہاں تک مخلوط تعلیم کا تعلق ہے تو مذکورہ بالا بزرگ اور دوسرے ہزاروں علماء و حکماء اسے خطرناک سمجھتے تھے کیونکہ اس کا ان معاشرتی و اخلاقی احکام سے تصادم ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہیں یا جن کا اوپر ذکر آیا۔ یہ امر عورتوں پر پابندی یا سختی کے ضمن میں

نہیں آتا، اس میں عورتوں کے لیے برکتیں اور حکمتیں ہیں ان میں سب سے بڑی حکمت عورتوں کا معاشرتی تحفظ، ان کی عزت کی حفاظت اور خاندانی زندگی کا استحکام ہے۔

عورتوں کو ہر سطح تک تعلیم دی جا سکتی ہے، بشرطیکہ مذکورہ بالا مصلحتوں اور حکمتوں کو گزند نہ پہنچے اور یہ سب عورتوں کے فائدے کی خاطر ہے ان پر زیادتی نہیں۔

مخلوط اور یکساں نصاب پر بحث کی ضرورت نہیں، اس کا نفع نقصان سب کو معلوم ہے لیکن اگر تعلیم مخلوط نہ ہو تو عورتوں کو اختیار دیا جائے کہ وہ ہر شعبۂ تعلیم میں جسے وہ اپنے لیے مفید سمجھتی ہیں داخلہ لے لیں، یعنی ان سب شعبوں میں جو انھیں اپنے لیے مفید نظر آئیں یا معاشرے کے لیے مفید ہوں لیکن مخلوط ملازمتوں کا مسئلہ جدا ہے، مخلوط ملازمتوں کے سلسلے میں جو قباحتیں ہیں وہ ہر کسی کو معلوم ہیں۔

ظاہر ہے کہ عورتیں اپنے لیے جن مضامین کو مفید خیال کریں گی ان میں اکثر ایسے ہوں گے جو مردوں کے لیے بیگانہ اور نامانوس ہوں گے، اس لیے اگر عورتوں کی تعلیم کا نظام یکسر علیحدہ ہوگا تب جا کر انھیں فائدہ ہوگا۔ اس کا واحد علاج عورتوں کے لیے بالعموم الگ نصاب اور ایک الگ خواتین یونیورسٹی کا قیام ہے۔ مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں نصاب کا فلسفہ غیر قدرتی اور غیر معقول ہے۔ یہ بات اور ہے کہ آج کی دنیا میں اس غیر معقول فلسفے کو اپنایا جا رہا ہے اگرچہ اس میں عورتوں کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے لیکن رواج عام کا غلبہ زبردست شے ہے، اس کے سامنے ہر کوئی دب جاتا ہے۔ اس رواج کو تبدیل کرنے کے لیے ایک معاشرتی انقلاب کی ضرورت ہے مگر ایسا انقلاب کوئی آسان کام نہیں، سب سے پہلے فکری تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور یہ تبدیلیاں مغربی معاشرتی فلسفوں پر مسلسل و منظّم تنقید کرتے رہنے سے اور عملی تجربوں کے حوالے سے ان کے خطرات سے آگاہ کرتے رہنے سے ممکن ہوں گی۔ جب تک ہمارے یہاں مغربی معاشرتی فلسفہ

غالب ہے ہماری سب دلیلیں بے کار و بے اثر ہوں گی، لہذا بقول علامہ اقبال مغربی معاشرتی حکمت پر بھرپور حملہ علمی ہتھیار سے لازمی ہے۔

ملازمتوں میں عورتوں کی شرکت، ایک اہم اور نازک معاشرتی افکار کے زیر اثر نقطۂ نظر کے بدل جانے کا نتیجہ ہے اگر ہم اس معاملے میں اسلام کی معاشرتی حکمتوں سے ہدایت لیں تو ہمیں اس شرکت میں بے شمار قباحتیں نظر آئیں گی بلکہ آج کل کے حالات میں ملازمت بڑی حد تک غیر اخلاقی اور نامناسب نظر آئے گی کیونکہ اسلام کی معاشرتی حکمت میں عورتوں کا فرض بچوں کی پرورش اور خانہ داری ہے اور اس کے بدلے مردوں کا فرض عورتوں بیویوں کی معاشی کفالت ہے تاکہ وہ بے فکر ہو کر اپنے دائرے میں خاندان کی خدمت کر سکیں۔ یہ خدمت ایک بہت بڑا منصب ہے اور جیسا کہ بعض روشن خیال حضرات باور کراتے ہیں، یہ کوئی کمتر فریضہ نہیں بلکہ اصل تعمیر انسانیت اسی فریضے میں مضمر ہے اور اس کی انجام دہی میں مرد کا کام اگر ان اصطلاحوں میں سوچیں تو خادم کا ہے جو بنی نوع انسان کی اس معمار بیوی کو اس کے اہم فریضے کی ادائیگی کے قابل بناتا ہے۔ اس عمل یا دو طرفہ عمل میں عورت کا درجہ بلند تر ہے، شوہر کا درجہ دوسرے نمبر پر آتا ہے مگر مغربی معاشرتی تصورات نے اس تقابل کو منقلب کر کے معاملہ زیر و زبر کر دیا ہے۔

یہ تو تھا اصولی عقیدہ ایک مسلمان کی حیثیت سے لیکن سوال آج کل کے حالات کا ہے، اس لیے موجودہ حالات میں عورتوں کی ملازمت کے جواز یا عدم جواز پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔

پہلے اس سوال کا جواب چاہیے کہ عورتیں ملازمتوں کی شائق یا طلب گار کیوں ہیں؟ مغربی ماحول میں تو ان کا شوق ملازمت اس لیے ہے کہ وہاں خاندان اور گھر کا تصور ایک فرسودہ عمل ہے۔ عورتیں نہ صرف ہم مرتبہ ہونے کا دعویٰ کر کے گھریلو آزادی کی طلب گار

ہیں بلکہ معاشی طور پر آزاد ہو کر ان تمام بندشوں سے بھی آزاد ہو جانا چاہتی ہیں جو خاندانی زندگی میں ان پر عائد ہوتی ہیں، وہ خود کفیل ہو کر ہمہ رنگ آزاد شہری بننا چاہتی ہیں، اس میں انھیں ہزار مشکلات بھی پیش آتی ہیں لیکن وہ آزادئ کامل کے لیے ہر مشکل کو برداشت کرتی ہیں۔

لیکن اس میں انھیں ایک آسانی بھی ہے اور وہ یہ کہ مذکورہ معاشرہ اس مسئلے میں ان کا ہم خیال ہے اور ہر چند کہ اس میں بداخلاقی کے سارے عیب پائے جاتے ہیں لیکن وہ معاشرہ ان خلافِ اخلاق باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا لیکن ہمارے ملک میں ایک مسلم خاتون کی مشکل یہ ہے کہ ہمارے مسلم معاشرے کے نزدیک ملازمت، غیر مردوں سے خلا ملا، ہر حال میں ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان عورت ملازمت کی طرف کیوں راغب ہوتی ہے؟ اس کے کئی اسباب ہیں جن میں سے بعض واقعی قابل توجہ ہیں اگرچہ عمومی رویہ محض مغرب کی نقالی سے ابھرا ہے۔ مغرب کی تقلید میں ہماری انتہا پسند خواتین عورتوں کی کامل آزادی کی قائل، مردوں کی ہر قسم کی بالادستی کی مخالف اور ان کی ہر قسم کی دست نگری سے گریزاں ہیں۔ یہ مغربی تعلیم اور نقالی کا نتیجہ ہے اور تسلی کا پہلو صرف یہ ہے کہ یہ فکر ابھی سرمایہ دار، بور ژوا اور دانشور طبقے تک محدود ہے اور معاشرے میں ان طبقات کے خلاف ایک گونہ تعصب بھی موجود ہے۔

(ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب رحمہ اللہ کا ایک اور اہم مضمون اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں)

''قوم کی نصف آبادی بیکار''......افسانہ یا حقیقت

(ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم)

مقالے کا عنوان میں نے ماضی قریب میں ہونے والی خواتین کانفرنس کی ایک قابل احترام مقرر خاتون سے لیا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ہماری قوم کی آبادی کا نصف حصہ بے کار ہے، اسے قومی تعمیر میں مکمل حصہ دار بنانا چاہیے۔

محترم خاتون کے ارشاد کا دوسرا حصہ بالکل درست ہے لیکن پہلے حصے کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے، اس بنیاد پر کہ انھوں نے مسلم معاشرے کو بدنام کرنے میں اہل مغرب کی مغالطہ انگیز مہم میں نادانستہ شرکت کی ہے۔ میں نے اسے بدنام کرنے کی مہم، اس لیے کہا ہے کہ قوم کے نصف حصے کو بیکار کہنا حقیقت کے خلاف ہے۔

غالباً خاتون محترم کہنا یہ چاہتی ہیں کہ خواتین کی اکثریت موجودہ تعلیم سے عاری اور غیر ملازمت پیشہ ہے اور اس حد تک بات غلط نہیں، درست ہے۔ مگر یہ کہنا کہ مسلمان عورتوں کی اکثریت بیکار ہے اور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی ہے، سراسر تہمت اور بہتان ہے۔ بالکل فارغ ہونے کی بات اگر درست ہے تو صرف ان گھرانوں کے بارے میں جو آسودہ حال، سرمایہ دار اور جاگیردار یا مفادات و رعایات زندگی سے بہرہ ور ہیں۔ ایسے گھرانوں میں نوکر چاکر بکثرت ہوتے ہیں اور خواتین تو کیا خود مردوں کے پاس کوئی مفید پیداواری کام نہیں ہوتا مگر دیہاتوں میں بسنے والی کروڑوں اور شہروں کی غریب متوسط اور نیم متوسط خواتین کا یہ حال نہیں۔ وہ قومی زندگی (خاندان کی تعمیر اور گھر

کو آباد رکھنے میں نہایت نتیجہ خیز اور قابل صد تحسین کام انجام دیتی ہیں، لہٰذا انھیں بیکار کہنا ان پر سخت زیادتی ہے۔

میں عورتوں کی تعلیم اور ان کی ملازمت دونوں کا حامی ہوں بلکہ یوں کہو تو بہتر ہو گا کہ ان کی موزوں تعلیم کو فرض عین اور بشرط ضرورت ان کے لیے ملازمت کو ایک مجبوری سمجھتا ہوں جس کی ذمے داری اس خوف پر ہے جو عورتوں کے دلوں میں مردوں (شوہروں) کے بارے میں پیدا کر دیا گیا ہے یا ہوتا ہے اس کے باوجود میں یہ نہیں مان سکتا کہ گھر اور خانہ داری کی مصروفیات معمولی، حقیر اور بیکاری کے مترادف ہیں۔ میرے خیال میں یہ کہنا کہ قوم کا نصف حصہ بے کار ہے، تہمت بھی ہے اور افسانہ بھی۔ تہمت، اس لیے کہ قوم کی حقیقی معمار (بچوں کی پرورش اور تربیت کرنے والی) آبادی کے خلاف یہ شرمناک طنز ہے جس میں تحقیر کا پہلو پایا جاتا ہے اور افسانہ، اس لیے ہے کہ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ وہ کروڑوں عورتیں جو دیہات میں رہتی ہیں۔ تربیت اطفال اور خانہ داری کے علاوہ بھی مردوں کے معاشی مشاغل میں شریک ہوتی ہیں، چنانچہ ہماری آخری مردم شماری میں اس قسم کا اشتراک ساٹھ اور ستر فیصد کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ پس کیا ہم ایسی اولو العزم دیہاتی عورتوں کو ''بے کار'' کے تحقیری لفظ سے یاد کر سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ دراصل سرمایہ دارانہ ذہن اور قوم کے سرمایہ دار طبقے کا اپنی بے کاری کو چھپانے کا پردہ (کاموفلاژ) ہے یا پھر مغرب کے خیمہ بردار طبقے کی تقلیدی آواز ہے جو ہمارے ملک میں معاشرتی انارکی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تحقیر کا یہ انداز بظاہر اس دلیل پر بھی مبنی ہے کہ یہ شہری خواتین اپنی دیہاتی بہنوں کو تعلیم سے عاری کہہ کر انھیں اپنے سے کم تر سمجھتی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم یافتہ ہونا، تعلیم یافتہ نہ ہونے سے بہتر اور برتر ہے اور ہم تعلیم نسواں کو فرض عین قرار دے چکے ہیں لیکن ہم اس دلیل کو فی الحال ماننے کے لیے تیار نہیں

کہ تعلیم یافتہ خواتین بہتر خانہ دار ثابت ہوتی ہیں اور ہر کوئی جانتا ہے کہ براہ راست ذمے داری کا بوجھ غیر تعلیم یافتہ خواتین صدیوں سے اٹھا رہی ہیں اوران کے نتائج میں یہی ایک دلیل کافی ہے کہ انھی عظیم المرتبہ خواتین نے غزالی، رازی، بوعلی سینا اور اقبال جیسے لوگ پیدا کیے اور بڑی کثیر تعداد میں عظیم افراد پیدا کیے۔ مغربی خواتین کا ایک حصہ بھی پرورش اطفال کو ضروری سمجھتا ہے مگر براہ راست ذمے داری کو اب وہاں بوجھ سمجھا جانے لگا ہے اب پرورش و تربیت کے مصنوعی اور غیر فطری طریقے نکل آئے ہیں اور یہ کام اداروں کے سپرد ہونے لگا ہے ''مادری'' ذمے داریاں اب ناگوار ہیں لیکن ہماری قوم کی خواتین کا بیشتر حصہ (خصوصاً غیر سرمایہ دار طبقوں میں) براہ راست مادری ذمے داریوں کو پورا کرتا ہے، انھیں بے کار کہنا قوم کی توہین ہے۔ یہ درست ہے کہ انھیں تعلیم یافتہ ہونا چاہیے لیکن یہ قصور قومی نظام تعلیم کا ہے جو عورتوں کو کیا، بجائے خود، مرد کی تعلیم کا بھی اطمینان بخش انتظام نہیں کرسکتا، پھر اس کی ذمہ داری غریبی اور مفلسی پر بھی ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ قومی معاشی نظام، سرمایہ داری کے غیر منصفانہ اصولوں پر مبنی ہے تو اس صورت میں دیہاتی عورتوں کا کیا قصور ہے؟

اب رہی بے کاری کی دوسری شق، یعنی یہ خیال کہ گھر کا انتظام داخلی اور خانہ داری گویا کوئی کام ہی نہیں، بڑی بھاری لاعلمی اور بے خبری کا غماز ہے۔ ہماری رائے میں وہ خواتین جو گھروں کا انتظام کرتی ہیں عظیم المرتبہ اور بلند سیرت خواتین ہیں جن سے گھروں میں آرام اور سکون واطمینان قائم ہے۔ اس کے علاوہ براہ راست ذمے داری سے خاندانوں میں الفت و یگانگت اور قوم کے محنت کش پیداواری طبقے (مردوں) کے لیے زندگی کی راحت اور قوت مہیا ہوتی ہے اور وہ مرد احسان فراموش ہیں جو بیویوں کے اس عظیم کردار کی قدر نہیں کرتے اور قوم کی محسن ہیں وہ خواتین جو اس بارِ گراں کو بخوشی برداشت کرتی

ہیں جو فطرت نے اور پھر اسلام نے ان پر یوں ڈالا کہ تدبیر منزل کو داخلی اور خارجی دو حصوں میں تقسیم کر کے تمدن کی گاڑی کو رواں رکھنے میں انسانیت پر احسان کیا۔

مسئلہ یہاں ملازمت کا بھی چھیڑا جا سکتا ہے جسے میں نے سابقہ بیانات میں ضروری و پسندیدہ اور بعض صورتوں میں مجبوری قرار دیا ہے۔[1] لیکن یہ خانہ داری کی زندگی سے الگ مسئلہ ہے اور اس کے بہت پہلو ہیں لیکن اشارتاً یہ ضروری ہے کہ یہ بھی ایک نظام اور تنظیم کا طلب گار ہے جس کی بنیاد خانہ داری کی عقلی دلیلوں اور اخلاقی مصالح پر رکھنی پڑے گی۔ ملازمت بے ضرورت اور محض برائے ملازمت، آگے چل کر تعلیم یافتہ مردوں اور عورتوں کی بے روزگاری جیسے مسائل اور باہمی مقابلہ اور رقیبانہ مسابقت پیدا کر سکتی ہے۔

بہر حال اس وقت مجھے ثابت یہ کرنا تھا کہ ہماری قوم کا نصف حصہ اس لائق صد احترام خاتون کے خیال کے برعکس جس نے نصف آبادی کو بیکار کہا تھا، بیکار نہیں۔ یہ پروپیگنڈا اور افسانہ ہی افسانہ ہے۔

''نوائے وقت'' لاہور۔ 3 نومبر 1981ء۔

[1] اس موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب کا ایک گراں قدر مقالہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے۔ (ص۔ی)

عورت اور سیاست؟

سیاست اور معاشرتی معاملات سوشل ورک میں عورتوں کا حصہ لینا بھی عورت کا اپنے دائرۂ عمل سے تجاوز ہی کی ذیل میں آتا ہے۔ اسی لیے اسلامی نقطۂ نظر سے یہ میدان بھی صرف مردوں کے لیے خاص ہے، عورتوں کا اس میدان میں آنا اور سیاست اور معاشرتی معاملات میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لینا ناپسندیدہ ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے ملک میں کئی سالوں سے اسمبلیوں میں خواتین کی نمائندگی کا مسئلہ سیاسی، دینی اور علمی حلقوں میں زیر بحث ہے۔ اس سلسلے میں اب تک مختلف آراء سامنے آ چکی ہیں۔

① ایک رائے تو وہ ہے جو 1973ء کے آئین میں عارضی طور پر اختیار کی گئی تھی جو پاکستان کی مخصوص نظریاتی اور واقعاتی حالات کی مظہر بتلائی جاتی ہے، یعنی پاکستان میں عورت چونکہ براہ راست انتخابات میں حصہ لینے کی پوزیشن میں نہیں ہے، اس لیے ممبران اسمبلی اپنے ووٹوں سے کچھ عورتوں کا انتخاب کر لیں تا کہ اسمبلیوں میں عورتوں کی نمائندگی ہو سکے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت اس کے لیے آئینی ترمیم کی خواہش مند رہی ہے تا کہ ایک تو ملک میں عورت کے بارے میں مغرب کا تصور عام ہو کیونکہ مغربیت کا فروغ اس پارٹی کے خمیر اور ضمیر میں شامل ہے۔ دوسرے، اسمبلیوں میں اس کی عددی قوت میں اضافہ ہو۔ ظاہر بات ہے کہ حکومت جن عورتوں کو بھی اسمبلیوں کی زینت بنانے کے لیے منتخب کرے گی، وہ حکومت کی ممنون احسان ہوں گی، اس لیے وہ ظالم اور بدعنوان حکومت کی تقویت کا باعث ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم لیگ ن نے اپنے دورِ حکومت میں اس معاملے میں

پیپلز پارٹی کے ہم نوا ہونے کے باوجود، آئین میں مذکورہ ترمیم کے لیے تعاون نہیں کیا۔

② ایک مرتبہ میاں محمد نواز شریف نے ایک نئی تجویز پیش کی تھی کہ پورے ملک میں عورتوں کے لیے چالیس حلقے قائم کر دیے جائیں اور ان حلقوں سے براہ راست عورتوں کے ووٹوں سے انھیں منتخب کیا جائے اور وہ عورتیں اسمبلیوں میں عورتوں کی نمائندگی کریں۔

③ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دنیا کے کسی ملک کے دستور میں عورتوں کے لیے الگ نشستیں نہیں ہیں، اس لیے پاکستان میں الگ نشستوں کی صورت اختیار نہ کی جائے بلکہ جس طرح دستور پاکستان میں عورتوں کو پہلے سے عام نشستوں پر انتخاب لڑنے کا حق حاصل ہے، وہی کافی ہے اور اس طریقے سے جتنی عورتیں منتخب ہو کر اسمبلیوں میں پہنچ جائیں، اسی پر کفایت کی جائے۔ ایک موقع پر نواب زادہ نصر اللہ خاں مرحوم نے بھی یہ تجویز پیش کی تھی۔

④ ایک چوتھی رائے بعض دینی حلقوں کی طرف سے یہ آئی ہے کہ خواتین کا انتخاب تو عام انتخابات کے ذریعے سے ہی بروئے کار لایا جائے لیکن اس کے لیے حسب ذیل باتوں کا اہتمام کیا جائے:

- اسمبلی کی رکنیت کے لیے عورت کی عمر کم از کم چالیس سال مقرر کر دی جائے۔
- اسمبلیوں میں عورتوں کے لیے متعین لباس اور الگ نشست گاہ کا اہتمام ہو۔
- الیکشن رولز کے تحت ہر سیاسی پارٹی کو پابند کر دیا جائے کہ وہ الیکشن کے لیے جاری کردہ ٹکٹوں کا 1/10 حصہ عورتوں کے لیے مخصوص کرے۔[1]

ہمارے نزدیک ان میں سے کوئی رائے بھی صحیح نہیں ہے۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی

---

[1] ماہنامہ "الشریعة" گوجرانوالہ، دسمبر 1993ء۔

نقص ضرور پایا جاتا ہے۔

اولاً: ان سب کی بنیاد مغربی تہذیب کے اس تصور پر ہے جس میں کسی بھی معاملے میں مرد اور عورت کے درمیان فرق کرنا جائز نہیں ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں عورت کو مرد کے دوش بدوش حصہ لینے کا حق حاصل ہے اور اسے حصہ لینا چاہیے اور مغرب اپنے مخصوص استعماری مقاصد کے لیے اس نظریۂ مساواتِ مرد وزن کو اسلامی ملکوں میں فروغ دے رہا ہے لیکن اسلام مغرب کے اس نظریے کو صحیح تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام مرد اور عورت کو زندگی کے دو پہیے تو ضرور مانتا ہے کہ جن کے بغیر انسانی زندگی کی گاڑی رواں دواں نہیں رہ سکتی لیکن وہ دونوں کا دائرۂ عمل ایک دوسرے سے مختلف تجویز کرتا ہے۔ اس کے نزدیک دونوں کی فطری صلاحیتیں بھی مختلف ہیں اور دونوں کا مقصد تخلیق بھی ایک دوسرے سے جدا، اس لیے وہ دونوں کو الگ الگ دائرے میں رکھ کر اپنے اپنے مفوضہ فرائض ادا کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ سیاست اور امور جہانبانی کا شعبہ بھی بعض اور شعبوں کی طرح ایک ایسا شعبہ ہے جسے اسلام نے صرف مرد ہی کے لیے خاص کیا ہے وہ عورت کا سیاست میں حصہ لینے کو قطعاً پسند نہیں کرتا جبکہ مذکورہ چاروں تجویزیں عورت کے سیاست میں حصہ لینے کے تصور پر مبنی ہیں۔

بنابریں یہ چاروں ہی تجویزیں اسلامی نقطۂ نظر سے غیر صحیح ہیں کیونکہ ان میں سے ہر تجویز میں اسلامی اصول وضوابط سے انحراف پایا جاتا ہے، ان اصول وضوابط کو پامال کیے بغیر کوئی بھی تجویز بروئے کار نہیں آ سکتی۔

ثانیاً: اسمبلیوں میں عورتوں کی نمائندگی کے لیے عورتوں کو اسمبلیوں کے لیے نامزد کرنا یا وہاں تک پہنچنے کے لیے انتخابات میں ان کے حصہ لینے کو ضروری سمجھنا بھی ہمارے لیے ناقابل فہم ہے۔ کیا ممبران اسمبلی پوری قوم کے نمائندے نہیں ہیں؟ ممبران اسمبلی قوم کے

ہر طبقے کے نمائندہ ہیں۔ وہ مزدوروں کے بھی نمائندہ ہیں، اہل صنعت و حرفت کے بھی نمائندہ ہیں، تاجروں اور خوانچہ فروشوں کے بھی نمائندہ ہیں، وہ ملازمت پیشہ اور اہل زراعت کے بھی نمائندہ ہیں۔ غرض وہ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد کے نمائندہ ہیں، سب کی فلاح و بہبود کے لیے قانون سازی اور اسباب و وسائل کی فراہمی ان کی ذمّے داری ہے۔ جب وہ ہر طبقے کی فلاح و بہبود کے ذمّے دار ہیں تو کیا عورتوں کے مسائل و مشکلات کے حل کے وہ ذمّے دار نہیں ہیں۔ بالخصوص جبکہ عورت ان کی ماں بھی ہے، ان کی بیٹی بھی ہے، ان کی بیوی اور ان کی بہن بھی ہے تو کیا وہ اتنے ہی ناخلف ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے مردوں کے مسائل پر تو وہ سوچ بچار کریں گے، ان کی فلاح و بہبود کے لیے منصوبہ سازی اور قانون سازی تو کریں گے لیکن اپنی ہی ماں، اپنی ہی بیوی، اپنی ہی بیٹی اور ہمشیرہ کے لیے وہ کچھ نہیں کریں گے؟ ان کے مسائل ومشکلات کو درخور اعتنا نہ سمجھیں گے۔ آخر یہ کیسے اور کیوں کر ممکن ہوسکتا ہے؟

اگر کہا جائے کہ عورتوں کا اسمبلیوں میں پہنچنا مشکل ہے تو ہم عرض کریں گے کہ دوسرے طبقات کا پہنچنا کون سا آسان ہے بلکہ دوسرے طبقات کا تو اسمبلیوں میں پہنچنا عورت کی نسبت بہت زیادہ مشکل ہے۔ مال دار اور جاگیر دار خاندانوں کی بیگمات تو پھر بھی آسانی سے انتخاب لڑ کر اسمبلیوں میں پہنچ سکتی ہیں جیسے ہر دفعہ کے انتخابات میں کچھ نہ کچھ عورتیں کامیاب ہو کر اسمبلیوں میں پہنچتی رہی ہیں اور اکتوبر 2002ء کے انتخابات میں کافی تعداد میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں خواتین پہنچی ہیں۔ علاوہ ازیں 1973ء کے آئین کے مطابق مشرف حکومت میں عورتوں کو منتخب نمائندگان کے ووٹوں سے متناسب نمائندگی کی بنیاد پر بھی منتخب کیا گیا ہے، جس کے بعد قومی اسمبلی ہی میں خواتین کی تعداد 75 ہو گئی تھی اور صوبائی اسمبلیوں میں بھی صورت حال یہی تھی۔ جبکہ مزدوروں،

ہاریوں، کاشت کاروں، بے روزگاروں، کاریگروں، ہنرمندوں، تعلیمی اداروں کے اساتذہ، ملازمت پیشہ افراد حتیٰ کہ متوسط خاندانوں کا بھی کوئی نمائندہ اسمبلیوں میں پہنچ سکا ہے یا آئندہ ان میں سے کسی کے پہنچنے کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اسی طرح اہل علم وفکر حضرات کا طبقہ ہے جس میں غیر سیاسی علماء، مختلف شعبہ ہائے زندگی کے ماہرین، اہل قلم اور دانش ور حضرات اور دیگر بہت سے ممتاز طبقات ہیں لیکن اسمبلیوں میں وہ نمائندگی سے محروم چلے آرہے ہیں اور آئندہ بھی ان کی محرومی کے ازالے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

عورتوں سے زیادہ کیا ان طبقات کی نمائندگی ضروری نہیں ہے۔ اگر عورتوں کی نمائندگی کے لیے خاص سہولتوں کا اہتمام ضروری ہے تو مذکورہ طبقات کے لیے بھی ان سہولتوں کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ یہ ایک امتیازی سلوک ہوگا جس کی نفی یہ سیکولر حضرات بڑے شدّ ومدّ سے کرتے ہیں حتی کہ یہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ مرد وعورت کے درمیان بعض فطری امتیازات کو بھی ختم کرنے کے لیے بے قرار ہیں۔

خواتین کی نمائندگی کے جواز کے لیے ایک دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ خلافت راشدہ میں متعدد دفعہ عورتوں سے متعلقہ امور بلکہ اجتماعی معاملات میں بھی عورتوں سے رائے لی گئی......اس لیے اجتماعی معاملات کے حوالے سے قومی سطح پر مشاورت اور رہنمائی کے نظام میں شرکت عورتوں کے لیے شرعاً ممنوع نہیں ہے۔[1]

ٹھیک ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مشاورت کے لیے اسمبلیوں کا ممبر بننا یا بنانا کیوں ضروری ہے؟ کیا اس کے بغیر حسب ضرورت خواتین سے مشورہ نہیں لیا جا سکتا؟ بلکہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جو خواتین اسمبلیوں کی ممبر بنیں گی یا بنائی جائیں گی ان کی اکثریت اس قبیل سے ہوگی کہ وہ ممبران اسمبلی کے ذوق جمال اور نگاہ ہوس کی تسکین کا سامان تو شاید ضرور

1 ماہنامہ ''الشریعۃ''، گوجرانوالہ دسمبر، 1993ء ص:42.

مہیا کر دیں لیکن خواتین کے حقیقی مسائل و مشکلات سے وہ آگاہ ہوں گی نہ ان کے ناخن تدبیر سے ان کے حل کی راہیں کھلیں گی۔ اس کے برعکس اگر چند عورتوں کو ممبر بنائے بغیر، ملک کی سمجھ دار، پڑھی لکھی گھریلو اور فکری و تعلیمی اداروں سے وابستہ خواتین سے مختلف سوال ناموں کی شکل میں رائے حاصل کی جائے تو زیادہ بہتر طریقے سے عورتوں سے مشاورت کا اہتمام ہوسکتا ہے۔ یہ خواتین کے ممبر بننے یا بنانے کے بھاری بھرکم اخراجات (جو کروڑوں میں ہیں) کے مقابلے میں ''ہینگ لگے نہ پھٹکڑی، رنگ چوکھا آئے'' کا مصداق بھی ہوگا۔

جیسا کہ اکتوبر 2002ء کے انتخابات میں جس طرح بڑی تعداد میں عورتوں کو قومی و صوبائی اسمبلیوں میں نمائندگی دی گئی ہے، اس کے سالانہ اخراجات کا تخمینہ 5 کروڑ 64 لاکھ روپے لگایا گیا ہے۔[1]

بہر حال جس نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے، اسمبلیوں میں خواتین کی نمائندگی کا مسئلہ ایک شوق فضول، سراسر اسراف اور مغرب زدگی کے شاخسانے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس مطالبے میں قطعاً کوئی معقولیت اور افادیت نہیں ہے، یہ غیر معقول بھی ہے اور قومی خزانے پر ایک ناروا بوجھ بھی اور سب سے بڑھ کر حکم قرآنی:

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾

''اور تم اپنے گھروں میں ٹک کر رہو۔''[2]

کے صریح خلاف بھی، اس لیے ہم دینی حلقوں اور دینی جماعتوں سے عرض کریں گے کہ وہ اس مسئلے میں معذرت خواہانہ انداز ترک کر کے زوردار انداز میں اس کے خلاف آواز اٹھائیں۔ اگر مرد عورتوں کے مسائل حل کرنے پر قادر نہیں ہیں تو اسمبلیوں میں نمائندگی

[1] روزنامہ ''جنگ'' لاہور۔ 28 نومبر 2002ء، ص 4 اور 13۔ [2] الأحزاب 33:33 .

کے عنوان سے پہنچنے والی خواتین کیا تیر مار لیں گی؟

چنانچہ دیکھ لیجیے، مشرف کی بنائی ہوئی اسمبلیاں اپنی پانچ سالہ مدت پوری کر کے ختم ہو چکی ہیں، ان قومی وصوبائی اسمبلیوں کی پانچ سالہ کارکردگی ملاحظہ کر کے پورے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ خواتین کو اسمبلیوں کی رونق بنانا سوائے الحاد اور مغرب زدگی کے کچھ نہیں ہے۔ ان مذکورہ پانچ سالوں میں نہ مردوں نے ملک وقوم کے لیے کچھ کیا اور نہ عورتوں نے۔ البتہ قومی خزانے سے ان ممبران نے تنخواہوں اور مراعات میں کروڑوں نہیں، اربوں روپے وصول کیے ہیں۔ فَإِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ.

ضلعی حکومتوں کے نئے نظام میں عورتوں کی نمائندگی

اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جنرل پرویز مشرف کی حکومت نے ضلعی حکومتوں کا جو نیا نظام متعارف کرایا ہے، اس میں بھی عورتوں کی 33 فیصد نمائندگی کا اہتمام اسلامی تعلیمات و اقدار کے بالکل خلاف ہے۔ اتنی تعداد میں عورتوں کی نمائندگی تو ان مغربی ملکوں میں بھی نہیں ہے جو نظریۂ مساوات مرد و زن کے قائل ہیں۔ پاکستان میں، جس کی بنیاد اسلام پر ہے، اس کا کیا جواز ہے؟

ایک اور شوق فضول اور مغرب زدگی کا شاخسانہ

اگست 1995ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے زیر اہتمام عالم اسلام کی خواتین پارلیمینٹرین کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی، جسے پہلی کانفرنس قرار دیا گیا اور اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ ہر سال یہ کانفرنس ہوا کرے گی، اس کا مستقل سیکرٹریٹ اسلام آباد میں قائم کیا جائے گا۔ اس کانفرنس پر بلا مبالغہ لاکھوں نہیں، کروڑوں روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔ اس کا ایک مقصد بے نظیر کی اپنی تشہیر اور اپنی شخصیت کو اجاگر کرنا تھا۔ دوسرا مقصد اسلامی ملکوں

میں مغربیت کا فروغ تھا۔ بالخصوص اس کا نظریۂ مساوات مرد و زن۔ کیونکہ عورت کی حکمرانی کے جواز میں بنیاد بھی مغرب کا یہی نظریہ ہے۔ ورنہ اسلام میں تو عورت کی حکمرانی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے اور جیسا کہ ہم نے گزشتہ صفحات میں عرض کیا ہے کہ عورتوں کا پارلیمنٹ کا ممبر ہونا، یا بلدیاتی سطح پر کونسلر ہونا یا کسی اور سیاسی و معاشرتی شعبے میں سرگرم ہونا اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا بلکہ اس میں اسلامی تعلیمات سے انحراف پایا جاتا ہے اور اسی لیے ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ عالم اسلام کی ان خواتین کا، جو حکم قرآنی سے بغاوت کرنے والی ہیں، اسلام آباد میں ہر سال میلہ لگانے کا بھی کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ ایک بے فائدہ عیاشی اور قومی وسائل کی بربادی ہے کیونکہ پاکستانی بے نظیروں سمیت یہ تمام خواتین ایسی ہیں کہ انھیں قطعاً عورتوں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ صرف اسلامی ملکوں میں مغرب کی حیا باختہ تہذیب پھیلانا چاہتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں ہے۔

مسلمان خواتین کے حل طلب ضروری مسائل کی ایک فہرست

اگر حکومتیں اور مغربیت کی علم بردار خواتین عورتوں کی خیر خواہ ہوتیں، انھیں عورتوں کی مشکلات کا احساس و شعور ہوتا اور یہ ان کے مسائل کے حل کرنے کا جذبہ اپنے اندر رکھتیں تو سب سے اہم ترین مسائل ان کے سامنے یہ ہوتے:

① ان کی طرف سے یہ مطالبہ ہونا چاہیے تھا کہ عورت کا جنسی استحصال ختم کیا جائے، اسے شوپیس یا سامان تجارت کے طور پر استعمال نہ کیا جائے۔ اسے ہر اشتہار کی زینت بنا کر سرِ بازار ذلیل و رسوا نہ کیا جائے۔ عورت کا وجود نہایت مقدس ہے، نازک آبگینہ ہے، صدف کی آغوش میں پرورش پانے والے موتی سے زیادہ قیمتی ہے۔ اسے جنس بازار بنایا جائے، نہ اسے اخباروں اور فلموں میں عریاں کر کے، عصمت فروشوں کی طرح مال و دولت کے

حصول کا ذریعہ بنایا جائے۔

② اسی طرح مطالبہ کیا جاتا کہ مخلوط تعلیم کا خاتمہ کیا جائے تاکہ عورت کے تقدس کے مجروح ہونے اور اس کی ردائے عصمت کے تار تار ہونے کے امکانات کم سے کم ہو جائیں جبکہ مخلوط تعلیم نے ان امکانات کو واقعات میں بدل رکھا ہے۔

③ عورت کے بارے میں اسلامی تعلیمات اور اس کے ساتھ حسن سلوک کے تاکیدی احکام کو ریڈیو، ٹی وی، اخبارات اور دیگر ذرائع سے عام کیا جائے تاکہ لوگ جہالت کی وجہ سے عورتوں پر جو ظلم کرتے ہیں، اس کا سد باب ہو اور عورت صحیح معنی میں گھر کی ملکہ کا اعزاز حاصل کر سکے جیسا کہ اسلام چاہتا ہے۔

④ خواتین یونیورسٹیاں قائم کی جائیں اور مخلوط تعلیم کا خاتمہ کیا جائے تاکہ مسلمان عورت، مردوں سے الگ رہ کر، ستر وحجاب کی پابندی کے ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے۔ کیا ان مغرب زدہ خواتین نے اس کا مطالبہ کیا یا اس پر کوئی سوچ بچار کی یا آئندہ ان سے کوئی توقع ہے؟

⑤ جس طرح ان کے تعلیمی ادارے الگ ہوں، اسی طرح ان کے لیے چند شعبے مخصوص کر دیے جائیں جن کی وہ تعلیم وتربیت بھی حاصل کریں اور وہاں وہ مردوں سے الگ رہ کر قومی خدمات بھی سر انجام دیں، مثلاً: تعلیم کا شعبہ ہے، طب کا شعبہ ہے، اسی طرح اور بہت سے شعبے ایسے ہو سکتے ہیں جہاں وہ ستر وحجاب کی پابندی کے ساتھ مفوضہ فرائض انجام دیں۔

⑥ جہیز کی لعنت کا خاتمہ اور شادی بیاہ کی فضول، بے ہودہ اور مسرفانہ رسومات کا سد باب کیا جائے جنھوں نے شادی جیسے اہم فریضے کو ایک عذاب بنا دیا ہے۔

⑦ چادر اور چار دیواری کا تحفظ کیا جائے اور فحاشی، بے حیائی اور بے پردگی کا خاتمہ

کیا جائے تا کہ عورت کی عزت بھی محفوظ رہے اور اس کا امن وسکون بھی برباد نہ ہو۔

⑧ عائلی عدالتوں کو زیادہ مؤثر اور فعال بنایا جائے تا کہ مظلوم اور ستم رسیدہ عورتیں عدالتوں سے فوری انصاف حاصل کر سکیں۔

⑨ فحاشی، بے حیائی اور بے پردگی کا خاتمہ کیا جائے تا کہ عورتوں کی عصمت دری کے بڑھتے ہوئے رجحان پر قابو پایا جا سکے۔

⑩ فضائی میزبان ایئر ہوسٹس عورتوں کی بجائے مردوں کو مقرر کیا جائے تا کہ اسلامی احکام کی بے حرمتی نہ ہو۔

⑪ اخبارات، ٹیلی ویژن اور کمرشل اشتہارات میں عورت کا استعمال ممنوع قرار دیا جائے کیونکہ اس میں اس کا استحصال بھی ہے اور اس کی بے حرمتی بھی۔

⑫ بیواؤں اور نادار عورتوں کی فلاح کے لیے زیادہ سے زیادہ امدادی مراکز اور ادارے قائم کیے جائیں تا کہ ایسی عورتیں آبرومندانہ طریقے سے اپنی حیات مستعار کے دن گزار سکیں۔

⑬ عورتوں کے لیے مردوں سے الگ نصاب تعلیم مرتب کیا جائے تا کہ وہ اپنے مقصد تخلیق اور فطری صلاحیتوں کے مطابق زیادہ بہتر طریقے سے ملک وقوم کی خدمت کر سکیں۔

یہ اور اس قسم کے اور بہت سے مسائل ہیں جو غور وفکر اور توجہ کے مستحق ہیں لیکن عورتوں کے نام پر تنظیمیں قائم کرنے اور ان کے بل بوتے پر اپنی لیڈری کی دکان چمکانے والی خواتین کو مذکورہ مسائل سے، جو پاکستانی مسلمان عورتوں کے حقیقی مسائل ہیں، کوئی دلچسپی نہیں۔ انھیں دلچسپی ہے تو صرف ایسے مسائل سے کہ جن کے ذریعے سے پاکستان کا اسلامی معاشرہ، مغرب کے اخلاق باختہ معاشرے میں بدل جائے اور مغرب کی تمام اخلاقی برائیاں یہاں عام ہو جائیں، چنانچہ آپ دیکھ لیجیے کہ خواتین کے حقوق کے نام پر سرگرم

خواتین کی کانفرنسوں، تقریروں اور مطالبات میں ایسی ہی چیزیں نمایاں ہیں جو مغربی معاشرے کے امتیازات ہیں۔ ہر شعبۂ زندگی میں مردوزن کی مساوات اور ایک دوسرے کے دوش بدوش چلنے کا تصور خالص مغربی ہے، جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں مگر ان نام نہاد لیڈر رانیوں کی زبان پر ہر وقت یہی نعرہ رہتا ہے۔ مغرب میں مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ لیڈر رانیاں چاہتی ہیں کہ پاکستان کے مردوں سے بھی یہ حق جو اسلام نے انھیں دیا ہے، سلب کر لیا جائے بلکہ اس کی جگہ یہ حق عورتوں کو تفویض کر دیا جائے۔ مغرب میں ایک سے زیادہ شادی ممنوع ہے، تاہم غیر قانونی داشتاؤں اور گرل فرینڈز کی عام اجازت ہے۔ پاکستانی لیڈر رانیاں بھی یہاں یک زوجی (ایک ہی بیوی) کے قانون پر اصرار کر کے بے حیائی کا وہی دروازہ کھول رہی ہیں جس سے مغرب کا لادین معاشرہ دوچار ہے۔ وعلی هذا القياس یہ لیڈر رانیاں مغرب کی ہر بات پر ایمان بالغیب رکھتی ہیں اور اسلامی تہذیب و تمدن سے سخت بیزار ہیں اور مغرب پرستی اور اسلام بیزاری کا رجحان وہ بڑی تیزی سے پاکستان کی نئی نسل میں بھی منتقل کر رہی ہیں۔

چنانچہ زیر بحث کانفرنس کا اعلامیہ بھی دیکھ لیجیے، اس میں کی گئی تقریروں کو ملاحظہ فرما لیجیے۔ آپ کو یہی چیزیں اور باتیں ملیں گی اور کانفرنس کے اختتام پر تو مغرب کی یہ بلی تھیلے سے بالکل باہر آگئی اور رقص و سرود کی محفل سے ان تمام خواتین کی ضیافت کی گئی جو ''حقوق نسواں'' کے نام پر اسلام آباد میں جمع کی گئی تھیں۔ اس مذموم حرکت سے بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ خواتین مسلمان عورت کو اس کے اسلامی حقوق دلوانے میں کوشاں ہیں یا وہ اسے مغرب کی عورت کی طرح سر بازار نچوا کر اس کی ذلت و رسوائی کے درپے ہیں۔

افسوس اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارے تمام وزراء، ارباب اختیار و اقتدار، افسران اعلیٰ اور اخبارات جدید چلتے ہوئے نعروں سے مرعوب اور شاہدِ مغرب کی عشوہ طرازیوں سے

مسحور ہیں۔ یہ بھی سب مغرب کے نقطۂ نظر ہی کو یہاں فروغ دے رہے ہیں۔ حکومت کی تمام پالیسیاں اسی فکر اور طرزِ عمل کی غماز ہیں اور اخبارات بھی ان نظریات کی بھرپور اشاعت کر رہے ہیں۔

یہ صورت حال اسلامی نقطۂ نظر سے سخت خطرناک ہے۔ حکومت، اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ کی پالیسیوں اور رویے سے ہمارے معاشرے میں مغربی رجحانات کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ اور اسلام کا تصور حیاء و عفت ختم ہو رہا ہے۔ ﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ﴾ (النسآء 4:34) (مرد عورتوں پر حاکم ہیں) کے برعکس صورت حال رونما ہو رہی ہے اور قرآن کا حکم ﴿ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى ﴾ (الأحزاب 33:33) (اے ازواج مطہرات! اپنے گھروں میں ٹکی رہو اور پہلی جاہلیت کی طرح اپنی زینت کا اظہار نہ کرو) زینت طاق نسیاں بنتا جا رہا ہے۔

مغربی نظریۂ مساوات مرد و زن کے مطابق مسلمان عورت کا مردوں کے دوش بدوش چلنے کی یہ روش، جسے مادی ترقی اور ملکی خوش حالی کی ضمانت سمجھا جا رہا ہے، معاشرے کے لیے سخت تباہ کن ہے۔ اس سے عائلی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار، اسلام سے بیزاری اور مغربی تہذیب و معاشرت کی برتری کا تصور عام ہو رہا ہے، نیز اسلام کو ایک فرسودہ اور موجودہ دور میں ناقابل عمل دین سمجھا جا رہا ہے۔ کیا ہمارے حکمران اور مالکان و مدیرانِ جرائد یہی کچھ چاہتے ہیں۔ اگر یہی ان کا مطلوب و مقصود ہے (اور ان کے طرزِ عمل کا لازمی و منطقی نتیجہ یہی ہے) تو پھر پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں کو سوچنا چاہیے کہ کیا وہ اس رو میں بہتے چلے جائیں گے یا اپنی نسل نو کو اس باغیانہ روش سے بچانے کی ہر ممکن سعی کریں گے؟

عورت اور اس کی سربراہی؟

عورت کی سربراہی کا مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جس سے مرد اور عورت کے درمیان امتیاز ہوتا ہے کیونکہ اسلام میں عورت کی سربراہی کا کوئی جواز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا واضح فرمان ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا ﴾

''مرد عورتوں پر حاکم ہیں، بوجہ اس کے جو اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی اور بوجہ اس کے جو وہ اپنے مال ان عورتوں پر خرچ کرتے ہیں۔''[1]

اس آیت مبارکہ میں اللہ نے مرد کی حاکمیت وقوامیت بیان فرمائی ہے اور ساتھ ہی اس کی دو وجہیں بیان کی ہیں، ان میں سے ایک وہبی ہے جو مردانہ قوت اور دماغی صلاحیت ہے جس میں مرد عورت سے پیدائشی طور پر ممتاز ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت بدلنے یا مٹانے پر قادر نہیں۔

دوسری وجہ کسبی ہے جس کا مکلّف شریعت نے مرد کو بنایا ہے کہ وہ عورت کو کما کر کھلائے کیونکہ عورت کو اس کی فطری کمزوری اور مخصوص تعلیمات کی وجہ سے، جو اسلام نے عورت کی عفت وحیا اور اس کے تقدس کے تحفظ کے لیے ضروری بتلائی ہیں، عورت کو معاشی جھمیلوں سے دور رکھا ہے۔ اسی طرح اللہ کا حکم ہے:

﴿ وَقَرْنَ فِىْ بُيُوْتِكُنَّ ﴾

1 النسآء 4:34.

''اپنے گھروں میں ٹک کر رہو۔''[1]

اور اللہ تعالیٰ کا حکم چونکہ فطری مقاصد اور شرعی حکمتوں پر مبنی ہے، اس لیے یہ عام ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں مرد حاکم و نگران ہے اور عورت اس کی محکوم اور تابع فرماں۔ علاوہ ازیں عورت کا دائرۂ عمل گھر کی چار دیواری ہے، بیرونی معاملات نہیں۔

جب واقعہ یہ ہے تو عورت ملک کی سربراہ کس طرح بن سکتی ہے۔ یہ تو قرآن کریم کی نص صریح کے خلاف ہے اور احادیث رسول سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ عورت کی سربراہی، تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہے، چنانچہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً»

''وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کر دیے۔''[2]

قرآن وسنت کے ان دلائل کی وجہ سے قرون اولیٰ سے لے کر آج تک کے تمام علمائے امت کا اس بات پر اجماع رہا ہے کہ اسلامی ملک کی سربراہ عورت نہیں ہو سکتی جس کی تصریح ہر دور کے علماء نے کی ہے۔ آئندہ صفحات میں ان ''دلائل'' کا پوسٹ مارٹم اور ان مغالطات وشبہات کا ازالہ ہے جو عورت کی سربراہی کے جواز کے ضمن میں پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ مضامین اس دَور کے ہیں جب بے نظیر بھٹو 1988ء میں پہلی مرتبہ وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئی تھیں، اس سے اسلامی ذہن اور اسلام کا صحیح شعور رکھنے والوں کو سخت صدمہ پہنچا تھا جب کہ سیکولر اور مغرب زدہ حضرات اس پر بڑے خوش ہوئے

---

1. الأحزاب 33:33. 2. صحيح البخاري، المغازي، باب كتاب النبي ﷺ إلىٰ كسرىٰ و قيصر، حديث: 4425، والفتن، باب: 18، حديث: 7099.

تھے، ایسے حضرات نے عورت کی سربراہی کے جواز میں تاریخ کو بھی مسخ کیا اور الٹے سیدھے دلائل بھی فراہم کرنے کی مذموم سعی کی۔ راقم الحروف نے اس دَور میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں ایک اداریہ بعنوان ''ہم شرمندہ ہیں'' تحریر کیا جس میں بے نظیر کے وزارت عظمیٰ پر فائز ہونے پر اپنے اسلامی جذبات کا اور اپنی کوتاہیوں پر شرمندگی کا اظہار کیا۔ (یہ اداریہ اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں) علاوہ ازیں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کی اور پیش کردہ مغالطات وشبہات کا ازالہ کیا۔ آئندہ صفحات میں یہ مباحث بھی شامل کتاب ہیں۔ یہ فتنہ بے نظیر کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اگرچہ بظاہر ختم ہو گیا ہے لیکن سیاست میں اب بھی بہت سی خواتین سرگرم ہیں اور آئندہ بھی اس فتنے کے وقوع کا شدید خطرہ ہے، اس لیے ان مباحث کی اہمیت وافادیت مستقل ہے، ان کی ضرورت اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

ایک عورت کے سربراہ بننے پر اسلامیانِ پاکستان کے جذبات کا اظہار

ہم شرمندہ ہیں

1988ء کے انتخابات کے نتیجے میں ایک ایسے ملک کی سربراہ ایک عورت بن گئی ہے، جو اسلام کے نام پر قائم کیا گیا تھا اور جو اسلام کا قلعہ باور کرایا جاتا تھا لیکن اسی ملک میں اسلام کا ایک مُسلّمہ اصول نہایت بے دردی سے پامال کر دیا گیا ہے۔ اس کے اسباب پر ہم تفصیلی گفتگو اگرچہ کر چکے ہیں، تاہم اس کے باوجود ہم عالم اسلام کے سامنے شرمندہ ہیں کہ ہم پاکستان کا وہ امیج قائم نہیں رکھ سکے جو اس کے مقصدِ قیام سے وابستہ تھا اور اس کی وہ امتیازی حیثیت نہیں بچا سکے جو گزشتہ گیارہ سالوں میں (ضیاء الحق کے دور میں) بالخصوص نمایاں کی جاتی رہی تھی۔

- ہم اپنے ان عوام کے سامنے بھی شرمندہ ہیں جو اسلام سے والہانہ لگاؤ اور اس کی ابدی تعلیمات کی صداقت پر آج بھی پختہ یقین رکھتے ہیں کہ ہماری باہمی سر پھٹول سے ان کے اسلامی جذبات بجا طور پر مجروح ہوئے ہیں، ان کے آبگینہ ہائے دل پارہ پارہ ہوئے ہیں اور ان کے اعتماد کو سخت ٹھیس پہنچی ہے۔
- ان ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے سامنے ہم شرمندہ ہیں جن کو ہم نے بجا طور پر باور کرایا تھا کہ عورت کا دائرۂ عمل گھر کے اندر ہے۔ بیرونی سرگرمیاں اس کی عزت، وقار اور احترام کے منافی ہیں، وہ چراغ خانہ ہے شمع انجمن نہیں۔ اس کی حیثیت ایک ماں کی ہے، ایک بیٹی کی ہے، ایک بہن کی ہے اور ایک بیوی کی ہے۔ لیکن اب اس کی ایک پانچویں

حیثیت بھی تسلیم کر لی گئی ہے جو اسلام نے تسلیم نہیں کی۔ چراغ خانہ سے بڑھ کر اب وہ شمع محفل ہی نہیں، شمعِ جمہوریت اور شمعِ مملکت بھی ہے۔

■ ہم شرمندہ ہیں اس طعنے پر بھی کہ قرآن وحدیث کے کئی شیدائیوں نے بھی بہت سی جگہ ایک عورت کی پارٹی ہی کو ووٹ دے کر عورت کی سربراہی کا راستہ ہموار کیا ہے۔ یوں بیگانوں ہی نے اسلام کے جگر پر تیر نہیں چلائے، یہ کارنامہ اپنوں نے بھی سرانجام دیا ہے ع

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن آنچہ کرد آں آشنا کرد

■ ہم شرمندہ ہیں بعض ان مذہبی بہروپیوں کے کردار پر بھی جنھوں نے ایک عورت کو اس کی وزارتِ عظمیٰ پر مبارک باد کے پیغامات ارسال کر کے اسلامی غیرت وحمیت کو نیلام کر دیا ہے۔

ہم شرمندہ ہیں سُنّی عوام کی اس بھیڑ چال پر بھی کہ انھوں نے اپنے ووٹوں سے ایک ایسے اقلیتی فرقے کی ایک بہت بڑی تعداد کو قومی وصوبائی اسمبلیوں میں پہنچا دیا ہے جس کا کردار ملت کے حق میں ہمیشہ مشکوک بلکہ سخت خطرناک رہا ہے۔

■ ہم شرمندہ ہیں اس فریب خوردگی پر بھی جو ''جمہوریت'' کے نام پر ہم مسلسل کھا رہے ہیں اور اس دفعہ بھی کھایا جس کی وجہ سے ایک اقلیت اکثریت پر حکمرانی کرتی رہی ہے اور اب پھر ایک محدود اقلیت اکثریت پر مسلط ہوگئی۔ ''جمہوریت'' کی یہ سب سے بڑی کمزوری اور خامی بھی ہمیں خوبی اور بھلائی نظر آتی ہے۔

ع کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

■ ہم شرمندہ ہیں اس بات پر بھی کہ جو'' جمہوریت'' ہمارے ملک کے لیے بالعموم اور

ہمارے مذہب کے لیے بالخصوص سخت تباہ کن چیز ہے، اسے ہم نے اپنے مسائل کا ''واحد حل'' سمجھا ہوا ہے۔ گویا درد کو درماں، دُکھ کو علاج اور زہر قاتل کو آبِ حیات سمجھ لیا ہے۔

یہ کیا غضب ہے جفا جُو کو باوفا جانو
شفا مرض کو کہو درد کو دوا جانو

سب سے بڑھ کر ہم اپنے اللہ کے سامنے شرمندہ ہیں کہ ہماری کوتاہیوں، حماقتوں اور باہمی بغض و عناد کی وجہ سے اس کے بیان کردہ اُصول ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ ''عورتیں گھروں کے اندر ٹک کر رہیں۔''[1] کی خلاف ورزی کا ارتکاب انفرادی طور پر کرتے کرتے، اجتماعی طور پر بھی ہم نے کرلیا ہے۔ اس لیے اندیشہ ہے کہ ملت کا یہ گناہ کہیں فطرت کی نظر میں ناقابلِ معافی نہ ہو۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کرلیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

بلاشبہ ہم خدا و خلقِ خدا دونوں کے سامنے شرمسار ہیں اور طلب گارِ معافی بھی، نیز ہم بارگاہِ الٰہی میں دعا گو بھی ہیں کہ وہ ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنی شرمساری کو جلد از جلد دور کر کے سرخروئی کا کوئی سامان عنداللہ و عندالناس کرسکیں۔ وَيَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ آمِينًا .

(اداریہ ''الاعتصام'' 16 دسمبر 1988ء)

---

[1] الأحزاب 33:33 .

سیاست میں عورت کا کردار

شبہات و مغالطات کا جائزہ

حدیث لَنْ یُّفْلِحَ قَوْمٌ..... پر اعتراض؟

مذکورہ بالا فرمان سندًا بالکل صحیح ہے، اس کی صحت میں اہل علم کے درمیان قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بجز اس شر ذمہ قلیلہ (چھوٹے سے گروہ) کے جو سرے سے حجیت حدیث ہی کا قائل نہیں ہے۔ اس فرمان رسول ﷺ کی بنا پر آج تک امت مسلمہ نے اپنا حکمران کسی عورت کو بنانا پسند نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی چودہ صد سالہ تاریخ میں چاند بی بی، رضیہ سلطانہ اور بھوپال کی حکمران چند بیگمات کے علاوہ مسلمان عورتوں کی حکمرانی کی مثالیں ناپید ہیں اور یہ چند مثالیں اس لیے قابل نمونہ نہیں کہ ان کو حکمران بنانے میں عوام کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ سب اسی ملوکانہ طرز عمل کے نتیجے میں وارث تخت بنی تھیں جس ملوکیت کو آج کل کے سارے سیاسی دانشور رد کر چکے ہیں۔

بعض لوگ اسے رد کرنے کے لیے صحابیٔ رسول حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ تک کو مطعون کرنے کی اور بعض لوگ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے بعد کے راویوں پر جرح کر کے صحیح بخاری کی عظمت و اہمیت کو گھٹانے کی مذموم سعی کرتے ہیں، حالانکہ یہ دونوں باتیں اہل سنت کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہیں۔

اہل سنت کا ایک مسلمہ اصول یہ ہے کہ (اَلصَّحَابَةُ کُلُّهُمْ عُدُولٌ) ''تمام صحابہ عادل ہیں'' جس کا مطلب یہ ہے کہ جس روایت کا سلسلۂ سند صحابی تک بالکل صحیح ہو تو وہ

روایت صحیح ہے اور صحابی کے بارے میں سرے سے کوئی تحقیق ہی نہیں کی جائے گی کیونکہ تمام صحابہ عادل ہیں، یعنی حدیث رسول بیان کرنے میں کسی بھی صحابی سے کذب اور تلبیس کا امکان نہیں ہے، اس لیے جو لوگ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی کردار کشی کر رہے ہیں، وہ اس مسلمہ اصول کے خلاف ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں۔

اسی طرح حدیث کے دوسرے راویوں پر جرح کر کے روایت کو مخدوش قرار دینے کا مطلب صحیح بخاری کی اصحیت کو مجروح کرنا ہے، حالانکہ صحیح بخاری کے بارے میں بھی امت مسلمہ کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ یہ کتاب اللہ کے بعد حدیث رسول کا صحیح ترین مجموعہ ہے اور اس کی کسی روایت کی تضعیف و تردید اس مسلمہ قاعدے کے منافی ہے، اسی لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بجا طور پر فرمایا ہے:

«أَمَّا الصَّحِيحَانِ فَقَدِ اتَّفَقَ الْمُحَدِّثُونَ عَلٰى أَنَّ جَمِيعَ مَا فِيهِمَا مِنَ الْمُتَّصِلِ الْمَرْفُوعِ صَحِيحٌ بِالْقَطْعِ، وَأَنَّهُمَا مُتَوَاتِرَانِ إِلٰى مُصَنِّفَيْهِمَا وَإِنَّهُ كُلُّ مَنْ يُّهَوِّنُ أَمْرَهُمَا فَهُوَ مُبْتَدِعٌ مُتَّبِعٌ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ»

"صحیح بخاری و صحیح مسلم کے بارے میں محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ان کی تمام متصل اور مرفوع روایات قطعی طور پر صحیح ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اپنے مصنفین تک متواتر ہیں اور ہر وہ شخص جو ان دونوں کتابوں کی اہمیت گھٹاتا ہے، وہ بدعتی اور مومنین کے راستے کو چھوڑ کر کسی اور راستے کا پیروکار ہے۔"[1]

جنگ جمل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کردار سے استدلال

ایک دلیل اس حدیث کو رد کرنے کے لیے یہ پیش کی جاتی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

1 حجة الله البالغة: 134/1 مطبعة منيرية، مصر.

نے جنگ جمل میں ایک لشکر کی قیادت کی تھی اور جو لوگ سیاسی لحاظ سے ان کے خلاف تھے، انھوں نے عورت کی سربراہی کے حوالے سے مذکورہ حدیث کا ذکر کیا۔ غالباً ان حضرات کی اس بات کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مخالف گروپ نے اس حدیث کے حوالے سے عورت کی سربراہی کو غلط قرار دینے کی کوشش کی جسے دوسرے گروپ نے صحیح نہیں سمجھا، گویا ان کے نزدیک یہ حدیث اپنی سند کے اعتبار سے اسقام سے خالی نہیں تھی۔

اگر یہی مفہوم ہے تو یہ یقیناً غلط اور واقعات کے خلاف ہے۔ اول تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مخالف گروپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہ حدیث پیش ہی نہیں کی گئی بلکہ یہ روایت حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کے شروع کے الفاظ یہ ہیں کہ ''مجھے جنگ جمل کے موقعے پر اس حدیث کے ذریعے سے اللہ نے بڑا فائدہ پہنچایا۔''

وہ فائدہ یہی تھا کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ خونِ عثمان کے مطالبۂ قصاص میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہمنوا تھے جس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ ان کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی معیت میں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا پڑتا۔ لیکن حدیث وہاں زیر بحث آئی نہ مخالف گروپ نے دوسرے گروپ کی قوت کو توڑنے کے لیے اس کا حوالہ دیا بلکہ ازخود حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کے گروپ کے آدمی تھے اپنے طور پر حدیث کا جو اقتضا تھا، اس پر عمل کیا، یعنی انھوں نے جنگ میں شریک ہونے سے گریز کیا، اس لیے اس دعوے میں کوئی حقیقت نہیں کہ اہل علم کے ایک حلقے نے اس حدیث کو اسقام سے خالی نہیں سمجھا۔

بعض لوگ اس مقام پر یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا جنگ جمل میں حصہ لینے سے بھی تو عورتوں کے لیے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا جواز نکلتا ہے لیکن ایسے تمام حضرات کے علم میں یہ بات آنی چاہیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ساری عمر اپنے اس

اقدام پر نادم رہی ہیں بلکہ یہاں تک آتا ہے کہ جب وہ قرآن حکیم کی تلاوت کرتے کرتے اس آیت:

﴿ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ ﴾

''عورتیں گھروں کے اندر ٹک کر رہیں۔''[1]

پر پہنچتیں تو زار و قطار روتیں کہ مجھ سے جنگ جمل کے موقعے پر اس آیت کی خلاف ورزی ہوگئی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ اقدام ایک ہنگامی نوعیت کا اور ایک محدود قسم کا تھا اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں خلافت کی امیدوار بھی نہیں تھیں، اس لیے ایک تو عام نارمل حالات کے لیے اس سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔ دوسرے، عورت کی سربراہی کا مسئلہ اس سے کشید کرنے کا جواز بھی نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے خود بھی مذکورہ حدیث کی بنیاد پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ساتھ دینے سے تأمل کیا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی صراحت گزر چکی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے تعاون کی درخواست کی تو انھوں نے جواب دیا: آپ بلاشبہ ماں ہیں، آپ کا حق بھی بہت عظیم ہے لیکن میں آپ کا ساتھ دینے میں اس لیے معذور ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہیں ہوگی جس نے اپنے معاملات عورت کے سپرد کر دیے۔[2]

چوتھی بات یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے واضح اور غیر مبہم احکامات و نصوص کے مقابلے میں کسی کا قول یا عمل حجت نہیں ہے، اس لیے کسی بھی شخصیت کے قول و عمل سے استدلال صحیح نہیں۔

---

1 الأحزاب 33:33 . 2 فتح الباري : 56/13 .

قرآن کریم میں ملکہ بلقیس کے ذکر سے استدلال

قرآن کریم میں ملکہ بلقیس کے ذکر سے بھی استدلال کیا گیا ہے کہ قرآن نے ملکہ بلقیس کی حکمرانی کے تذکرے میں کوئی اشارہ نہیں دیا جس سے اس ملکہ کے کردار کے بارے میں نکیر کا رنگ جھلکتا ہو، اس لیے اس واقعے سے بھی عورت کی حکمرانی کا جواز بلکہ تائید و تحسین کا پہلو نکلتا ہے۔

لیکن ہم عرض کریں گے کہ قرآن کریم میں کئی واقعات وقصص تاریخی طور پر اس انداز سے بیان کیے گیے ہیں کہ ان پر کسی قسم کی نکیر نہیں کی گئی ہے کیونکہ ان کا مقصود صرف بیان واقعہ ہے، اس کی تحسین یا تردید نہیں ہے، اس لیے قرآن و حدیث کی واضح نصوص کے مقابلے میں اس قسم کے واقعات سے استدلال اگر اپنے اندر جواز کا کوئی پہلو رکھتا ہے تو پھر تو اور بھی بہت کچھ ماننا پڑے گا۔ ہم یہاں اپنے نقطۂ نظر کی توضیح میں احباب کی توجہ صرف ایک اور واقعے کی طرف مبذول کرائیں گے اور وہ ہے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ۔ اس واقعے میں دیکھیے کہ زلیخا کے عزیز مصر خاوند نے اپنی بیوی کے مکر کو، جو اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے پھسلانے کے لیے اختیار کیا تھا، دیکھ کر عورتوں کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا:

﴿ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ۝ ﴾

''بے شک تمھارا (عورتوں کا) مکر بڑا عظیم ہے۔''[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں بڑی مکار ہیں۔ قرآن کریم نے بغیر کسی ادنیٰ نکیر کے عزیز مصر کا یہ مقولہ نقل کیا ہے، کیا اس استدلال کی رو سے یہاں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بلا استثنیٰ تمام عورتیں بڑی مکار ہوتی ہیں؟ کیونکہ قرآن کریم میں یہ قول بغیر کسی نکیر کے نقل کیا گیا ہے۔

1 یوسف 28:12 .

اب اور آگے چلیے۔ جب زلیخا کا یہ واقعہ مصر کی عورتوں میں مشہور ہوا تو اس نے زنانِ مصر کو جمع کر کے حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کا مشاہدہ کرایا اور عورتیں فی الواقع حضرت یوسف کے حسن و جمال میں اتنی وارفتہ ہوئیں کہ انھیں اپنا ہوش و حواس بھی نہ رہا اور چھریاں اپنے ہاتھوں پر پھیر لیں۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کو بھی بغیر کسی نکیر کے نقل کیا ہے۔ کیا اس سے یہ استدلال صحیح ہوگا کہ اس طریقے سے عورتوں کو مردوں کے حسن و جمال کے مشاہدے کی اجازت ہے کیونکہ قرآن نے عزیز مصر کی بیوی زلیخا اور زنانِ مصر کا یہ واقعہ بغیر کسی نکیر کے نقل کیا ہے۔

اور آگے چلیے کہ زلیخا نے زنانِ مصر سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہے وہ شخص جس کی بارگاہ حسن میں میں نقد دل ہار بیٹھی ہوں۔ کیا اب بھی تم مجھے ملامت کرو گی؟ قرآن نے بغیر کسی نکیر کے یہ قول بھی نقل کیا ہے۔ کیا اس سے یہ استدلال کرنا جائز ہوگا کہ اگر کوئی منکوحہ عورت کسی حسین مرد کے عشق کے جال میں پھنس جائے تو اس کے لیے اپنے اس فعل ناروا کے جواز و اثبات کے لیے اس کے حسن و جمال کا چرچا اور دیدارِ یار کا اہتمام کرنا صحیح ہے تاکہ اس کی مجبوری کو جان کر اسے معذور گردانا جائے۔

ذرا سوچیے! اس قسم کے سطحی استدلالات سے قرآن کریم کے محکم نصوص کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے، پھر یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ قرآن کریم نے ملکۂ سبا کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ جس سے اس کی تحسین اور دانش مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس واقعے کا آغاز ہی ہدہد کی زبانی اس تعجب انگیز خبر سے کیا گیا ہے:

﴿ إِنِّي وَجَدتُّ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ○ وَجَدتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِن دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ○ ﴾

''ایک عورت وہاں حکمران ہے جسے ہر چیز عطا کی گئی ہے اور اس کے لیے بڑا تخت ہے، وہ عورت اور اس کی قوم اللہ کو چھوڑ کر سورج کی پوجا کرتی ہے اور شیطان نے ان کے عملوں کو ان کے لیے مزین کر دیا ہے اور اس نے ان کو راہ راست سے روک دیا ہے، پس وہ راہ یاب نہیں ہوتے۔''[1]

کیا اس صراحت سے یہ واضح نہیں ہے کہ ایک عورت کو حکمرانی کرتے ہوئے دیکھ کر ایک جانور تک نے حیرت و تعجب کا اظہار کیا اور اسی طرح اس کی سورج پرستی کو نشانۂ تنقید بنایا اور پھر اسے راہ راست سے بھٹکا ہوا اور شیطان کے دام فریب میں پھنسا ہوا قرار دیا ہے۔

پھر قرآن کریم میں بیان کردہ یہ پہلو کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو یہ لکھا:

﴿ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝ ﴾

''میرے خلاف سرکشی کا راستہ اختیار مت کرو اور فرمانبردار بن کر میری خدمت میں حاضر ہو جاؤ!''[2]

تو ملکۂ سبا نے گھٹنے ٹیک دیے اور کوئی مزاحمت نہیں کی۔ کیا یہ واقعہ عورت کی حکمرانی کی کمزوری کی نشاندہی نہیں کرتا۔ اگر بادشاہ کوئی مرد ہوتا تو کیا وہ اتنی آسانی سے بغیر کسی مزاحمت کے گھٹنے ٹیکنے کے لیے تیار ہو جاتا؟

اور سب سے بڑھ کر قرآن ملکۂ سبا کے مشرکہ اور کافرہ ہونے کی صراحت کرتا ہے۔ کیا اب اہل اسلام اتنے ہی بے بضاعت ہو گئے ہیں کہ ایک کافرہ و مشرکہ عورت کا کردار وعمل ہی ان کے لیے قابل تقلید نمونہ رہ گیا ہے۔ اس مقام پر تو افلاس علم پر ماتم کرنے کے ساتھ ساتھ، نگاہ کی نامسلمانی سے بھی فریاد کرنے کو جی چاہتا ہے۔

---

1 النمل 27:24,23 . 2 النمل 27:31 .

بہرحال ملکۂ سبا کے قرآن کریم میں ذکر کرنے سے عورت کی سربراہی کا جواز ایسا ہی ہے جیسے کوئی قصۂ یوسف کے ضمن میں بیان کردہ مذکورہ باتوں کو سند جواز عطا فرما دے۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

قرآن کریم سے ملوکیت کا جواز ہی نہیں، استحسان ثابت ہے

علاوہ ازیں اس تجدد پسند طبقے کا قرآن کریم سے تعلق و شغف کا حال تو یہ ہے کہ قرآن کریم میں ''ملوکیت'' کا جس انداز سے ذکر آیا ہے اس سے یقیناً ملوکیت (بادشاہی نظام) کا جواز ہی نہیں نکلتا، تحسین و تائید کا رنگ صاف جھلکتا ہے لیکن یہ طبقہ ملوکیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، جیسے طالوت کی بادشاہی کا ذکر ہے۔ قرآن کریم میں حضرت طالوت کی بادشاہت کی تحسین ہی نہیں ملتی بلکہ قرآن سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ بطور بادشاہ ان کا انتخاب بھی اللہ تبارک و تعالیٰ ہی نے فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ﴾

''اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمھارے اوپر (بادشاہی کرنے کے لیے) پسند فرمایا ہے اور اس کو علم و جسم میں فراخی عطا فرمائی ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنی بادشاہی نصیب فرماتا ہے۔''[1]

بلکہ آیت کے آغاز میں فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔''[2]

حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ ساتھ بادشاہت سے بھی

[1] البقرة 247:2۔ [2] البقرة 247:2۔

سرفراز فرمایا تھا اور پھر ان کی حسب خواہش یہ بادشاہت بھی ایسی زبردست اور بے مثال تھی کہ قیامت تک ایسی بادشاہت کسی کو نصیب نہیں ہوگی کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی:

﴿رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنۢبَغِي لِأَحَدٍ مِّنۢ بَعْدِي﴾

''اے اللہ! مجھے ایسی بادشاہی عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لائق نہ ہو۔''[1]

جسے اللہ تبارک و تعالیٰ نے شرف قبولیت سے نوازا۔ اب ایسا جلیل القدر بادشاہ کہ جس کی حکمرانی جن وانس کے علاوہ وحوش وطیور اور ہوا پر بھی ہو، قیامت تک نہیں ہوگا۔

کیا نبیوں تک کو بادشاہی دے کر اللہ تعالیٰ نے یہ واضح نہیں فرما دیا ہے کہ بادشاہی نظام فی نفسہٖ مذموم نہیں ہے بلکہ محمود و مستحسن ہے جس چیز کو اللہ نے اپنے نبیوں کے لیے پسند فرمایا ہو، اس کے استحسان و جواز میں شک کرنا بھی ایمان کے منافی ہے۔ اس کے برعکس جمہوریت کی بابت قرآن کریم سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نظام اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اکثریت کے پیچھے چلنے سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ اکثریت ہمیشہ گمراہوں ہی کی ہوتی ہے۔ بنا بریں اکثریت کے پیچھے چلنے والے بھی گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ﴾

''اے پیغمبر! اگر آپ اہل زمین کی اکثریت کے پیچھے چلیں گے تو وہ آپ کو بھی اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔''[2]

اور ''جمہوریت'' نام ہی عوام کی اکثریت کا ہے تو قرآن کریم کی رو سے ''جمہوریت'' کیونکر ایک صحیح نظام حکومت ہوسکتا ہے؟

---

1 صٓ 35:38 ۔ 2 الأنعام 116:6 ۔

قرآن کریم میں عورت کی سربراہی کے عدم جواز کے دلائل

بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ''قرآن ہی سے دوسرے بہت سے دلائل بھی دیے جاتے ہیں جو عورت کی سربراہی کے بارے میں پائے جانے والے شکوک کی سنگینی کم کرتے ہیں یا انھیں بالکل رفع کر دیتے ہیں۔''

مگر افسوس ہے کہ مذکورہ لوگ وہ دلائل ذکر نہیں فرماتے، کاش وہ ان کی صراحت بھی فرما دیتے کیونکہ ہم تو اب تک قرآنی دلائل ہی کی رو سے عورت کی سربراہی کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔ قرآن ہی نے امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو ہدایت دیتے ہوئے ایک ہدایت یہ دی ہے کہ ''تم اپنے گھروں میں ٹک کر رہو'' ظاہر بات ہے کہ گھر کے اندر رہتے ہوئے جہانبانی کے فرائض ادا نہیں کیے جا سکتے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ سربراہی و قیادت کی ذمے داریوں سے عورت کو اس کی فطری صلاحیتوں، صنفی مجبوریوں اور مقصد تخلیق کے اعتبار سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے اور اس میں قطعاً عورت کی اہانت نہیں ہے جیسا کہ باور کرایا جاتا ہے بلکہ مرد و عورت کی الگ الگ صلاحیتوں کے اعتبار سے ان کا دائرۂ کار بھی الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف رکھا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴾

''مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ بسبب اس کے جو فضیلت دی اللہ نے بعض کو بعض پر اور بسبب اس کے جو مرد اپنے مالوں میں سے خرچ کرتے ہیں۔''[1]

قوام کے معنی حاکم، نگران وغیرہ کے ہیں اور اس کی جو دو وجہیں آگے بیان کی گئی ہیں کہ ایک تو مرد کو عورت کے مقابلے میں جسمانی قوت و توانائی زیادہ عطا کی گئی ہے اور

[1] النسآء 4:34 .

دوسرے، مرد عورت کے نان و نفقہ کا ذمے دار اور کفیل ہے، یہ دونوں وجہیں قوام کے اس مفہوم کو واضح کر دیتی ہیں اور ان کی موجودگی میں اس کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں لیا جا سکتا۔ جب قرآن کریم کی رو سے عورت گھر کی نہایت مختصر اور محدود زندگی میں مرد کے مقابلے میں سربراہ نہیں بن سکتی تو اس قرآن کریم کی رو سے ایک ملک کی سربراہ کیسے بن سکتی ہے؟

فارس کی حکمران عورت کا نام بوران دخت بنت کسریٰ ہے

بعض لوگ مذکورہ حدیث کی صحت میں تشکیک پیدا کرنے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ جو یہ کہا جاتا ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے فارس کی ایک حکمران عورت کی بابت یہ ارشاد فرمایا ہے، یہ غلط ہے۔ فارس (ایران) میں تو سرے سے نبی ﷺ کے دور میں کوئی عورت حکمران ہی نہیں بنی۔

لیکن یہ دعویٰ یکسر غلط ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ عہد نبوی میں فارس میں عورت حکمران بنی ہے، چنانچہ تاریخ طبری میں اس کا نام بوران بنت کسریٰ پرویز بن ہرمز بتلایا گیا ہے۔[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اس کا نام بوران ہی بتلایا ہے۔[2]

تاہم اسے بنت شیرویہ بن کسریٰ بن پرویز لکھا ہے۔ جبکہ طبری نے اسے بنت کسریٰ بتلایا ہے اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بوران شیرویہ کی لڑکی نہیں، بہن بنتی ہے۔ فارسی اور اردو تاریخ دان کسریٰ کا نام بالعموم خسرو پرویز لکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ بوران کو خسرو پرویز کی دختر لکھتے ہیں، چنانچہ مجلس ترقی ادب لاہور کے زیر اہتمام مطبوعہ تاریخ ایران میں اس حکمران عورت کا ذکر بایں الفاظ مرقوم ہے:

''اس کے بعد خسرو پرویز کی بیٹی بوران دخت تخت نشین ہوئی۔ ثعالبی لکھتے ہیں

1 تاريخ الطبري:231/2 ، طبع دارالمعارف مصر . 2 فتح الباري: 128/8 و 56/13 .

کہ رسول اللہ ﷺ کو بوران دخت کے تخت نشین ہونے کی خبر ملی تو فرمایا: ''وہ قوم جو ایک عورت کو حکومت کی عنان سونپتی ہے، وہ کبھی آسائش نہیں دیکھ سکتی۔'' وہ چھ ماہ ہی حکومت کر پائی تھی کہ بیمار ہوگئی اور بیماری سے جانبر نہ ہوسکی۔''[1]

علاوہ ازیں اس تاریخ ایران میں اسے 630 عیسوی کے بعد کا واقعہ قرار دیا گیا ہے جبکہ نبی ﷺ کی بعثت 610 عیسوی میں ہوئی ہے۔ خلعت نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد آپ کے تیرہ سال مکے میں گزرے اور اس کے بعد ہجرت فرمائی، اس اعتبار سے یہ واقعۂ فارس، جس میں عورت کو حکمرانی ملی، گویا 7 ہجری کے بعد رونما ہوا ہے کیونکہ ہجرت کا ساتواں سال 630 عیسوی میں پڑتا ہے۔ اس کی تائید اسلامی مصنفین کی صراحتوں سے بھی ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ عورت کی حکمرانی کا یہ واقعہ اس بددعا کے بعد رونما ہوا ہے جب کسریٰ نے رسول اللہ ﷺ کا وہ مکتوب پھاڑ دیا تھا جو آپ نے دعوت اسلام قبول کرنے کے لیے اس کو لکھا تھا تو آپ نے اس کے حق میں بددعا فرمائی کہ اس کی حکومت بھی اسی طرح پارہ پارہ ہو جائے۔[2]

اس ارسال دعوت و مکتوب کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ 7 ہجری کے اوائل کا واقعہ ہے اور امام ابن سعد رحمہ اللہ نے بھی اس سن کو یقین کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔

اس کے فوراً بعد ہی کسریٰ خسرو پرویز کو اس کے اپنے بیٹے شیرویہ نے قتل کر دیا۔ یہ شیرویہ قباد دوم کے نام سے تخت طاؤس پر فروکش ہوا۔ اس ظالم نے صرف اپنے باپ ہی کو نہیں مارا بلکہ اپنے سولہ بھائیوں کو بھی اس اندیشے کے پیش نظر موت کے گھاٹ اتار دیا کہ مبادا کوئی اس کی حکومت چھیننے کے لیے کھڑا ہو جائے۔

---

1 تاریخ ایران، مؤلفہ پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی: 525/1 . 2 صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب دعوة اليهود والنصارىٰ......، حديث: 2939 .

بالآخر چھ مہینے کے بعد ایک وبائی مرض پلیگ کا شکار ہو کر اپنے باپ اور بھائیوں کا یہ قاتل حکمران بھی لقمۂ اجل بن گیا۔ جس کے بعد اس کی بہن بوران دخت بنت کسریٰ تخت فارس کی وارث اور ملک فارس کی حکمران بنی، جس کی خبر جب رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ نے زیر بحث مذکورہ فرمان ارشاد فرمایا، جس کی صداقت بھی چند سالوں ہی میں دنیا نے دیکھ لی کہ فارس سے یہ مجوسی حکومت ہی ختم ہوگئی اور اس کی جگہ وہاں اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا۔ [1]

مولانا مودودی مرحوم کے سیاسی موقف سے استدلال

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر عورت کی سربراہی کی گنجائش اسلام میں نہ ہوتی تو ایوب خان کے دور کے صدارتی انتخاب میں علماء فاطمہ جناح کی حمایت نہ کرتے جبکہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب اور بہت سے علماء نے اس وقت ایوب خان کے مقابلے میں فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی۔

بلاشبہ اس وقت بعض علماء نے ایوب خان کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی، جن میں بالخصوص مولانا مودودی مرحوم سرفہرست ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان حضرات نے فاطمہ جناح کی حمایت یہ سمجھتے ہوئے نہیں کی تھی کہ عورت کا سربراہ حکومت بننا اسلام میں جائز ہے بلکہ انھوں نے اسلام کے اصول کو کہ مرد و عورت کا دائرۂ کار ان کی فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے الگ الگ ہے، تسلیم کرتے ہوئے ایک اضطرار کے طور پر حمایت کی تھی جیسا کہ ان کے بیانات، تقاریر اور مضامین وغیرہ اور اس دور کے مخصوص پس منظر سے واضح ہے۔ علاوہ ازیں مولانا مودودی مرحوم کی تو ایک مفصل کتاب ''پردہ'' اس موضوع پر موجود ہے جس میں انھوں نے پوری تفصیل اور

1 فتح الباري:127/8 .

مکمل دلائل سے اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے اور اپنی تفسیر ''تفہیم القرآن'' میں بھی متعدد جگہ مغربی نظریۂ مساوات مرد و زن کی بھرپور تردید کی ہے، اس لیے ان کے ایک عارضی، وقتی اور سیاسی موقف کو، جو ان کے خیال میں ایک اضطراری اقدام تھا، بنیاد بنا کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے نزدیک عورت سربراہ حکومت ہو سکتی ہے یا چونکہ انھوں نے ایک عورت کی حمایت کی تھی تو گویا یہ اس بات کی سند ہے کہ اسلام میں عورت کے سربراہ ہونے کی اجازت موجود ہے۔

ایسا دعویٰ خود مولانا مودودی مرحوم پر بھی ظلم ہے اور اسلام پر بھی ظلم ہے کیونکہ یہ واقعات کے سراسر خلاف ہے۔ رہ گیا مسئلہ ان کے اضطرار کے طور پر حمایت کرنے کا کہ اس کی کیا حیثیت ہے۔ تو اس کے بارے میں اب سکوت زیادہ بہتر ہے کیونکہ اب ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہو چکا ہے۔ اگر ان کی دینی بصیرت، ملی درد اور سیاسی فہم نے اسے ''اضطرار'' سمجھنے میں ٹھوکر نہیں کھائی تو یقیناً عنداللہ وہ مجرم نہیں ہوں گے بلکہ امید ہے کہ وہ دگنے اجر کے مستحق ہوں گے اور اگر ان سے اس موقعے پر اجتہادی غلطی ہوئی ہے، تب بھی وہ ایک اجر کے مستحق بہرحال قرار پائیں گے اور اگر اسے ایک اجتہادی امر نہ سمجھا جائے بلکہ ان کے موقف کو ''سیاسی مصلحت'' باور کیا جائے، پھر تو مسئلہ بالکل ہی واضح ہو جاتا ہے کیونکہ سیاسی مصلحت کے طور پر بھی بعض کام انھوں نے غلط کیے ہیں جس سے ان کا جواز ثابت نہیں ہو سکتا، مثلاً: ''عید میلاد'' کے جلوس کے مولانا مودودی مرحوم قائل نہیں تھے اور اسے صریحاً غلط اور ناجائز ہی سمجھتے تھے۔[1]

لیکن 1970ء کے انتخابات کے موقع پر، جب ان کو ''شوکت اسلام'' کا جلوس نکالنے کی ضرورت پیش آئی تھی تو اس وقت انھوں نے ایک سوال کے جواب میں جلوس میلاد کا

[1] ملاحظہ ہو، روداد جماعت اسلامی: 122/5، طبع جون 1982۔

جواز بھی اس اندیشے کے پیش نظر تسلیم کر لیا تھا کہ اس موقعے پر اگر میں نے جلوس میلاد کے عدم جواز کا فتویٰ دے دیا تو اس کا اثر کہیں ''شوکت اسلام'' کے جلوس پر نہ پڑ جائے۔[1]

خیال رہے شوکت اسلام کے جلوس کی تاریخ 31 مئی 1970ء تھی جبکہ اس سال ''یوم میلاد'' اس سے چند روز قبل 19 اپریل کو پڑا تھا۔

ایک اور عبرت آموز اور دلچسپ لطیفہ

یہ لطیفہ بھی بڑا دلچسپ اور عبرت آموز ہے کہ اس وقت جماعت اسلامی کے اعلان کردہ جلوس ''شوکت اسلام'' کو ناکام بنانے کے لیے دیوبندی علماء کے ترجمان اخبارات (خدام الدین، لاہور، وغیرہ) نے جلوس میلاد کی حمایت و تائید فرمائی اور لوگوں کو یہ باور کرایا کہ اصل جلوس تو ''میلاد'' کا ہے جس میں شریک ہونا چاہیے یہ ''شوکت اسلام'' کا جلوس کیا ہے؟ درآں حالیکہ علمائے دیوبند خود بھی ''جلوس میلاد'' کے قائل نہیں ہیں۔

اس سے بہرحال یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بعض علماء سیاسی مصلحت کا شکار ہو کر شریعت کے تقاضوں کو بھی بعض دفعہ نہایت بے دردی سے پامال کر دیتے ہیں، اس لیے اس قسم کے اقدامات لغزشیں ہیں جن سے استدلال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ شریعت تو نام ہے قرآن و حدیث کا، علماء کے قول و عمل کا نام شریعت نہیں ہے۔ ان کے قول و عمل کو بھی شریعت ہی کی روشنی میں دیکھا جائے گا، جو اس کے مطابق ہوگا، وہ ٹھیک ہے۔ جس میں شریعت سے انحراف ہوگا، وہ مردود ہے۔

بہرحال جن علماء نے ایوب خان کے دور میں فاطمہ جناح کی حمایت کی ہے، اس کے مختلف اسباب ہیں جن کی وجہ سے ان کے طرز عمل سے اسلام کا مسلمہ اصول باطل قرار نہیں پا سکتا۔

1 اخبار روزنامہ ''ندائے ملت'' لاہور، 18 مئی 1970ء۔

ایک باخبر صحافی کی طرف سے توضیح مزید

فاطمہ جناح کو صدارتی امیدوار نامزد کرتے وقت سیاسی استبداد کی جو صورت تھی اور فاطمہ جناح کے جو وجوہ انتخاب تھے اس کی ضروری تفصیل ایک باخبر صحافی جناب محمد صلاح الدین مرحوم کے حسب ذیل اقتباس میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

”اس وقت معاملہ یہ تھا کہ ایوب خان کی آمریت سے نجات پانے کی کوئی مناسب صورت تلاش کی جارہی تھی، پہلے اعظم خان کا انتخاب کیا گیا لیکن اس کی بھنک پڑتے ہی خصوصی پیغامبر مولوی فرید احمد کو لاہور ائیرپورٹ پر گرفتار کرلیا گیا اور اعظم خاں بھی گرفت میں لے لیے گئے۔ چودھری محمد علی، نواب زادہ نصراللہ خان اور دیگر حضرات نے مادر ملت کی شخصیت میں ایوب خان کا توڑ تلاش کیا۔ ان پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ تھا۔ مولانا مودودی اس وقت جیل میں تھے، فتوے کے لیے پہلے مولانا مفتی محمد شفیع سے رجوع کیا گیا۔ ان پر دباؤ بڑھا تو دوسطروں کا فتویٰ جاری کردیا کہ ”دو برائیوں میں سے کم تر برائی کا انتخاب کر لیا جائے۔“

ایوب خاں اپنی پرویز نوازی، رؤیت ہلال اور عائلی قوانین کی وجہ سے دینی حلقوں میں خاصے ناپسندیدہ قرار پاچکے تھے، مادر ملت صرف عورت نہیں تھیں، قائداعظم محمد علی جناح کی بہن تھیں، پختہ کردار، نیک نام اور انتہائی محترم خاتون تھیں، سن رسیدہ تھیں، متنازعہ نہ تھیں، ان کے کردار پر کسی حرف گیری کی گنجائش نہ تھی، ان کی ذات سے کوئی اسکینڈل وابستہ نہ تھا، ان سے قوم کی گہری عقیدت تھی۔

مولانا مودودی کی رہائی سے قبل ہی وہ رائے عامہ کی ترجمان بن چکی تھیں، مولانا نے رہائی پاتے ہی ان کے حق میں رائے دی۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھیں جہاں شریعت پردے وغیرہ کی پابندیوں کو خود ہی نرم کردیتی ہے۔ جہاں وہ قباحتیں باقی نہیں رہتیں جن

کے پیشِ نظر ٹک کر گھر بیٹھنے اور پردے کے حدود قائم رکھنے کا حکم دیا گیا۔ ان سب کے باوجود مولانا مودودی کی رائے سے اختلاف کیا گیا۔ ان کی اپنی جماعت کے لوگوں نے اختلاف کیا...... یہ ایسی رائے نہیں تھی جسے علمائے کرام اور عام مسلمان آسانی سے ہضم کر لیتے۔ خود مولانا کے فیصلے میں خصوص تھا، عموم نہیں۔

اس معاملے کا دوسرا اور زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ مادرِ ملت سربراہ حکومت بننے کی امیدوار نہیں تھیں۔ انھوں نے مذاکرات کرنے والے لوگوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ میں تحریک کی قیادت کرسکتی ہوں، ملک کی صدارت مجھے منظور نہیں۔ انھیں جب بتایا گیا کہ موجودہ نظام میں امیدوارئ صدارت کے بغیر کوئی تحریک نہیں چل سکتی تو انھوں نے عبوری مدت کا سوال اٹھایا اور پوچھا کہ میری جگہ اصل صدر لانے میں تمھیں کتنا عرصہ لگے گا تو جواب دیا گیا کہ تقریباً ایک سال۔ مگر انھوں نے اس ''طویل عرصے'' کو مسترد کر دیا اور صرف تین ماہ کے اندر اندر نیا صدر منتخب کرنے کی مہلت دی۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو وہاں حصول حکومت کا محرک ہی موجود نہیں تھا۔ وہ کسی خواہش اقتدار کے بغیر محض آمریت سے نجات دلانے کے لیے میدان میں نکلنے پر آمادہ ہوئی تھیں۔ اب ان کی عمر، مخصوص حالات، محدود اور متعین مقصد، حصول اقتدار کے محرک کی عدم موجودگی اور صفات کردار سب کو ذہن میں رکھا جائے تو اس مثال سے عورت کی حکمرانی کا عام جواز نکال لینے کا کوئی قرینہ نہیں بنتا، اس کا کہیں اور اطلاق ہوگا تو عمر، صفاتِ کردار اور مخصوص و محدود مقصد سب ہی کو پیش نظر رکھا جائے گا، محض ہم جنس ہونا کافی نہیں ہوگا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اب بھی تو آمریت سے نجات پانے کے لیے ایک طاقتور حریف کی ضرورت تھی، جواباً عرض ہے کہ وہ ''آمر'' تو جنگ اقتدار سے قبل ہی اللہ کو پیارا ہو گیا، اب اس کے مقابل آنے کی کیا ضرورت۔ دوسرے مادر ملت کی طرح خواہش اقتدار ترک کیجیے، قوم کی قیادت کا حق ادا

ہوگیا۔ جمہوریت کی منزل سر ہوگئی۔ اب اپنا متبادل آگے لائیے۔ یہاں کوئی ایسی ہنگامی یا اضطراری صورت حال نہیں کہ عورت کی سربراہی کے بغیر ملک و ملت کا کام ہی نہ چل سکے۔''[1]

مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا فتویٰ اور اس پر تبصرہ

عورت کی سربراہی کے مسئلے میں مولانا اشرف علی تھانوی کی رائے سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نقطۂ نظر بھی واضح کر دیا جائے۔ مولانا تھانوی مرحوم نے حکومت کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں۔

پہلی قسم: وہ جو تام بھی ہو اور عام بھی۔ تام سے مراد یہ ہے کہ حاکم بانفرادہ خود مختار ہو، یعنی اس کی حکومت شخصی ہو اور اس کے حکم میں کسی حاکم اعلیٰ کی منظوری کی ضرورت نہ ہو۔ گو اس کا حاکم ہونا اس پر موقوف ہو۔ اور عام یہ کہ اس کی محکوم کوئی محدود قلیل جماعت نہ ہو، مثلاً: کسی عورت کی سلطنت یا ریاست بطرز مذکور شخصی ہو۔

دوسری قسم: وہ جو تام ہو مگر عام نہ ہو، جیسے کوئی عورت کسی مختصر جماعت کی بلاشرکت منتظم ہو۔

تیسری قسم: وہ جو عام ہو مگر تام نہ ہو، جیسے کسی عورت کی سلطنت جمہوری ہو کہ وہ اس میں والیٔ صوری درحقیقت والی نہیں ہے بلکہ ایک رکن مشورہ ہے اور مشیروں کا مجموعہ والیٔ حقیقی ہے۔

مولانا تھانوی صاحب فرماتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں مراد پہلی قسم، یعنی شخصی حکومت ہے جس میں سربراہ حکومت کو مکمل اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ بخلاف قسم ثانی و ثالث کے کہ وہاں حاکمیت کامل نہیں ہے

[1] ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی، ص:12- 15، 13 دسمبر 1988ء۔

بلکہ وہ مشورۂ محضہ ہے گو اس مشورے کو دوسرے منفرد مشوروں پر ترجیح حاصل ہو لیکن اس میں ولایت کاملہ کی شان نہیں ہے۔ علاوہ ازیں مولانا یہ بھی فرماتے ہیں کہ ایسی حکومت کی حقیقت محض مشورہ ہے اور عورت مشورے کی اہل ہے۔ اس بنا پر اگر سلطنت شخصی بھی ہو مگر ملکہ التزامًا اپنی انفرادی رائے سے کام نہ کرتی ہو تو وہ بھی اس حدیث میں داخل نہیں ہوگی کیونکہ عدم فلاح (ناکامیابی) کی علت نقصانِ عقل ہے اور جب مردوں کے مشورے سے اس کا ازالہ ہو گیا تو علت مرتفع ہوگئی تو معلول، یعنی عدم فلاح بھی منفی ہو گیا۔ اس طرح ایسی ریاستیں، جو عورتوں کے زیر فرمان ہیں، عدم فلاح کے حکم سے بری ہیں۔[1]

مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے یہ ساری گفتگو ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے ضمن میں فرمائی ہے جو ہندوستان میں قائم تھیں اور ان میں بعض مسلمان ریاستوں کی زمام کار عورت کے ہاتھ میں تھی، جیسے بھوپال۔

یہ مسلم حکمران عورتیں، اسلام کی پابند اور شریعت کے ضابطوں کو نہ صرف تسلیم کرنے والی تھیں بلکہ اپنی ریاست میں بھی اسلامی شریعت کی بالادستی انھوں نے قائم کی ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں حکمران خاندان میں موزوں مرد نہ ہونے کی وجہ سے بعض جگہ یہ صورت رونما ہوئی کہ موروثی طور پر کسی عورت کو انتظام ریاست سنبھالنا پڑا۔ بنابریں حکمران ہونے کے باوجود ان خواتین نے بے پردگی اختیار نہیں کی۔ مردوں کے ساتھ بے محابا اور بے باکانہ اختلاط کا راستہ اختیار نہیں کیا اور سب سے بڑھ کر اپنے آپ کو عقل کل بھی نہیں سمجھا اور تمام معاملات ریاست سمجھ دار اہل علم واہل دانش کے مشوروں سے چلاتی رہیں۔ یوں ان کے دور حکمرانی میں بالعموم اسلامی اصول وضوابط کی پابندی رہی، تاہم حدیث مذکور کی بنا پر ایک خلش ان حکومتوں کے اندر پھر بھی موجود رہی جس کا حل مولانا تھانوی نے مذکورہ

1 ملخص از: امداد الفتاویٰ: 5/99-101.

توجیہ کے ذریعے سے پیش کیا ہے۔

یہ ان کی ایک تاویل اور توجیہ ہی ہے جس کے علماء پابند نہیں ہیں۔ تاہم اسے کسی درجے میں تسلیم کرلیا جائے تب بھی اسے صرف اسی دائرے اور حالات میں رہ کر ہی تسلیم کیا جاسکتا ہے جو مولانا تھانوی کے پیش نظر تھے۔

اور یہ حالات موجودہ حالات سے یکسر مختلف ہیں جس کے وجوہ درج ذیل ہیں۔

سابقہ ریاستوں میں سے کسی ریاست کے سربراہ بننے کے لیے کسی عورت کو گھر سے باہر نکل کر سیاسی جلسوں، انتخابی مہم اور دیگر بے شمار سرگرمیوں میں حصہ لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ گھر بیٹھے ہی موروثی طور پر ان کو حکمرانی مل گئی جبکہ ہمارے ملک میں اس کی ایک نظیر (مثال) بے نظیر بھٹو ہیں۔ اس خاتون کو سربراہ حکومت بننے سے پہلے اس سربراہی کے لیے جو پاپڑ بیلنے پڑے اور جس جاں گسل انتخابی مہم سے انھیں گزرنا پڑا ہے، وہ محتاج وضاحت نہیں ہے حتی کہ تیسری مرتبہ وزیراعظم بننے کے لیے انتخابی مہم کے دوران میں (نومبر 2007ء میں) اس کو اپنی جان ہی سے ہاتھ دھونے پڑ گئے۔ ظاہر ہے یہ ساری سرگرمیاں اسلامی اصول اور ضابطوں کے خلاف ہیں۔ اس میں مردوں سے بے باکانہ اختلاط بھی ہے، اپنی آواز اور شخصیت کا جادو جگانا بھی ہے، اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنا بھی ہے اور اپنے جسمانی حسن کی نمائش کرنا بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کی رو سے ایک مسلمان عورت کے لیے یہ تمام کام جائز ہیں۔ اگر یہ ناجائز ہیں اور یقیناً ناجائز ہیں تو پھر اسے کسی سابقہ ریاست کی حکمران عورت پر کس طرح قیاس کیا جاسکتا ہے جسے مذکورہ ناجائز کاموں میں سے کوئی بھی کام کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔

علاوہ ازیں دونوں حالتوں میں فرق اس سے بھی واضح ہے کہ سابقہ مسلمان ریاست کی حکمران والیہ کبھی کسی بیرونی دورے پر بھی نہیں گئی۔ غیر ملکی سفیروں سے ملنے کی

ضرورت بھی اسے لاحق نہیں ہوئی اور ہر کہ ومہ سے ملنے کا اہتمام بھی اس نے کبھی نہیں کیا جبکہ آجکل صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے۔

اب بننے والی وزیرۂ عظمیٰ کو بیرونی دوروں پر بھی جانا پڑے گا۔ غیر ملکی سفراء اور رجال سے ملاقاتیں بھی ہوں گی اور ہر ایک سے ملنے کا اہتمام بھی کرنا پڑے گا۔ اس صورت میں اسلامی اصول وتعلیمات کی جو مٹی پلید ہوگی وہ کس سے مخفی ہے، پھر آخر دونوں کو یکساں کس طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

بنیادی استدلال اور بیان علت میں خامی

ان سب سے بڑھ کر مولانا تھانوی کا بنیادی استدلال اس نقطے پر ہے کہ عدم فلاح (ناکامیابی) کی علت نقصان عقل ہے جس کا ازالہ جمہوری حکومت میں مشورۂ رجال سے ہو جاتا ہے اور یوں اس علت کے مرتفع ہو جانے کی وجہ سے عورت کی حکومت نقصان دہ نہیں رہتی۔

لیکن یہ نقطۂ نظر بھی سخت محل نظر ہے۔ مذکورہ حدیث رسول میں کوئی علت بیان نہیں کی گئی ہے، اس لیے اپنے طور پر ایک علت فرض کر کے اس کی بنیاد پر صغریٰ کبریٰ ملا کر ایک نتیجہ اخذ کرنا کوئی صحیح طرز عمل نہیں ہے۔ اس دور کے متجددین کی روش بھی یہی ہے کہ وہ فرضی علتیں تلاش کر کے شریعت اسلامیہ کے منصوص احکام میں تبدیلیوں کی گنجائش نکالنے کی مذموم سعی کرتے ہیں۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا تھانوی کی مذکورہ فقاہت کے ڈانڈے بھی متجددین سے جا ملتے ہیں۔

اس عدم فلاح کی اصل علت کیا ہے۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، تاہم اس کی کوئی نہ کوئی علت اگر تلاش کرنی ہی ہے تو زیادہ قرین قیاس علت تو اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسلام نے مرد وعورت کی جداگانہ فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے الگ الگ ایک دوسرے سے

مختلف ان کا دائرۂ عمل تجویز کیا ہے تا کہ دونوں اپنے اپنے مقصد تخلیق کو پورا کریں۔ عورت کی سربراہی اس فطری نظام سے بغاوت ہے اور جو قوم فطرت کے نظام سے بغاوت کر کے عورت کو سربراہِ کار بنائے گی، یقیناً وہ فوز وفلاح سے ہمکنار نہیں ہوگی کیونکہ

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

اگر محض نقصان عقل کو علت تسلیم کیا جائے تو پھر تو زیر بحث فرمان رسول ﷺ کی ساری اہمیت ہی ختم ہو جاتی ہے کیونکہ دنیا میں کوئی بھی حکمران چاہے بادشاہ ہی ہو مشاورت کے بغیر نہ حکومت کرتا ہے اور نہ ہی حکومت چلا سکتا ہے۔ بادشاہی نظام میں بھی مشاورت کا اہتمام ہوتا ہے، پھر تو مولانا تھانوی کو ''جمہوری حکومت'' کی قید لگانے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے کیونکہ اپنے اپنے انداز میں مشاورت کا اہتمام تو ہر حکومت میں ہوتا ہے۔ قرآن کریم سے بھی یہ نکتہ واضح ہے کہ ملکۂ سبا نے بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے خط آنے کے بعد اعیان حکومت سے مشورہ طلب کیا تھا لیکن اس مشورۂ احباب کے باوجود اسے حضرت سلیمان علیہ السلام کی تابعداری اختیار کرنی پڑی تھی اور یہ مشورہ اسے عدم فلاح سے بچا نہیں سکا۔ ملکۂ سبا کے اس پہلو مشورۂ رجال کی وضاحت کے باوجود جب رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا:

''وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہیں ہوگی جس نے ایک عورت کو اپنا سربراہ بنا لیا۔''

تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کی علت یہ ہرگز نہیں ہے کہ عورت ناقص العقل ہے بلکہ اس کی اصل علت نظام فطرت سے بغاوت ہے جو قوم بھی اس نظام فطرت سے بغاوت کرے گی وقتی طور پر چاہے کچھ کامیابی بھی حاصل کر لے، تاہم حقیقی فوز وفلاح سے وہ محروم ہی رہے گی۔

مولانا تھانوی کی تاویل بھی ہمارے لیے چنداں مفید نہیں

بالفرض اگر تھوڑی دیر کے لیے ہم تسلیم کر لیں کہ ((لن یفلح ...... الحدیث)) کی علت نقصان عقل ہے جس کا انجبار (ازالہ) مشورۂ رجال سے ہو جاتا ہے۔ تب بھی سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا ہمارے ہاں کی صورت حال بھی ایسی ہی ہے؟ ہمارے ملک کے حکمران کیا جمہوری مزاج رکھتے ہیں یا نقصان عقل کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہاں تو عقل کل ہونے کا دعویٰ اور غرہ ہے۔ یہاں تو مرد بھیگی بلی بنے ہوئے ہیں، مشورہ دینا تو کجا کسی شخص کو اس بت طناز (بے نظیر جیسی خاتون وزیر اعظم) کے سامنے مجال دم زدنی نہیں ہے۔ وہ خود کسی سے مشاورت کی ضرورت سمجھے تو اور بات ہے ورنہ کسی بھی مرد کو مشورہ دینے کی جرأت و ہمت نہیں۔ بنابریں حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جمہوریت کا صرف نام ہے، ورنہ یہاں ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر اور نواز شریف سمیت ہر جمہوری حکمران بدترین آمر ہی ثابت ہوا ہے۔

بلاشبہ برطانیہ وغیرہ میں صحیح معنوں میں جمہوریت قائم ہے اور وہاں جمہوری اقدار و روایات کی پاسداری کا پورا اہتمام ہے، وہاں تمام ادارے اپنی اپنی جگہ مستحکم اور فعال ہیں۔ عدلیہ، انتظامیہ، مقنّنہ اور صحافت اپنے اپنے دائرے میں آزاد اور مؤثر ہیں۔ ایسے ملک میں وزیر اعظم یقیناً آمرانہ اختیارات نہیں رکھتا اور اس کی حیثیت ایک مشیر سے زیادہ نہیں۔ اصل اختیارات کی مالک وہاں کی کابینہ ہے۔ وزیر اعظم اس کے مشورے اور رائے کے بغیر کوئی اہم اقدام کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ ایسے ملک میں اگر وزیر اعظم عورت ہو تو شاید وہاں وقتی طور پر اس کے وہ نقصانات ظاہر نہ ہوں جن کی طرف حدیث زیر بحث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

جس سے بقول مولانا تھانوی عدم فلاح کی علت مرتفع ہو گئی لیکن ہمارے ہاں صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں جمہوری اقدار و روایات کی پاسداری ہے نہ جمہوری ادارے مستحکم و فعال ہیں اور نہ برسر اقتدار آنے والے حکمران اور پارٹیاں جمہوری مزاج کی حامل ہیں۔ اس قسم کے ملک میں عورت کی حکمرانی بالخصوص اپنے اندر خطرات کے وہ تمام پہلو رکھتی ہے جس سے حدیث رسول ﷺ میں انتباہ کیا گیا ہے، اس لیے ہمیں اس حدیث رسول کی صداقت پر پورا یقین ہے اور ہم پورے اذعان سے یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے اصول کو پامال کرتے ہوئے جب بھی اور جہاں بھی ایک عورت کی حکمرانی کو قبول کیا جائے گا، یہ فعل ملک و ملت کے لیے ہرگز نیک فال نہیں ہو گا۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے ملکۂ سبا کے مشاورتی کردار سے بھی استدلال کیا ہے لیکن جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ ملکۂ سبا مشرکہ اور کافرہ تھی، اس کا کوئی بھی عمل و کردار ہمارے لیے حجت نہیں، اس لیے مولانا تھانوی کے اس نکتے کو ہم نے نظرانداز کر دیا ہے کیونکہ اس پر بحث ہو چکی ہے، تاہم استدلال کی یہ سطحیت مولانا تھانوی کے کلام میں دیکھ کر سخت تعجب ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی یہ لغزش معاف فرمائے۔

مولانا تھانوی کا تضاد یا رجوع

یہاں تک لکھا جا چکا تھا کہ اچانک مولانا تھانوی کی تفسیر ''بیان القرآن'' دیکھنے کا خیال آیا تو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ مولانا تھانوی نے اپنی تفسیر میں ملکۂ سبا کے قرآن کریم میں ذکر سے جو عورت کی حکمرانی کے جواز پر استدلال کیا جاتا ہے اسے غلط قرار دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''ہماری شریعت میں عورت کو بادشاہ بنانے کی ممانعت ہے، پس بلقیس کے قصے سے کوئی شبہ نہ کرے۔ اول تو یہ فعل مشرکین کا تھا۔ دوسرے اگر شریعت سلیمانیہ نے اس کی

تقریر بھی کی تو شرع محمدی ﷺ میں اس کے خلاف ہوتے ہوئے وہ حجت نہیں۔"[1]

مولانا تھانوی کا مذکورہ فتویٰ 1330ھ کا ہے جبکہ تفسیر اس کے 4 سال بعد 1334ھ میں طبع ہوئی ہے جیسا کہ اس کے طبع اول میں یہ تاریخ طبع مطبع مجتبائی دہلی میں موجود ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مولانا تھانوی نے جو فتویٰ 1330ھ میں دیا تھا، اس کے بعد تفسیر میں اس کے برعکس اپنی رائے کا اظہار کر کے اس سے رجوع فرما لیا تھا کیونکہ اگر اسے رجوع نہیں کہا جائے گا تو یہ تضاد ہو گا۔ تضاد کی بہ نسبت رجوع کہنا مولانا تھانوی رحمہ اللہ کی شان کے انسب ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے واقعے سے استدلال اور اس کی حقیقت

ایک اور واقعے سے استدلال کیا جاتا ہے جو حدیث کی بعض کتابوں میں درج ہے اور وہ واقعہ ہے حضرت ام ورقہ بنت نوفل رضی اللہ عنہا کا۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں:

"حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق لکھا ہے کہ جنگ بدر 2ھ میں رسول اللہ ﷺ مدینے سے روانہ ہوئے تو انھوں نے اپنی خدمات پیش کیں کہ یا رسول اللہ! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔ میں بھی اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرنا چاہتی ہوں۔ ان کے متعلق ایک اور روایت ہے جو اس سے بھی زیادہ عملی یا علمی دشواریاں پیدا کرے گی۔ وہ یہ کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ ﷺ نے ایک مسجد کا امام مامور فرمایا تھا جیسا کہ سنن ابی داود اور مسند احمد بن حنبل میں ہے اور یہ بھی کہ ان کے پیچھے مرد بھی نماز پڑھتے تھے اور یہ کہ ان کا مؤذن ایک مرد تھا۔ ظاہر ہے کہ مؤذن بھی بطور مقتدی ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہو گا۔"[2]

ڈاکٹر صاحب کی اس سلسلے میں مزید گفتگو اور بعض لوگوں کا اس سے استدلال نقل

1 تفسیر بیان القرآن، پارہ: 19، 74/8، طبع مجتبائی، دہلی 1346ھ۔ 2 خطبات بہاول پور، ص: 26، مطبوعہ اسلام آباد۔

کرنے سے پہلے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ نفس حدیث پر گفتگو کر لی جائے۔ یہ روایت مسند احمد اور سنن ابوداود وغیرہ میں موجود ہے، البتہ اس میں خط کشیدہ الفاظ نہیں ہیں۔ بلکہ پہلے خط کشیدہ الفاظ کی جگہ (أُمَرِّضُ مَرْضَاكُمْ) کے الفاظ ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ میں بیماروں کی تیمارداری یا زخمیوں کی مرہم پٹی کروں گی۔ اسی طرح روایت میں یہ الفاظ بھی نہیں ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ نے انھیں ایک مسجد کا امام مامور فرمایا تھا اور یہ کہ ان کے پیچھے مرد بھی نماز پڑھتے تھے۔'' حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«فَاسْتَأْذَنَتِ النَّبِيَّ ﷺ أَنْ تَتَّخِذَ فِي دَارِهَا مُؤَذِّنًا، فَأَذِنَ لَهَا»

''انھوں نے نبی ﷺ سے اپنے گھر میں مؤذن رکھنے کی اجازت طلب کی تو آپ نے انھیں اس کی اجازت دے دی۔''[1]

جب نبی ﷺ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کو ان کی خواہش کے مطابق جنگ پر لے جانے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے بلکہ ان سے یہ فرمایا: ''تم اپنے گھر ہی میں رہو'' تب انھوں نے نبی ﷺ سے اپنے گھر میں ایک مؤذن رکھنے کی اجازت طلب فرمائی اور آپ نے انھیں ایسا کرنے کی اجازت عنایت فرما دی۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

«وَجَعَلَ لَهَا مُؤَذِّنًا يُؤَذِّنُ لَهَا، وَأَمَرَهَا أَنْ تَؤُمَّ أَهْلَ دَارِهَا»

''نبی ﷺ نے ان کے لیے ایک مؤذن مقرر فرما دیا جو ان کے لیے اذان دیا کرتا تھا اور نبیٔ اکرم ﷺ نے حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا کہ اپنے گھر والوں کی امامت کرایا کرے۔''[2]

اسی روایت میں مؤذن کے بارے میں بھی صراحت موجود ہے کہ وہ ایک بہت

---

1 سنن أبي داود، الصلاة، باب إمامة النساء، حديث: 591 . 2 سنن أبي داود، الصلاة، باب إمامة النساء، حديث 592، وصحيح ابن خزيمة: 89/3، ومسند أحمد: 405/1، وسنن الدار قطني: 403/1، والمستدرك للحاكم: 203/1 .

بوڑھا آدمی تھا۔

لیکن ایک تو یہ روایت سند کے لحاظ سے ضعیف ہے اس میں دو راوی مجہول ہیں۔ دوسرے، سند میں اضطراب بھی ہے۔ تیسرے، اس میں کہیں بھی وہ خط کشیدہ الفاظ نہیں ہیں جو ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کی عبارت میں ہیں۔ چوتھے، محدثین نے اسے جس باب کے تحت ذکر کیا ہے، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی اس سے یہی بات اخذ کی ہے کہ اس میں صرف ایک عورت کے عورتوں کی امامت کرانے کا بیان ہے۔ یہ نہیں ہے کہ عورت نے مردوں کی امامت یا کسی مسجد کی امامت کرائی ہے، چنانچہ سنن ابو داود میں یہ روایت باب إمامة النساء میں، سنن دارقطنی میں باب صلاة النساء جماعة میں، صحیح ابن خزیمہ میں باب إمامة المرأة النساء في الفريضة میں اور مستدرک حاکم میں إمامة المرأة النساء في الفرائض میں بیان ہوئی ہے جس سے صرف یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک عورت، عورتوں کی فرائض میں امامت کر سکتی ہے۔ جیسا کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا امامت کراتی رہی ہیں۔

اس حدیث میں کہیں بھی ایسے الفاظ نہیں ہیں جن کا یہ مفہوم نکل سکتا ہو کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کسی مسجد میں امامت کرایا کرتی تھیں یا ان کے پیچھے عام مرد بھی نماز پڑھا کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی کچھ کہہ سکتا ہے تو یہ کہ مؤذن اور ایک مدبر غلام ان کے پیچھے نماز پڑھتے ہوں گے۔ اگرچہ ان کے نماز پڑھنے کی صراحت بھی حدیث میں موجود نہیں ہے، پھر محلے کے عام مردوں کا عورت کے پیچھے نماز پڑھنے کا جواز اس سے کس طرح نکل سکتا ہے؟

بلاشبہ عربی زبان میں (دار) کا لفظ (بیت) سے زیادہ وسعت رکھتا ہے اور (دار) کو حویلی یا محلے کے مفہوم میں لیا جا سکتا ہے، مؤذن مقرر کرنے سے بھی اس مفہوم کی تائید

نکلتی ہے، تاہم اس کے باوجود یہ ماننا سخت مشکل ہے کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے پیچھے حویلی یا محلے کے عام مرد بھی نماز پڑھتے ہوں گے بلکہ اس سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ حویلی یا محلے کی دوسری خواتین بھی حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے پیچھے آ کر نماز پڑھتی ہوں گی۔

علاوہ ازیں اس حدیث سے پھر بھی یہ قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ مردوں کی طرح عورتیں بھی عام مساجد میں امام بن سکتی ہیں اور پھر اس ردے پر ایک اور ردہ یہ چڑھا دیا جائے کہ جب عورت مسجد میں مردوں کی امام بن سکتی ہے تو پھر ملک کی سربراہ بھی بن سکتی ہے۔ ایسا دعویٰ ''بنائے فاسد علی الفاسد'' ہی کہلائے گا۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی توجیہ اور ایک عملی مثال

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب جنھوں نے (دار) کے لفظ کی وسعت کے پیش نظر حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کو ایک مسجد کا امام قرار دیا ہے، وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک استثنائی صورت ہوسکتی ہے، ورنہ عام حالات میں ایک عورت مردوں کی امام نہیں بن سکتی۔ چونکہ بعض لوگ ڈاکٹر صاحب کی عبارت کو سیاق و سباق سے کاٹ کر اپنے مطلب کے لیے استعمال کرتے ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی توجیہ اور ان کا وہ موقف جو حدیث ام ورقہ رضی اللہ عنہا کی روشنی میں انھوں نے اختیار کیا ہے، اسے انھی کے الفاظ میں پیش کر دیا جائے، چنانچہ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

''یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورت کو امام بنایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس حدیث کے متعلق یہ گمان ہوسکتا ہے کہ یہ شاید ابتدائے اسلام کی بات ہو اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منسوخ کر دیا ہو لیکن اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک زندہ رہیں اور اپنے فرائض سرانجام دیتی رہیں، اس لیے

بعض اوقات عام قاعدے میں استثنا کی ضرورت پیش آتی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے استثنائی ضرورتوں کے لیے یہ استثنائی تقرر فرمایا ہوگا، چنانچہ میں اپنے ذاتی تجربے کی ایک چیز بیان کرتا ہوں۔ پیرس میں چند سال پہلے کا واقعہ ہے۔ایک افغان لڑکی طالب علم کے طور پر آئی۔ ہالینڈ کا طالب علم جو اس کا ہم جماعت تھا۔ اس پر عاشق ہو گیا۔عشق اتنا شدید تھا کہ اس نے اپنا دین بدل کر اسلام قبول کر لیا۔ان دونوں کا نکاح ہوا۔ اگلے دن وہ لڑکی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ بھائی صاحب میرا شوہر مسلمان ہو گیا ہے اور وہ اسلام پر عمل بھی کرنا چاہتا ہے لیکن اسے نماز نہیں آتی اور اسے اصرار ہے کہ میں خود امام بن کر نماز پڑھاؤں۔ کیا وہ میری اقتدا میں نماز پڑھ سکتا ہے؟ میں نے اسے جواب دیا کہ اگر کسی عام مولوی صاحب سے پوچھیں گی تو وہ کہے گا کہ یہ جائز نہیں۔لیکن میرے ذہن میں رسول اللہ کے طرز عمل کا ایک واقعہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کا ہے، اس لیے استثنائی طور پر تم امام بن کر نماز پڑھاؤ۔تمھارے شوہر کو چاہیے کہ مقتدی بن کر تمھارے پیچھے نماز پڑھے اور جلد از جلد قرآن کی ان سورتوں کو یاد کرے جو نماز میں کام آتی ہیں۔کم از کم تین سورتیں یاد کرے اور تشہد وغیرہ یاد کرے، پھر اس کے بعد وہ تمھارا امام بنے اور تم اس کے پیچھے نماز پڑھا کرو۔ دوسرے الفاظ میں ایسی صورتیں جو کبھی کبھار امت کو پیش آ سکتی تھیں، ان کی پیش بندی میں رسول اللہ ﷺ نے یہ انتخاب فرمایا تھا۔شاید اس واقعے کی یہ وجہ ہو۔[1]

یہ اس واقعے کی نہایت معقول توجیہ ہے جو خود ڈاکٹر صاحب موصوف نے بیان فرما دی ہے۔ جزاه الله أحسن الجزاء.

علامہ اقبال کی ایک تقریر سے استدلال

بعض لوگوں کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ میں علامہ اقبال کی ایک تقریر کے

1 خطبات بہاول پور، ص: 26-27

اقتباسات بھی ان کے فرزند جاوید اقبال کی تصنیف ''زندہ رود'' سے نقل کیے گئے ہیں لیکن نقل میں صریح بددیانتی کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ بعض ایسے فقرے تو لے لیے گئے ہیں جن سے مرد وزن کی اس مساوات کی تائید ہو جو یورپ کے مغربی نظام میں ہے لیکن وہ تمام فقرے حذف کر دیے گئے ہیں، جن سے مغربی نظریۂ مساوات مرد وزن کی نفی ہوتی ہے، حالانکہ علامہ اقبال کی اس تقریر میں مرد وزن کے درمیان شہری حقوق میں مساوات کی بات کہی گئی ہے۔ جو فی الواقع اسلام کے مطابق ہے۔ لیکن جہاں تک فرائض کا تعلق ہے، وہ دونوں کے الگ الگ ہیں، جسے علامہ اقبال نے بھی تسلیم کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

''عورت کے بحیثیت عورت اور مرد کے بحیثیت مرد، بعض خاص علیحدہ علیحدہ فرائض ہیں، ان فرائض میں اختلاف ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ عورت ادنیٰ ہے اور مرد اعلیٰ۔ فرائض کا اختلاف اور وجوہ پر مبنی ہے۔ مطلب یہ کہ جہاں تک مساوات کا تعلق ہے، اسلام کے اندر مرد و زن میں کوئی فرق نہیں۔ تمدنی ضروریات کی وجہ سے فرائض میں اختلاف ہے۔''[1]

یہی وہ بات ہے جو علماء بھی کہتے ہیں، علماء بھی یہ نہیں کہتے کہ عورت ادنیٰ یا حقیر ہے بلکہ اصل بات فطری صلاحیتوں اور اس کے مطابق الگ الگ فرائض کی ہے۔ ان فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے مرد کو ایک گونہ برتری حاصل ہے جس کا ذکر قرآن میں بھی کیا گیا ہے: ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ ''مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ برتری حاصل ہے۔''[2] اس انتظامی برتری کی بنیاد پر حقوق میں مساوات کا انکار کرنا صحیح نہیں ہے اور یہ اختلاف فرائض علامہ اقبال بھی تسلیم فرماتے ہیں۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ علامہ اقبال بھی عورت کی مساوات کے تو قائل ہیں لیکن اسی دائرے میں جو اسلام کی

1 زندہ رود: 358/3۔ 2 البقرۃ 228:2.

رُو سے اسے حاصل ہے، مغربی نظریۂ مساوات مرد و زن کے وہ بھی حامی نہیں ہیں جس کی رو سے مرد و عورت کے درمیان کوئی فطری فرق نہیں ہے، اس لیے مغرب کے نزدیک دونوں کے حقوق جس طرح یکساں ہیں، فرائض بھی دونوں کے یکساں ہیں۔

پمفلٹ مذکور میں علامہ اقبال کی بابت یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ وہ عورتوں کے لیے پردے کے قائل نہیں تھے لیکن علامہ اقبال اپنی اس تقریر میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

''دیکھنا یہ ہے کہ جن باتوں کو لفظی قیود سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ اپنی اصل میں قیود ہیں یا نہیں؟ پردے کے متعلق اسلام کے احکام واضح ہیں ''غض بصر'' کا حکم ہے اور وہ اس لیے کہ زندگی میں ایسے بھی وقت آتے ہیں جب عورت کو غیر محرم کے سامنے ہونا پڑتا ہے...... پردے کے سلسلے میں اسلام کا عام حکم عورت کو یہ ہے کہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کرے۔''[1]

فرمایئے! اس اقتباس میں مسلمان عورت کے لیے پردے کی تاکید ہے یا اسے نعوذ باللہ عورتوں کے لیے ''قید'' سے تعبیر کیا گیا ہے؟ جس طرح کہ پمفلٹ مذکور میں باور کرایا گیا ہے۔

اقبال کے نزدیک سوشلزم اور مغربی جمہوریت دونوں مردود ہیں

پھر علامہ اقبال کے کلام سے استشہاد کرنے والوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ علامہ کے نزدیک بالشویک، کمیونسٹ یا سوشلسٹ عقیدہ رکھنا دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف تھا۔[2]

اسی طرح اقبال ''مغرب کے سیکولر جمہوری نظام'' کے بھی حامی نہیں تھے بلکہ ان کے نزدیک: ''کسی بھی پس ماندہ ملک میں، جس کے عوام زیادہ تر ان پڑھ، غیر منظّم اور فاقہ

1 زندہ رود: 359/3۔ 2 زندہ رود: 659/3۔

کش ہوں، وہاں جمہوریت کا تعارف، سیاسی ابتری، معاشی تباہی، قومی انتشار اور ملک کے ٹوٹنے کا سبب بن سکتا ہے۔‘‘ [1]

کلام اقبال کو سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کرنے والے اقبال کے مذکورہ واضح اور دوٹوک موقف کو ماننے کے لیے اور اس کی روشنی میں اپنے منشور اور نظریات کا جائزہ لینے کے لیے تیار ہیں؟ حتی کہ مسلمان عورت کے بارے میں علامہ اقبال نے اپنے شعری کلام میں جو وضاحت کی ہے (جو کتاب کے آخر میں شامل ہے) اسے بھی قبول کرنا ان کے لیے ممکن نہیں؟

مقصد تخلیق اور دائرۂ کار کی وضاحت توہین نہیں

11 دسمبر 1988ء کے ’’جنگ‘‘ میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے فرمایا کہ عورت کی سربراہی کو موضوع بحث بنا کر لوگ اپنی ہی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی مذمت کر رہے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی اونچے درجے کے شاعر، ادیب اور اہل قلم ہیں لیکن مذکورہ ارشاد میں انھوں نے سطحیت کا مظاہرہ بھی کیا ہے اور مسلمان عورتوں کو گمراہ کرنے کی مذموم سعی بھی، حالانکہ اس بحث سے مقصود عورت کی مذمت اور اہانت قطعاً نہیں ہے۔ بات صرف فطری صلاحیتوں اور اسلام کے اصول وضوابط کی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ مرد عورت کے مقابلے میں زیادہ بہادر ہے تو اس میں عورت کی تذلیل واہانت کا کوئی پہلو نہیں ہے کیونکہ یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے جو مرد وعورت کے درمیان فطری فرق وصلاحیت پر مبنی ہے۔ اسی طرح جب یہ کہا جاتا ہے کہ مرد وعورت کا دائرۂ کار بھی الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ عورت کا دائرۂ عمل گھر کی چار دیواری ہے جبکہ بیرونی سرگرمیاں مرد کے دائرۂ عمل میں داخل ہیں تو یہ بھی ایک حقیقت ہی کا اظہار ہے جو دونوں کے درمیان صلاحیتوں

---

[1] زندہ رود: 661/3۔

اور دونوں کے جداگانہ مقصد تخلیق پر مبنی ہے۔

آج بھی یورپ میں فوج کے تمام جرنیل مرد ہیں۔ کیوں؟ جبکہ وہاں ہر شعبے میں مرد و زن کے درمیان کامل مساوات تسلیم کی جاتی ہے، تمام پائلٹ مرد ہیں، بیشتر کلیدی مناصب پر مرد ہی فائز ہیں۔ کیا ان کا یہ رویہ عورت کی تذلیل و اہانت پر مبنی ہے؟ نہیں یقیناً نہیں بلکہ کامل مساوات کا دعویٰ کرنے کے باوجود وہ مردوں کی برتری کو قائم کیے ہوئے ہیں کیونکہ یہ فطرت کا نظام اور اس کا عین تقاضا ہے جسے خواہش کے باوجود بدلا نہیں جا سکتا۔ اس لیے اسلام جب یہ کہتا ہے کہ عورت بیرونی سرگرمیوں سے مجتنب رہے تو یہ بات فطرت کے عین مطابق اور اس کا تقاضا ہے۔ علاوہ ازیں اسلامی تعلیمات کا بھی عین اقتضا ہے کیونکہ اس نے مرد و عورت کے اختلاط کو سخت ناپسند کیا ہے اور اس کے لیے اس نے بہت سی پابندیاں عائد کی ہیں، اس لیے اسے عورت کی توہین قرار دینا سخت بدیانتی ہے یا اسلام پر حرف گیری۔ اور ہم دونوں باتوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

ایک پروفیسر کے جواب میں

13 دسمبر 1988ء کے ہفت روزہ ''ندا'' لاہور میں پروفیسر محمد اسلم صاحب استاذ شعبۂ تاریخ جامعہ پنجاب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے یہ ''فتویٰ'' صادر فرمایا ہے کہ عورت کے حکمران بننے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے اور ''دلیل'' یہ ارشاد فرمائی ہے کہ تاریخ میں فلاں فلاں عورتیں حکمران رہی ہیں اور نہایت کامیابی سے انھوں نے حکومت کی ہے، اس لیے یہ مانے بغیر چارہ نہیں ہے کہ نبی ﷺ کا فرمان صرف فارس کی بوران دخت نامی عورت کے لیے تھا۔ آپ کا یہ فرمان بطور اصول اور کلیے کے نہیں تھا۔ ورنہ آپ کی صداقت مشکوک ٹھہرے گی۔ (یہ ان کے سارے مضمون کا خلاصہ ہے)

پروفیسر صاحب نے مضمون کے آغاز میں پہلے تو اس بات پر اظہار افسوس فرمایا ہے

کہ آج قرنِ اوّل کے برعکس جس کا جی چاہتا ہے، ہر کس و ناکس فتویٰ صادر کرنا شروع کر دیتا ہے، حالانکہ ہمارے ہاں وفاقی شرعی عدالت، اسلامی نظریاتی کونسل اور ادارۂ تحقیقات اسلامی موجود ہیں اور ان اداروں کی موجودگی میں کسی فرد واحد یا خود ساختہ مفتی کو فتویٰ جاری کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ اس ضمن میں انھوں نے یہ دعویٰ بھی فرمایا کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں چند عالم صحابہ کے علاوہ کسی کو فتویٰ دینے یا حدیث بیان کرنے کی ممانعت تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد کی بابت جو دعویٰ کیا گیا ہے، وہ تو خلاف واقعہ ہے (جس کی تفصیل کی اس وقت گنجائش نہیں) تاہم یہ بات نہایت تعجب انگیز ہے کہ جن علماء کی ساری عمر قرآن و حدیث کی تعلیم و تدریس اور افتاء و ارشاد میں گزری ہے وہ تو ''کس و ناکس'' اور ''خود ساختہ'' مفتی قرار پائے ہیں، جنھیں فتویٰ دینے کا کوئی حق نہیں ہے اور خود موصوف جو تاریخ کے پروفیسر ہیں اور شاید عربی زبان سے بھی نابلد ہیں۔ وہ مذکورہ اداروں کی موجودگی میں بھی ''فتویٰ'' صادر کرنے کے مجاز ٹھہرے ہیں اور ان کے مضمون کا عنوان ہی ایک مکمل فتویٰ ہے:

''عورت کے حکمران بننے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔''

گویا ؎ تمھاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو مرے نامۂ سیاہ میں ہے

اس تضاد یا دو عملی پر ہم سوائے اس کے کیا عرض کریں ؎

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

دوسری بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب موصوف کے ''الواح الصنادید'' اور سفرنامے قسم

کے مضامین پڑھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ انھیں بزرگوں کے ساتھ بڑی عقیدت ہے لیکن اس مضمون سے معلوم ہوا کہ ان کی ساری عقیدت فوت شدہ بزرگوں سے ہے، زندہ بزرگوں سے نہیں۔ کراچی کے جن 15 اکابر علماء نے عورت کی سربراہی کے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ اختلاف مسلک کے باوجود علم وفضل، اپنی دینی خدمات اور زہد وتقویٰ کے لحاظ سے نہایت برگزیدہ اور سربرآوردہ بزرگ ہیں۔ لیکن پروفیسر صاحب نے ان کے ہم مسلک ہونے کے باوجود ان مفتیان کرام کا ذکر انتہائی تمسخر واستہزا کے انداز میں کیا ہے۔ بقول غالب ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

تیسری بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب نے فارس کی حکمران عورت بوران دخت کا سالِ حکمرانی 649ء بتلایا ہے جبکہ نبی ﷺ کا سال وفات 633ء ہے۔ پروفیسر صاحب نے غور نہیں فرمایا کہ کیا یہ عورت نبی ﷺ کی وفات کے 12 سال بعد حکمران بنی تھی؟ پھر نبی ﷺ نے اس عدم فلاح کی خبر کس طرح دی؟ کیا یہی وہ تاریخ دانی ہے جس کی بنیاد پر ایک صحیح اور مسلمہ حدیث کی تکذیب کی سعی کی جارہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی یہ ایک غلطی ہی ان کی ساری تاریخ دانی کا بھرم کھول دیتی ہے اور ان کی تاریخی مثالوں کو مشکوک بنا دیتی ہے۔

بعض مسلمان عورتوں کی حکمرانی کی حقیقت

بہر حال اب پروفیسر صاحب کی اس ''درایت'' پر ہم غور کرتے ہیں جس کی بنا پر انھوں نے مفتیانِ کرام کی رائے کو ''سہو'' پر مبنی قرار دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

''ان مفتیوں کو حدیث مبارکہ کا مفہوم سمجھنے میں سہو ہوا ہے۔ اس حدیث کا جائزہ لینے

سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس کا اطلاق صرف ایران کی ملکہ بوران دخت پر ہوتا ہے اور اسے بوجوہ قاعدہ کلیہ نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ درایت مفتیوں کے فتویٰ کی تائید اور تصویب نہیں کرتی۔''

اس کے بعد انھوں نے ''درایت'' کی تفصیل روس کی ملکہ کیتھرائن، برطانیہ کی ملکہ وکٹوریا اور دیگر بعض حکمران عورتوں کی مثال دے کر بیان کی ہے کہ یہ سب عورتیں نہایت کامیاب حکمران رہی ہیں، اس لیے ان پر عدم فلاح کا اطلاق نہیں ہوسکتا، بنا بریں حدیث زیر بحث کو اگر کلیہ کے طور پر منوانے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے رسول اللہ ﷺ کی صداقت غیر معتبر ٹھہرے گی کیونکہ تاریخ سے اس کے برخلاف عورتوں کی کامیاب حکمرانی کی مثالیں ثابت ہیں۔

اس سلسلے میں ہم عرض کریں گے کہ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جو مثالیں دی گئی ہیں۔ وہ زیادہ تر دور ملوکیت کی دی گئی ہیں، جس کو ہمارے جمہوریت مآب حضرات تسلیم ہی نہیں کرتے۔ بالخصوص اسلامی تاریخ کی جو مثالیں (رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور شاہ جہاں بیگم رئیسہ ریاست بھوپال) دی گئی ہیں، وہ سب ملوکیت کے نتیجے میں برسر اقتدار آئی تھیں، جو ایک تو اضطرار کا نتیجہ تھا کہ خاندان میں اس وقت کوئی اہل مرد نہیں تھا۔ مسلمان شاہی خاندان میں اہل مردوں کی موجودگی میں کہیں بھی کسی عورت کو سربراہ نہیں بنایا گیا ہے جیسا کہ خود پروفیسر صاحب موصوف نے بھی تسلیم کیا ہے:

''رضیہ سلطانہ کے بیس بھائیوں کی موجودگی میں اس کا درویش صفت باپ سلطان شمس الدین التمش یہ کہا کرتا تھا کہ اس کے بیٹے نکمے اور نااہل ہیں اور اس کی بیٹی نظم مملکت چلانے کی پوری طرح اہل ہے۔''[1]

[1] ''ندا'' 13 دسمبر 1988ء۔

کیا سلطان التمش کے اس تبصرے سے، جسے خود پروفیسر صاحب نے نقل فرمایا ہے، ثابت نہیں ہوتا کہ رضیہ سلطانہ کا اقتدار بطور اضطرار اور بہ امر مجبوری تھا۔ بیجاپور اور احمد نگر دکن کی حکمران عورت چاند بی بی کا اقتدار بھی اسی قسم کی اضطراری صورت حال کا نتیجہ تھا۔ چاند بی بی بیجاپور کے حکمران علی عادل شاہ کی ملکہ تھی۔ عادل شاہ ایک سازش کے تحت ہلاک کر دیے گئے، ان کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ وارثوں میں صرف ایک بھتیجا تھا، جس کی عمر 9 سال تھی، اسی کو وارث تخت بنا دیا گیا اور چاند بی بی اس کی نگران مقرر ہوئی۔ چاند بی بی ایک مرتبہ اپنے باپ سین شاہ کی ریاست احمد نگر آئی تو وہاں اس کا اکلوتا بھائی ذہنی امراض کا شکار ہو گیا۔ مجبوراً یہ ریاست بھی چاند بی بی کو سونپ دی گئی اور وہ بیجاپور اور احمد نگر کی مشترکہ حکمران بن گئی۔

والیۂ بھوپال کا معاملہ بھی اضطراری ہے جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ بھوپال کے چھٹے حکمران نواب وزیر محمد خان کے بیٹے نظر محمد خان نے 1816ء میں جانشین بنتے ہی انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا۔ جس کی رو سے انگریزوں نے یہ ذمہ داری قبول کی کہ ریاست بھوپال کا علاقہ اس کے اور اس کی اولاد کے لیے محفوظ رہے گا اور اس دوسرے خاندان میں یہ سلسلہ منتقل نہیں ہوگا جو ریاست کی حکمرانی کا امیدوار تھا اور جس کے بعض افراد اس سے قبل ریاست کے حکمران بھی رہ چکے تھے، نیز ایک موقعے پر ان دونوں خاندانوں میں باہمی جنگ اور خون ریزی بھی ہو چکی تھی۔

اس صلے میں نواب نظر محمد خان نے بطور والئ ریاست بھوپال بعض انگریزی مفادات کے تحفظ کا وعدہ کیا۔

اس معاہدے کی رُو سے اب ریاست کی حکمرانی صرف اسی ایک خاندان میں محصور ہو گئی جس نے انگریزوں سے معاہدہ کیا تھا اور اس مجبوری کی وجہ سے پھر اولاد نرینہ نہ

ہونے کی صورت میں سکندری بیگم، شاہ جہاں بیگم اور سلطان جہاں بیگم بالترتیب حکمران بنیں، پھر جب سلطان جہاں بیگم کے ہاں اولاد نرینہ ہوئی تو ان کے لڑکے نواب حمید اللہ خاں کو ریاست کا ولی عہد قرار دیا گیا۔

اس مقام پر یہ بات بھی خاص طور پر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ نواب سکندری بیگم کے بعد جب ان کی غیر شادی شدہ صاحبزادی شاہ جہاں بیگم کو مسند نشین ریاست تسلیم کیا گیا تو بایں الفاظ ان کو اطلاع دی گئی:

''موافق رسم بھوپال کے نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ کی مسند نشینی اسی طرح منظور ہوئی جس طرح کہ آپ باتفاق رؤساء و امراء بھوپال و رضامندی سرکار انگلشیہ مسند نشین ریاست کی گئی تھیں۔ جس وقت شاہ جہاں بیگم کتخدا (شادی شدہ) ہوں گی، ان کا شوہر رئیس ہوگا۔''[1]

پھر جب موصوفہ شادی کی عمر کو پہنچی اور خاندان میں موزوں اور مناسب رشتے کی تلاش شروع کی گئی تو حکمران خاندان کا کوئی رشتہ پسند نہ آیا اور مجبوراً دوسرے خاندانوں میں رشتے کی تلاش شروع ہوگئی اور کچھ رشتے پسند کیے گئے، ابھی کسی ایک کے بارے میں حتمی فیصلہ بھی نہیں کیا گیا تھا کہ اس سے قبل ہی انگریز گورنمنٹ کو ریاست کی طرف سے حسب ذیل درخواست پیش کی گئی:

''خاندان میں نواب شاہ جہاں بیگم کی شادی کے لائق کوئی نظر نہیں آتا اور جب غیر خاندان میں شادی ہوگی تو نہ معلوم انجام کیا ہو؟ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ریاست نواب شاہ جہاں بیگم کے نام رہے، ان کا شوہر امور ریاست میں بے اختیار ہو، صرف مرتبہ و نام و عزت میں نواب رہے مگر ان سے جو اولاد ہو، وہ مستقل نواب اور مالک قرار پائے۔''[2]

1. حیاتِ شاہ جہانی، ص: 4 2 حیات شاہ جہانی، ص: 6، مطبوعہ آگرہ، 1914ء، مؤلفہ سلطان جہاں بیگم۔

چنانچہ انگریز گورنمنٹ نے اس سے اتفاق کر کے اس کے مطابق عمل درآمد کی یقین دہانی کرائی اور فی الواقع اس کے مطابق ہی عمل ہوا۔ اس لحاظ سے گویا بیگمات بھوپال کی حکمرانی اضطرار در اضطرار کا نتیجہ قرار پاتی ہے۔

علاوہ ازیں بیگمات بھوپال کی مثالیں دینے والوں کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ان بیگمات نے حکمرانی کے باوجود پردے تک کی پابندی سختی کے ساتھ کی تھی بلکہ سلطان جہاں بیگم نے پردے کی حمایت میں ایک پُر زور کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام ''عفت المسلمات'' ہے جس میں پردے کے شرعی احکام، بے پردگی کے نقصانات اور بے پردگی کی حمایت میں پیش کیے جانے والے دلائل کا دندان شکن جواب دیا گیا ہے۔[1]

کیا بیگمات بھوپال کا نام لینے والے حکمران بننے کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والی بیگمات کو بھی پردے کی تاکید فرمائیں گے؟ ایوب خان کے دور میں محترمہ فاطمہ جناح کے صدارتی امیدوار نامزد کرنے سے بھی استدلال کیا جارہا ہے لیکن واقفانِ حال اور خلوتیان راز جانتے ہیں کہ ان کی نامزدگی بھی سن وسال کے علاوہ اضطراری صورت حال ہی کا نتیجہ تھی جیسا کہ اس پر ضروری بحث گزر چکی ہے۔

بہر حال اسلامی تاریخ کے گزشتہ چودہ صد سالہ دور میں عورت کی حکمرانی کی بعض ریاستی دائروں میں جو چند مثالیں ملتی ہیں ان سب کی حکمرانی کسی نہ کسی ''اضطرار'' پر مبنی تھی اور کسی بھی اضطراری صورت سے عام نارمل حالات کے لیے استدلال کرنا صحیح نہیں کیونکہ مسلمہ اصول ہے (الضرورات تبیح المحظورات) ''بعض (اضطراری) ضرورتیں ممنوعات کو بھی جائز کر دیتی ہیں۔'' گویا مذکورہ مثالیں آج کل کی اصطلاح کے مطابق نظریۂ ضرورت کی پیداوار تھیں، جنھیں عام حالات میں بطور مثال اور نمونہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔

---

1 ملاحظہ ہو ''تذکرہ بیگمات بھوپال'' ص: 78,77، دارالاشاعت، لاہور 1932ء۔

دوم: پروفیسر صاحب نے جتنی بھی مثالیں اپنوں اور غیروں کی پیش کی ہیں۔ زمانۂ حال کی چند مثالوں سے قطع نظر، سب کی سب دور ملوکیت کی ہیں، یعنی وہ عورتیں وراثتاً شاہی حکومتوں اور ریاستوں کی حکمران بنی تھیں، جن میں عوام کی رائے کا کوئی دخل نہیں تھا۔سوال یہ ہے کہ یہ لوگ جو آج عورت کی حکمرانی کا جواز چند ملوکانہ مثالوں سے کشید کر رہے ہیں۔کیا وہ ملوکیت کے جواز یا استحسان کے قائل ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو پھر ان کے لیے ان مثالوں سے استدلال کرنے کا جواز کیا ہے؟

رہ گئی مثالیں زمانۂ حال کی، جیسے اندرا گاندھی، مسز بندرانائیکے، بے نظیر بھٹو اور مسز گولڈا میئر وغیرہ۔ یہ مثالیں یقیناً عصر حاضر کی ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ''دور کے ڈھول سہانے'' کے مصداق پروفیسر صاحب کو ان کا دور بڑا کامیاب نظر آیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان ''نیلم پریوں'' کی جمہوری قبا میں دیو استبداد ہی پائے کوب رہا ہے۔ اندرا گاندھی کا دور محض اس لیے کامیاب نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اس کے دور میں ہمیں ہزیمت کا داغ برداشت کرنا پڑا تھا کیونکہ اس میں اس کے ناخن تدبیر کی گرہ کشائی سے زیادہ ہماری اپنی حماقتوں، کوتاہیوں اور بعض طالع آزماؤں کی حد سے زیادہ اقتدار پسندی کا دخل تھا۔ اندرا کا دور ابھی زیادہ پرانا نہیں ہوا۔ ذرا اہل ہند سے اس کی کامیابیوں کی کارگزاریاں جا کر سن لیں اور پھر اس کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کریں۔

بے نظیر بھٹو پاکستان میں دو مرتبہ وزارتِ عظمیٰ کے منصب عالیہ پر براجمان ہوئیں لیکن ان دونوں دوروں میں ملک وقوم کو مہنگائی اور حرماں نصیبی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا، بلکہ ان کی اور ان کے شوہر نامدار کی کرپشن اور لوٹ مار کی داستانیں عام ہیں، جس کا نتیجہ ملک وقوم کو آج بھی بھگتنا پڑ رہا ہے۔

سوم: روس، برطانیہ اور دیگر ممالک کی ملکاؤں کے ادوارِ حکومت کو بھی جو نہایت

کامیاب بتلایا گیا ہے، وہ بھی خلاف واقعہ ہے۔ موصوف نے صرف تصور کا ایک ہی پہلو سامنے رکھا ہے، امید ہے کہ دیگر اہل علم و اہل تاریخ ان ملکاؤں کے ادوار حکومت کی پوری تفصیل اہل ملک کے سامنے پیش کریں گے جس سے ان کے ''روشن اور کامیاب'' ادوار کی حقیقت سامنے آ جائے گی۔

ہمارے سامنے تو اسلامی تاریخ کے جو دو نمونے رضیہ سلطانہ اور چاند بی بی کے ہیں، انھیں عبرت انگیز ہی کہا جا سکتا ہے۔ کامیاب کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اول الذکر کی حکمرانی کو اس کی ریاست کے اکثر امراء ہی نے تسلیم نہیں کیا۔ رضیہ سلطانہ نے انھیں زیر کرنے کی کوشش کی مگر ان کے ہاتھوں شکست کھاتی رہی۔ داروغۂ اصطبل یاقوت حبشی کو دیا جانے والا ''امیر الامراء'' کا خطاب اس کے لیے مزید مصیبت بن گیا۔ بالآخر اس نے ایک بہادر حاکم اختیار الدین التونیہ سے شادی کر کے اپنا اقتدار تسلیم کرانا چاہا مگر وہ اس میں بھی کامیاب نہ ہوئی اور بالآخر التونیہ اور رضیہ دونوں کو قتل کر دیا گیا۔[1]

ثانی الذکر کو بھی مسلسل بغاوت اور سازشوں کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر اپنی فوج کے باغی سپاہیوں کے ہاتھوں ماری گئی۔[2]

البتہ بھوپال کی بعض بیگمات بالخصوص شاہ جہاں بیگم کا دورِ حکومت قدرے کامیاب قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بلاشبہ قانوناً ریاست کی حکمران یہی بیگمات تھیں لیکن ایک تو ان بیگمات نے شریعت کی پابندی سختی کے ساتھ برقرار رکھی حتی کہ پردے تک سے انحراف نہیں کیا، دوسرے اسی شرعی پردے کی پابندی کی وجہ سے اپنے اختیارات کا استعمال وہ زیادہ تر اپنے دیندار مشیروں اور خاوندوں کے ذریعے سے کرتی

---

1 اردو دائرہ معارف اسلامیہ: 10/ 311,310 ، شائع کردہ دانش گاہ، پنجاب اور ''لاہور و تاریخ عالم اسلام'' مؤلفہ محمد عبداللطیف انصاری، المؤتمر الاسلامی، کراچی، ص: 146۔ 2 اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 7/614۔

رہی ہیں۔ شاہ جہاں بیگم کے شوہر اوّل (نواب امراء الدولہ باقی محمد خان) کی وفات تو شاہ جہاں بیگم کی تخت نشینی سے قبل ہی ہوگئی تھی لیکن جب ان کا دوسرا نکاح والا جاہ نواب سید صدیق حسن خان سے ہوا تو نواب صاحب کے ذریعے ہی سے زیادہ اختیارات کا استعمال ہوا، چنانچہ چند تصریحات اس ضمن میں پیش ہیں۔ ''مآثر صدیقی'' کے مصنف لکھتے ہیں:

''رئیسہ عالیہ (شاہ جہاں بیگم) احکام شرع متین کے مطابق ایک پردہ نشین خاتون تھیں اور وسیع رقبۂ مملکت پر حکمران اور کثیر التعداد مخلوق کے سیاہ وسفید کی مالک تھیں، اس لیے ضروری تھا کہ ان کے دست و بازو ایسے مشیران ریاست اور عمال متدین ہوں جو آغاز دور جدید میں اپنی خداداد قابلیت اور دیانت و تدبر اور خدا ترسی اور خدا پرستی سے حسن انتظام ریاست و ترقیٔ مالیات، سرسبزیٔ ملک، رفاہ خلق، تہذیب اخلاق رعایا اور ازدیادِ مراتب ریاست میں کافی امداد و اعانت کرسکیں۔''

اور ان کے شوہر والا جاہ نواب صدیق حسن کے متعلق مصنف مذکور لکھتے ہیں:

''والا جاہ مرحوم ریاست بھوپال میں نہ صرف وزیر بااختیار کی حیثیت رکھتے تھے بلکہ رئیسۂ عالیہ کی اصل منشا اور احکام گورنمنٹ برطانیہ کی تصریح کے مطابق (جن کا حال مطالعۂ واقعات سے ظاہر ہوگا) وہ اپنی تجویز و مشورہ سے رئیسۂ عالیہ کے صدور حکم کے بعد تمام کلًّا و جزءًا انتظامی اور اصلاحی امور ریاست انجام دیتے تھے۔'' [1]

بلکہ نواب سید صدیق حسن خان پر جو الزامات لگائے گئے تھے، جن کی بنا پر انگریزوں نے ان کے تمام خطاب و اعزازات سلب کر لیے تھے، ان میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ انھوں نے رئیسۂ عالیہ شاہ جہاں بیگم کو اپنے حبالۂ عقد میں لینے کے بعد پردہ نشین بنا کر

---

1 مآثر صدیقی: 2/3، طبع نول کشور لکھنو، 1924ء۔

ریاست کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔[1]

پروفیسر صاحب نے اہل حدیث علماء سے نواب صدیق حسن خان کا فتویٰ طلب فرمایا ہے لیکن ہم عرض کریں گے کہ نواب صاحب کا مذکورہ کردار ان کے کسی فتویٰ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ انھوں نے عملاً والیۂ ریاست شاہ جہاں بیگم کے اختیارات حکمرانی خود اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ یقیناً اس میں وہی خیال ورائے کارفرما تھی جس کی رو سے عورت کا مقصد تخلیق سربراہیٔ ریاست سے مختلف ہے اور اگر موصوف کو فتویٰ ہی پر اصرار ہے تو پروفیسر صاحب ﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ﴾ اور آیت ﴿ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ﴾ کی تفسیر میں ان کی عربی تفسیر ''فتح البیان'' اور اردو تفسیر ''ترجمان القرآن'' ملاحظہ فرمالیں جہاں انھوں نے مرد کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے حدیث [لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَّلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً] کا بھی حوالہ دیا ہے۔ (مذکورہ دونوں تفاسیر کے اقتباسات آگے آرہے ہیں)

''فلاح'' محض ظاہری خوشحالی کا نام نہیں ہے

چہارم: پروفیسر موصوف کے مذکورہ خواتین کو کامیاب قرار دینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ''فلاح'' کا مفہوم صرف ظاہری خوش حالی ہی سمجھا ہے درآں حالیکہ ''فلاح'' کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے، نیز اس کا تعلق ظاہر سے کہیں زیادہ باطن سے ہے۔ ظاہری خوش حالی کے باوجود ایک قوم ''ناکام'' قرار دی جاسکتی ہے۔ یورپی حکومتیں اکثر ظاہری لحاظ سے نہایت آسودہ حال ہیں۔ سیاسی واقتصادی استحکام بھی انھیں حاصل ہے لیکن اس کے باوجود عورت کی بے قید آزادی اور ہر شعبۂ زندگی میں مرد و عورت کے دوش بدوش والے نظریے نے جس طرح جنسی انارکی پورے معاشرے میں

1 مآثر صدیقی: 3/73، و''نواب صدیق حسن خان'': 116، مؤلفہ ڈاکٹر رضیہ حامد طبع بھوپال، 1983ء۔

پیدا کر دی ہے اور عائلی نظام کو جس بری طرح برباد کیا ہے۔ کیا مادی خوش حالی اور دنیاوی آسائشوں کی فراوانی اس کا بدل کہلا سکتی ہے؟ اور جس قوم کا عائلی نظام تباہ ہو چکا ہو، بڑھتے ہوئے جرائم نے ہر شخص کو وہاں خوف زدہ کر رکھا ہو اور جنسی ہیجان انگیزی نے وہاں تمام اخلاقی قدروں کو پامال کر دیا ہو۔ کیا اس قوم اور معاشرے کو کامیاب (فلاح یافتہ) کہا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں کہا جا سکتا اور یقیناً نہیں کہا جا سکتا تو کسی بھی دور کی محض ظاہری خوش حالی اور چمک دمک سے اسے ''کامیاب'' قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عام لوگ تو آج بھی یورپی قوم اور معاشرے کو بڑا ''کامیاب'' باور کراتے ہیں لیکن الحمدللہ اہل نظر اور باخبر اہل علم کبھی اس مغالطے کا شکار نہیں ہوئے۔ وہ خوش حالی کے اس ساکن سمندر کی تہہ میں موجود خطرناک موجوں اور اس کی ہلاکت خیزیوں سے آگاہ ہیں۔ وہ مادی خوش حالی کو کامیابی نہیں سمجھتے، اخلاقی اقدار کی سربلندی اور قلب ونظر کی عفت و پاکیزگی کو کامیابی سمجھتے ہیں اور وہ خوف اور دہشت سے بھرپور معاشرے کو کبھی ''فلاح یاب'' ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔

ظاہری خوش حالی بطور ''استدراج'' بھی ہو سکتی ہے

پنجم: قرآن کریم اور فرمان رسول ﷺ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بعض دفعہ بطور استدراج قوموں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ صرف مہلت عمل ملتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ان پر دنیاوی آسائشوں کے دروازے بھی کھول دیتا ہے جس طرح حدیث میں ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

> ''جب تم یہ دیکھو کہ معصیت کاریوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کسی فرد یا قوم کو اس کی خواہش کے مطابق دنیاوی مال و دولت سے نواز رہا ہے تو یہ استدراج (ڈھیل دینا) ہے۔''[1]

پھر آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

[1] مسند أحمد: 145/4.

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓي اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝﴾

''جب وہ لوگ سب باتیں بھلا بیٹھے جن کی ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے۔ یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں کو پا کر اترانے لگے تو ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا۔ تب وہ بالکل ناامید ہو گئے۔''[1]

اس لیے اللہ کی نافرمانیوں کے باوجود اگر کوئی فرد یا قوم ظاہری طور پر پھل پھول رہی ہو تو جلد ہی یہ فیصلہ نہیں کر لینا چاہیے کہ یہ فرد یا قوم تو بہت کامیاب ہے کیونکہ یہ وقتی ظاہری خوش حالی کامیابی کا معیار نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس فرد یا قوم کے لیے مہلت عمل ہو، جس کی بابت نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مہلت کب ختم ہو جائے اور پھر وہ مواخذۂ الٰہی سے دوچار ہو کر نشان عبرت یا داستان پارینہ بن کر رہ جائے۔

اس کی ایک اور مثال سامنے رکھنی چاہیے کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ﴾

''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔''[2]

اس کے ظاہری مفہوم کی رو سے ہونا تو یہ چاہیے کہ سودی کاروبار کرنے والے افراد اور قومیں مادی خوشحالی سے ہمکنار نہ ہوں لیکن ظاہر میں اس کے برعکس ہو رہا ہے۔ سارے یورپ میں سودی نظام ہے لیکن اس کے باجود وہاں دولت دنیا (کم ہونے کے بجائے) خوب فراواں ہے۔ ہمارے ملک میں بھی جو بڑے بڑے لوگ بنکوں سے سودی لین دین کرتے ہیں، وہ سود سے بچنے والوں کی نسبت زیادہ خوش حال ہیں۔ کیا پروفیسر صاحب یہاں بھی اپنی ''درایت'' کا استعمال فرماتے ہوئے یہی ارشاد فرمائیں گے کہ واقعات

1 الأنعام 6:44 . 2 البقرة 2:276 .

سے قرآن کریم کے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی، لہٰذا قرآن کریم کی اس آیت کا تعلق بھی صرف عہد رسالت کے اس معاشرے ہی سے ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا تھا کیونکہ اگر اس کو بطور قاعدۂ کلیہ ہم لیں گے تو قرآن کریم کی تکذیب لازم آئے گی؟ یا موصوف یہاں اس بات کو تسلیم کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا تعلق ظاہری بڑھوتری سے نہیں ہے بلکہ معنوی بڑھوتری اور روحانی برکت سے ہے۔

ہم پروفیسر صاحب سے پوچھتے ہیں کہ یہاں ان کا موقف کیا ہے؟ کیا یہاں اس ''درایت'' کا استعمال صحیح ہے جو آپ نے زیر بحث حدیث کے ردّ کرنے یا اسے محدود کرنے کے لیے استعمال فرمائی ہے یا آپ بھی اس کی وہی توجیہ فرمائیں گے جو ہم نے علمائے کرام کی ہمنوائی کرتے ہوئے مذکورہ سطور میں پیش کی ہے؟ اگر آپ کو اپنی ''درایت'' کی صحت پر اصرار ہے تو پھر اس کی روشنی میں اس آیت کا مفہوم بھی واضح فرمایئے! اور اگر آپ یہاں معنوی فوز و فلاح اور روحانی برکت مراد لیتے ہیں تو یہی مفہوم حدیث [لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً] میں کیوں نہیں لیا جا سکتا؟ علاوہ ازیں اگر ''فلاح'' کا وہی مفہوم صحیح ہے جو پروفیسر صاحب کے ذہن میں ہے تو اس لحاظ سے تو خود بوران دخت کے دور کو بھی ناکام قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس کے دور میں بھی بظاہر عدم فلاح والی بات نظر نہیں آتی۔ 6 مہینے اس کی حکمرانی رہی اور پھر ایک بیماری میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئی۔ بیماری کی وجہ سے فوت ہونے کو ناکامی نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کے باوجود نبی ﷺ نے اس قوم کی فلاح کی نفی فرمائی ہے تو یقیناً اس کے کچھ باطنی اور روحانی اثرات ایسے ہیں جن کا پورا اندازہ ظاہری پیمانوں سے نہیں کیا جا سکتا۔

ایک قطعی الثبوت بات کو کسی مؤرخ کے بیان سے مشکوک نہیں ٹھہرایا جا سکتا

ششم: کسی بھی دور کو کامیاب یا ناکام قرار دینا اتنا آسان نہیں ہے جتنا پروفیسر صاحب

نے سمجھ لیا ہے اور خواتین کے پیش کردہ ادوارِ حکومت کو کامیاب قرار دے دیا ہے۔ موصوف سے زیادہ کون اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اہل تاریخ کے بیانات آپس میں مختلف اور متضاد ہوتے ہیں۔ کوئی کسی عہد کو کامیاب قرار دیتا ہے تو کوئی اور اسی عہد کو ناکام بلکہ بدترین باور کراتا ہے۔ زیادہ دور نہ جائیے۔ اپنی آنکھوں دیکھا دور ہی سامنے رکھ لیجیے۔ کئی لوگ مصر کے جمال عبدالناصر کو اسلام کا ''بطل جلیل'' کہتے ہیں، جبکہ کئی دوسرے اسے اسلام کا دشمن قرار دیتے ہیں۔ کئی لوگ صدر ایوب خان کے دور کو زریں دور باور کراتے ہیں اور کئی دوسرے اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں۔ یہی معاملہ جنرل ضیاء الحق، جناب بھٹو اور دیگر پاکستانی حکمرانوں کے عہد ہائے حکومت کا ہے۔

اس کے کئی اسباب ہیں، بعض دفعہ مؤرخین کے اپنے ذہنی رجحانات ونظریات ہوتے ہیں جو تاریخ میں راہ پا جاتے ہیں اور بعض دفعہ بعد میں برسر اقتدار آنے والے حکمرانوں کے مخصوص مفادات اور پروپیگنڈا اس میں اثر انداز ہوتا ہے۔ بعض دفعہ کچھ اور اسباب اس میں کارفرما ہوتے ہیں، اس لیے کسی بھی تاریخی بیان کو سوفی صد صحیح نہیں سمجھا جا سکتا اور نہ اس کی بنیاد پر کسی قطعی الثبوت بات کو رد ہی کیا جا سکتا ہے۔

کیا موصوف کو پتہ نہیں کہ بنو اُمیہ کا دورِ حکومت (بہ حیثیت مجموعی) تاریخ اسلام کا بہترین دور ہے لیکن مسلم مؤرخین نے اسے کس طرح مسخ کیا ہے؟ ہم پوچھتے ہیں کہ اگر مؤرخین کے بیانات اتنے ہی صحیح اور مقدس ہیں کہ ان کی بنیاد پر قرآن و حدیث کے مسلمات بھی مشکوک قرار پا جائیں تو پھر موصوف کو دور اموی کو بھی تاریخ کا بدترین دور باور کر لینا چاہیے۔ جس طرح کہ ہمارے اکثر مؤرخین یہی کچھ باور کراتے ہیں، موصوف بنی امیہ کے بارے میں مورخین کے مبینہ تأثر کے برعکس کیوں رائے رکھتے ہیں؟ اگر بنو اُمیہ کے بارے میں مؤرخین کی رائے کا تجزیہ کر کے ان کو غلط کہا جا سکتا ہے تو کیا ان

مؤرخین کی رائے کی تغلیط و تردید نہیں کی جا سکتی جنھوں نے خلاف واقعہ مذکورہ خواتین کے عہد ہائے حکومت کو کامیاب قرار دیا ہے؟

استثنائی صورتوں سے اُصول اور کلیہ نہیں ٹوٹتا

ہفتم: یہ مسلمہ بات ہے کہ اصول وکلیات میں بھی استثنائی صورتیں ہوتی ہیں اور ان سے اصول اور کلیہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ کلیہ عموم اور اکثریت کی بنیاد پر ہوتا ہے، اس لیے بعض استثنائی صورتوں سے وہ متأثر نہیں ہوتا، مثلاً: ایک مسلمہ اصول اور کلیہ ہے کہ مرد عورت کے مقابلے میں زیادہ بہادر اور قوی ہے۔ اس کلیے کے برعکس اگر چند عورتیں نسبتاً مردوں سے زیادہ بہادر نکل آئیں تو کیا لاکھوں اور کروڑوں مردوں میں 10-20 عورتوں کے بہادر ہونے سے مردوں کی مردانگی و بہادری والا کلیہ ختم ہو جائے گا؟ نہیں، یقیناً نہیں، اسی طرح اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ پروفیسر صاحب موصوف کی پیش کردہ حکمران خواتین بڑی کامیابی سے حکومت کرتی رہی ہیں، تب بھی ہزاروں اور لاکھوں مرد حکمرانوں کے مقابلے میں ان کامیاب خواتین کا تناسب ہی کیا ہے؟ اس لیے موصوف کی بات ماننے کے باوجود زیر بحث حدیث میں جو کلیہ حکمران عورتوں کی بابت بیان کیا گیا۔ وہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے۔ چند عورتوں کی کامیاب حکمرانی سے یہ کُلّیہ ختم نہیں ہوگا۔ اگر اصول اور کلیے اس طرح ٹوٹنے لگیں جس طرح موصوف نے اس کلیے کے ٹوٹنے کا دعویٰ کیا ہے تو پھر دنیا کا کوئی اصول اور کلیہ بطور اصول اور کلیہ کے باقی ہی نہیں رہے گا کیونکہ بیشتر اصول اور کلیے ایسے ہی ہوتے ہیں جن میں استثنائی صورتیں بھی ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود کلیوں کو کلیہ ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ بعض استثنائی صورتوں سے اس کے ٹوٹنے کا دعویٰ نہیں کیا جاتا۔

عورت کی سربراہی اسلام کی صریح تعلیمات کے خلاف

عورت کی سربراہی کے قائلین نے سارا زور حدیث مذکور کو مشکوک بنانے یا اس کے

معنی و مفہوم کے بدلنے پر صرف کیا ہے اور سمجھ لیا ہے کہ اس کے بعد عورت کی سربراہی کا جواز ہر قسم کے شک وشبہے سے بالا ہو گیا ہے، حالانکہ ان کا ایسا سمجھنا اس وقت تو صحیح ہو سکتا تھا جب تک اس مسئلے میں حدیث مذکور ہی واحد نص ہوتی جبکہ واقعہ یہ ہے کہ عورت کی سربراہی و حکمرانی کا مسئلہ ایسا ہے کہ قدم قدم پر اس کا ٹکراؤ قرآن و حدیث کی واضح نصوص اور اس کی صریح تعلیمات سے ہوتا ہے۔

مثلاً: عورت کی حکمرانی:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ﴾

''مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔''[1]

کے خلاف ہے اور

﴿ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ﴾

''مردوں کو عورتوں پر ایک لحاظ سے برتری حاصل ہے۔''[2]

سے متصادم ہے، نیز

﴿ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ ﴾

''عورتیں اپنے گھروں میں ٹک کر رہیں۔''[3]

کی صریح خلاف ورزی ہے۔

قرآن نے معاشی ذمے داریوں کا کفیل صرف مرد کو بنایا ہے عورت کو اس سے مستثنیٰ رکھا ہے۔ قرآن نے یہ تصریح کر کے کہ ''ہم نے تمام نبی مرد ہی بنائے''[4] یہ واضح کر دیا ہے کہ امامت و قیادت کی قبا مردوں کے قامت زیبا ہی پر راست آتی ہے۔ علاوہ ازیں دیگر دلائل شرعیہ کی رو سے:

- عورت، مردوں کی امامت نہیں کر سکتی، کسی مسجد کی مؤذن یا خطیب نہیں ہو سکتی۔

1 النسآء 4:34. 2 البقرة 2:228. 3 الأحزاب 33:33. 4 الأنبیآء 21:7.

- عورت کسی نکاح میں ولی نہیں بن سکتی حتی کہ خود اس کا اپنا نکاح بھی بغیر ولی کے صحیح نہیں۔
- خلوت میں کسی نامحرم سے ملاقات نہیں کر سکتی۔
- عورت کو جہاد کی ذمے داریوں سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔
- عورت کو اپنی آواز تک کو کنٹرول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔
- کسی بھی موقع پر مرد و عورت کے اختلاط اور بے محابا میل جول یا آپس میں بے باکانہ گفتگو کو پسند نہیں کیا گیا اور اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جن سے مرد و زن کی اس کامل مساوات کی نفی ہوتی ہے جو مغرب کا نظریہ ہے اور جس پر عورت کی سربراہی کی اصل بنیاد قائم ہے۔

کیا ان تعلیمات اور واضح تصریحات کے بعد اس امر میں کوئی شک وشبہ باقی رہ جاتا ہے کہ ایک مسلمان مملکت میں کسی عورت کے سربراہ بننے کی شرعًا کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لیے کسی نام نہاد اسلامی ملک میں کسی خاتون کے اس منصب پر فائز ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب ایسا کرنا جائز ہو گیا ہے۔ قطعاً نہیں، ہرگز نہیں بلکہ مسلمانوں کا عمل و کردار ایک الگ چیز ہے اور قرآن و حدیث کی تصریح ایک شئ دیگر ہے۔ مسلمانوں کے ایک غلط عمل کے اختیار کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اس غلط عمل کو سند جواز مل گئی ہے۔ اس منطق کی رو سے تو پھر تمام ''منکرات'' معروفات میں، سیئات، حسنات میں اور محرمات، حلال میں تبدیل ہو جائیں گے۔

بنا بریں ہم سیاسی دانشوروں سے عرض کریں گے کہ اگر آپ کو ''مغربی جمہوریت'' کا یہ تحفہ اچھا لگتا ہے تو آپ یقیناً اسے پسند فرمائیں لیکن قرآن و حدیث کو بازیچۂ اطفال بنانے سے گریز فرمائیں اور آپ نے اسلام کے ایک مسلمہ اصول کو مشکوک بنانے کے

لیے جو سعی و کاوش فرمائی ہے اور جو دور کی کوڑی آپ لائے ہیں، ہوسکتا ہے کہ بہت سے ''مغربی دانشوروں'' نے اس پر آپ کو خوب داد دی ہو لیکن ہم اپنی گزشتہ گزارشات کے پیش نظر ان سے یہی عرض کریں گے۔

اے اہل نظر! ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

غزوات میں عورتوں کی شرکت کی حقیقت

بعض لوگ اس سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں عورتیں غزوات میں شریک ہوتی رہی ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ عورتیں مردوں کے دوش بدوش سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعض غزوات میں کسی وجہ سے بعض عورتیں اپنے خاوندوں یا بیٹوں یا دیگر عزیزوں کے ساتھ میدان جنگ میں چلی گئیں۔ جس سے ان کا مقصود زخمیوں کی مرہم پٹی، ستو وغیرہ گھول کر پلانا اور تیر پکڑانا تھا۔ اسلامی فوج کے ساتھ ان کی یہ شرکت اس اصول کا نتیجہ ہرگز نہیں تھی کہ عورتوں پر بھی مردوں کی طرح جہاد فرض ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر عورتوں کی شرکت کے واقعات ہی احادیث و سیر کی کتابوں میں نہ ملتے بلکہ ہر غزوے میں مردوں کے دوش بدوش عورتوں کا ذکر بھی ہوتا، نیز عورتوں کو بھی جہاد کی دعوت دی جاتی لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ عام غزوات میں عورتیں شریک نہیں ہوئیں اور نبی ﷺ نے بھی عورتوں کو جہاد میں شریک ہونے کا کبھی حکم نہیں دیا۔ بعض عورتوں نے اجازت مانگی تو آپ نے انھیں اجازت بھی نہیں دی اور انھیں فرمایا کہ تمھارا جہاد حج ہے۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے کبھی بھی عورتوں کو جہاد میں شریک ہونے کا حکم

1 صحیح البخاري، الجهاد والسیر، باب جهاد النساء، حدیث: 2875.

نہیں دیا۔ اگر کسی غزوے میں وہ شریک ہوئی ہیں تو محض اپنے جذبے اور کسی اصول کے بغیر ہوئی ہیں، چنانچہ نبی ﷺ کی عورتوں کے بارے میں ان ہدایات کا نتیجہ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد خیر القرون اور مابعد ادوار میں کسی بھی اسلامی معاشرے میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش نظر نہیں آتیں۔ بالخصوص سیاست و جہانبانی کا شعبہ عورتوں سے بالکل خالی رہا ہے، اس لیے مذکورہ استدلال بھی اپنے اندر کوئی قوت نہیں رکھتا۔

فوجی یا لیگی حکومتوں کا رویہ کوئی شرعی دلیل نہیں

ایک استدلال یہ کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں شروع ہی سے عورتیں ہر شعبے میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لیتی آ رہی ہیں اور ہر حکومت نے اس کی حوصلہ افزائی ہی کی ہے، چاہے وہ لیگی حکومت ہو یا فوجی، اس وقت یہ علماء کہاں تھے؟ اور اب ایک عورت کے سربراہ حکومت بن جانے کو کیوں ناجائز قرار دیا جا رہا ہے؟

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ہر حکومت یہاں مغرب کے نظریۂ مساواتِ مرد و زن کو فروغ اور اس کی ترویج کرتی رہی ہے، بلاشبہ صحیح ہے حتیٰ کہ جنرل ضیاء الحق تک کے گیارہ سالہ دور میں بھی یہ پالیسی نہ صرف برقرار بلکہ روز افزوں رہی ہے اور اس کے بعد مشرف دَور میں تو عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش کرنے کی پالیسی میں بے انتہا اضافہ ہو گیا۔ لیکن یہ کہنا کہ اس وقت علماء کہاں تھے؟ وہ کیوں خاموش رہے؟ یہ تأثر خلاف واقعہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علماء نے ہر دور میں مذکورہ پالیسی کی مذمت ہی کی ہے اس پر خاموش نہیں رہے، وہ اسے برابر ہدفِ تنقید بناتے رہے ہیں لیکن

کون سنتا ہے فغان درویش

کے مصداق ان کی آواز صدا بصحرا ہی ثابت ہوتی رہی ہے، اس لیے علماء کو مطعون

کرنا صحیح ہے نہ گزشتہ حکومتوں کی پالیسیوں کو بطور حجت پیش کرنا درست ہے کیونکہ ان کا عمل شرعی دلیل نہیں ہے اور علماء کی بابت یہ کہنا کہ وہ خاموش رہے، واقعات کے خلاف ہے۔

آئین میں ترمیم کی ضرورت

بہر حال ہم پھر عرض کریں گے کہ قرآن وحدیث کی واضح نصوص کی رو سے عورت کا دائرۂ عمل گھر سے باہر نہیں۔ صرف گھر کے دائرے تک محدود ہے اور عارضی اور اضطراری صورتوں کے علاوہ عورتوں کا ہر شعبۂ زندگی میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لینا کسی طرح بھی اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ حکومتوں کا عمل چاہے کچھ بھی رہا ہو، ان کی کج فکریوں کی وجہ سے اسلام کا مسلمہ اصول نہیں ٹوٹ سکتا۔ بنابریں ہم حکومت سے بالخصوص اپیل کریں گے کہ وہ عورتوں کے بارے میں از سرنو پالیسی وضع کرے اور اسے اسلامی اصولوں پر استوار کرے اور مغرب کی پیروی ونقالی سے اجتناب کرے، نیز آئین میں وزارتِ عظمیٰ وصدارت وغیرہ کلیدی مناصب کے لیے مسلمان مرد کی وضاحت کی بھی ضرورت ہے۔

حدیث ابی بکرہ رضی اللہ عنہ کو موضوع ثابت کرنے کے لیے ایک اور مفروضہ اور اس کی حقیقت

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حدیث: [لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً] موضوع ہے، اس لیے کہ اس حدیث کے راوی حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ ہیں، جو طائف کے محاصرہ کے دوران مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور ایران کی ملکہ اس سے کافی عرصہ پہلے تخت شاہی پر بیٹھی تھی، یعنی یہ حدیث تو کسی ایسے صحابی سے مروی ہونی چاہیے تھی جو اس وقت سے پہلے مسلمان ہو چکا ہوتا، جب ملکہ حکمران بنتی اور پھر جب ان کی تخت نشینی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو

معلوم ہوتی تو آپ یہ فرماتے لیکن راوی کافی عرصہ بعد مسلمان ہوا، لہٰذا انھوں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہی نہیں۔

مغالطۂ مذکورہ کی وضاحت

یہ دعویٰ کرنا کہ ایران کی ملکہ کی تخت نشینی کا واقعہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے مشرف بہ اسلام ہونے سے کافی عرصہ قبل کا ہے، صحیح نہیں کیونکہ

① محاصرۂ طائف، جس میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے۔ 8 ہجری کا واقعہ ہے اور ملکۂ فارس کا واقعہ بھی 8 ہجری ہی کا ہے، کسریٰ (شاہ فارس) کا اپنے بیٹے (شیرویہ) کے ہاتھوں قتل ہونے کا واقعہ بقول واقدی 10 جمادی الآخرۃ 7 ھ میں پیش آیا ہے۔[1]

اس کے بعد اس کا قاتل بیٹا (شیرویہ) تخت فارس پر متمکن ہوا۔ اس کا اقتدار چھ مہینے رہا، پھر بیمار ہو کر مر گیا۔ اس کے بعد بوران دُخت بنت کسریٰ حکمران بنی جو تاریخی اعتبار سے 8 ہجری ہی کا واقعہ بنتا ہے، پھر کچھ عرصہ رسول اللہ ﷺ تک اس خبر کے پہنچنے میں بھی یقیناً لگا ہوگا۔ بنا بریں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کا اس حدیث کے سماع میں کوئی ایسا اشکال نہیں رہتا کہ جس کی بنیاد پر اس حدیث کو ردّ کیا جا سکے۔

② دوسرے، مسند احمد کی روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ جب عورت کے حکمران بننے کی خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچائی گئی تو اس وقت آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھے اور آپ نے عورت کی اطاعت کو مردوں کی ہلاکت کا باعث بتلایا۔[2]

جس کا مطب یہ ہوا کہ عورت کی حکمرانی کی بابت جو وعید نبی ﷺ نے بیان فرمائی وہ حضرت عائشہ کی موجودگی میں فرمائی تھی، پھر جب جنگ جمل کے موقع پر حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کے حوالے سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عدم تعاون کا فیصلہ کیا تو

1 ملاحظہ ہو، البداية والنهاية: 270/3 . 2 ملاحظہ ہو، الفتح الرباني: 35/23 .

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس حدیث پر کوئی نکیر نہیں کی۔ علاوہ ازیں اور کسی بھی صحابی نے اس کا انکار نہیں کیا۔ یوں گویا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سمیت اصحاب رسول نے اس حدیث کی صحت میں کوئی شک نہیں کیا بلکہ سب نے اسے تسلیم کیا، اس لیے اس روایت کو اس بنا پر ردّ کر دینا کہ حضرت ابوبکرہ کے سوا اسے کوئی اور روایت کرنے والا نہیں، سراسر غیر معقول رویہ ہے کیونکہ جنگ جمل میں اس روایت کی بازگشت نے اس روایت کو متعارف کروا دیا تھا اور اس پر کسی بھی طرف سے نکیر نہ ہونے کی وجہ سے اس پر گویا صحابہ رضی اللہ عنہم کا اتفاق ہو گیا۔

③ تیسرے، مجمع الزوائد میں طبرانی کے حوالے سے حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت جابر بن سمرہ سے بھی بایں الفاظ ایک روایت مروی ہے۔ [لَنْ يُّفْلِحَ قَومٌ يَّمْلِكُ رَأْيَهُمُ امْرَأَةٌ] ''وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جن کی رائے کی مالک ایک عورت ہے۔''[1]

اس کے بارے میں حافظ ہیثمی نے یہ کہا ہے کہ اس میں ایک راوی طبرانی کے شیخ ابو عبیدہ عبدالوارث بن ابراہیم ہیں جنھیں میں نہیں جانتا، تاہم ان کے علاوہ...... اس کے بقیہ رجال ثقات ہیں لیکن طبرانی کے غیر معروف مشائخ کے بارے میں حافظ ہیثمی کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ثقہ ہیں۔[2]

اس لحاظ سے یہ روایت سندًا صحیح قرار پاتی ہے، تاہم اگر ضعیف تسلیم کر لیا جائے تب بھی بطور شاہد اور تائید کے طبرانی کی مذکورہ روایت قابل قبول ہو گی۔

④ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی روایت مسند احمد، ترمذی، نسائی وغیرہ کے علاوہ صحیح بخاری میں دو جگہ آئی ہے، اس لیے اہل سنت کے نزدیک صحیح بخاری کی یہ روایت شک وشبہ سے بالا ہے، تاہم مذکورہ وجوہ کے بعد تو اس کی صحت میں اب ان حضرات کے لیے بھی شک کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے جو اس حدیث صحیح کو رد کرنے کے لیے دور دور کی

1 مجمع الزوائد: 209/5، طبع قدیم۔ 2 ملاحظہ ہو، مقدمہ مجمع الزوائد: 8/1.

کوڑی لا رہے ہیں۔

نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ کی صراحت

ایک صاحب نے ہمیں ایک خط تحریر کیا ہے اور اس میں انھوں نے مطالبہ کیا ہے کہ ''نواب صدیق حسن خان قنوجی کا فتویٰ فراہم کرنا اہل حدیث کے ذمے ہے، اہل حدیث یہ بتائیں کہ نواب صاحب نے عورت کی حکمرانی کو کہاں حرام کہا ہے؟''

اس مطالبے سے موصوف کا مطلب اگر یہ ہے کہ لفظ ''حرام'' کی نشاندہی کی جائے تو شاید ہم یہ لفظ اسی طرح دکھانے سے معذور ہوں جس طرح شراب کو حلال باور کرانے والے ''جدید مجتہدین'' کے مطالبے پر، کہ قرآن میں شراب کو ''حرام'' کہاں کہا گیا ہے؟ علماء لفظ ''حرام'' دکھانے سے معذور ہیں، تاہم اگر موصوف کا مطلب عورت کی سربراہی کی شرعی حیثیت کی وضاحت ہے تو اس کے لیے ہم پہلے ہی ان کی عربی اور اردو دونوں تفاسیر کا حوالہ پیش کر چکے ہیں، تاہم مزید اتمام حجت کے لیے ان کی تفاسیر کی اصل عبارتیں اور ان کی ایک اور کتاب سے اس کی صراحت ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ.

نواب صاحب کی ایک عربی کتاب کا اقتباس اور اس کا ترجمہ:

«وَمِنْهَا كَوْنُهُ ذَكَرًا، وَوَجْهُهُ أَنَّ النِّسَاءَ نَاقِصَاتُ عَقْلٍ وَدِينٍ، كَمَا قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، وَمَنْ كَانَ كَذٰلِكَ لَا يَصْلُحُ لِتَدْبِيرِ الْأُمَّةِ وَلِتَوَلِّي الْحُكْمِ بَيْنَ عِبَادِ اللهِ، وَفَصْلِ خُصُومَاتِهِمْ بِمَا تَقْتَضِيهِ الشَّرِيعَةُ الْمُطَهَّرَةُ وَيُوجِبُهُ الْعَدْلُ، فَلَيْسَ بَعْدَ نُقْصَانِ الْعَقْلِ وَالدِّينِ شَيْءٌ وَلَا تُقَاسُ الْإِمَامَةُ وَالْقَضَاءُ عَلَى الرِّوَايَةِ فَإِنَّهَا تَرْوِي مَا بَلَغَهَا وَتَحْكِي مَا قِيلَ لَهَا، وَأَمَّا

الْإِمَامَةُ وَالْقَضَاءُ فَهُوَ يَحْتَاجُ إِلَى اجْتِهَادِ الرَّأْيِ وَكَمَالِ الْإِدْرَاكِ وَالتَّبَصُّرِ فِي الْأُمُورِ وَالتَّفَهُّمِ لِحَقَائِقِهَا، وَلَيْسَتِ الْمَرْأَةُ فِي وِرْدٍ وَّلَا صَدْرٍ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا تَقْوَى عَلٰى تَدْبِيرِ أَمْرِ الْعِبَادِ وَالْبِلَادِ، بَلْ هِيَ أَضْعَفُ مِنْ ذٰلِكَ وَأَعْجَزُ، وَيُؤَيِّدُ هٰذَا مَا ثَبَتَ فِي الصَّحِيحِ لِلْبُخَارِيِّ مِنْ حَدِيثِ أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ مِنْ قَوْلِهِ ﷺ: لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً، قَالَهُ لَمَّا بَلَغَ أَنَّ أَهْلَ فَارِسَ قَدْ مَلَّكُوا عَلَيهِمْ بِنْتَ كِسْرٰى، يَعْنِي بُورَانَ بِنْتَ شِيرُوَيْهِ بْنِ كِسْرٰى، فَلَيْسَ بَعْدَ نَفْيِ الْفَلَاحِ شَيْءٌ مِنَ الْوَعِيدِ الشَّدِيدِ وَرَأْسُ الْأُمُورِ هُوَ الْإِمَامَةُ، وَالْقَضَاءُ وَبِحُكْمِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ فَدُخُولُهُ فِيهَا يَكُونُ دُخُولًا أَوَّلِيًّا»

”حکمران کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ مرد ہو کیونکہ عورتیں عقل اور دین میں ناقص ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے اور جو عقل و دین میں ناقص ہو وہ تدبیر امت، فصل خصومات اور اللہ کے بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کی اس طرح اہلیت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا جو شریعت الٰہیہ کا اقتضا اور عدل و انصاف کے لحاظ سے ضروری ہے، پس عقل و دین میں نقصان کے بعد کچھ نہیں۔

علاوہ ازیں امامت (حکمرانی) اور قضا کو روایت (حدیث رسول بیان کرنے) پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ روایت میں تو عورت وہی کچھ بیان کرتی ہے جو اسے پہنچتا ہے اور وہی کچھ نقل کرتی ہے جو اس سے کہا گیا ہوتا ہے لیکن حکمرانی

اور قضا کا مسئلہ اس سے بالکل مختلف ہے، اس کے لیے تو اجتہادِ رائے، کمال ادراک، معاملات میں گہری بصیرت اور حقائق تک پہنچنے کے لیے قوت فہم نہایت ضروری ہیں، جبکہ عورت ان خوبیوں سے متصف ہے نہ وہ بندوں اور شہروں کے معاملات کی تدبیر کی قوت رکھتی ہے بلکہ وہ ان امور میں نہایت کمزور اور حد درجہ عاجز ہے۔ اس کی تائید صحیح بخاری کی اس حدیث ابی بکرہ رضی اللہ عنہ سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہیں ہوگی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کر دیے۔'' یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ارشاد فرمائی تھی جب آپ کو یہ خبر پہنچی کہ اہل فارس نے اپنا حکمران بنت کسریٰ، یعنی بوران بنت شیرویہ بن کسریٰ کو بنالیا ہے۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسی قوم سے فلاح کی نفی کر دینا بہت شدید وعید ہے اور معاملات کی اصل بنیاد اللہ کے حکم کے مطابق امامت وقضا ہی ہے، پس یہ معاملہ اس میں سب سے پہلے داخل ہوگا۔''

اردو تفسیر ''ترجمان القرآن'' میں وضاحت

نواب صاحب اپنی اردو تفسیر ''ترجمان القرآن'' میں آیت ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾[1] کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''مردوں کو عورتوں پر درجہ حاصل ہے، یعنی خلق وخلق میں فضیلت رکھتے ہیں۔ منزلت وطاعت۔ امر وانفاق وقیام مصالح میں بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ اہل جہاد وعقل وقوت ہیں۔ ان کا حصہ میراث میں دوگنا ہے۔ ان کی اطاعت عورت پر واجب ہے، عورت موافق ان کی رضا مندی کے رہے سہے۔ گواہی، ولایت، صلاحیت، امامت وقضا میں بھی

[1] البقرة 228:2.

مقدم ہیں۔ یہ ایک عورت پر دوسری، تیسری، چوتھی جورو اور بے گنتی لونڈیاں لا سکتے ہیں۔ عورت دوسرا شوہران کی موجودگی میں نہیں کرسکتی۔ طلاق و رجعت بھی انھیں کے ہاتھ میں ہے نہ عورت کے۔ اگر اور کچھ فضیلت مرد کو عورت پر نہ ہوتی تو یہ کیا کم بزرگی ہے کہ عورت مرد سے پیدا ہوئی ہے کیونکہ پیدا ہونا حوا علیہا السلام کا آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے ثابت ہو چکا

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴾

اطلاق فضیلت مفید عموم ہے۔[1]

اور آیت:﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ﴾ کے تحت فرماتے ہیں۔

”یعنی اللہ نے مرد کا درجہ اوپر بنایا تو عورت کو اس کی حکم برداری چاہیے اور اگر ایک عورت بدخوئی کرے تو مرد پہلے درجے سمجھائے دوسرے درجے جدا سووے لیکن اسی گھر میں، پھر آخر درجے مارے بھی لیکن نہ ایسا کہ ضرب پہنچے، پھر اگر مطیع ہو جاوے تو کرید نہ کرے تقصیروں پر اللہ سب پر حاکم ہے۔ باقی ہر تقصیر کی ایک حد ہے، مارنا آخر کا درجہ ہے۔

ف: اللہ نے اس آیت میں یہ ارشاد کیا کہ مرد عورت پر قیم ہے، یعنی اس کا رئیس کبیر حاکم مؤدِب ہے جب عورت کج روی کرے، یہ اس کو ادب دے، اس لیے کہ مرد افضل ہیں عورتوں سے، اسی لیے نبوت مختص ہے ساتھ رجال کے، بادشاہئ اعظم خاص ہے ساتھ مردوں کے [لِقَوْلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً][1] اسی طرح منصب قضا وغیرہ مخصوص ہے ساتھ مردوں کے۔ علاوہ اس کے مرد اپنا مال عورت پر صرف کرتے ہیں جیسے مہور و نفقات وغیرہ۔ حقوق جو کتاب و سنت میں آئے ہیں، اس لیے مرد فی نفسہٖ عورت سے افضل ہے، فضل و افضال میں اس پر مقدم ہے۔ اسی

---

1 رواه البخاري من حديث ابي بكرة رضی اللہ عنہ.

سبب سے قیم ہونا مرد کا مناسب ٹھہرا۔ کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا مراد ﴿قَوّٰمُوْنَ﴾ سے امراء ہیں، یعنی عورت کو لازم ہے کہ جس امر میں اللہ نے اطاعت مرد کا حکم اسے دیا ہے اس امر میں اس کی مطیع رہے۔ اطاعت یہ ہے کہ گھر والوں سے نیکی کرے۔ شوہر کی نگہبان ہو۔ یہی قول ہے مقاتل، سدی وضحاک کا۔"[1]

آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:

"فتح البیان کا بیان ہے کہ مرد مسلط ہیں عورتوں پر، یعنی جس طرح حکام و امراء حفاظت رعیت کرتے ہیں اسی طرح مرد عورت کا نگہبان ہوتا ہے، پھر علاوہ اس کے گھر بار روٹی، کپڑا دیتا ہے قوام صیغہ ہے مبالغے کا۔ اس میں بیان دلیل ہے اس بات پر کہ مرد اصل میں اس کام میں قائم ہیں ساتھ مصالح و تدبیرات خانگی و تادیب کے، جس طرح کہ بادشاہ رعیت کے کاموں پر قائم و دائم ہوتے ہیں۔ یہ فضیلت مردوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہے۔ انبیاء و خلفاء و سلاطین و حکام و ائمہ و غزاۃ سب مرد ہی ہوتے ہیں۔ عقل و دین و شبہات و جمعہ و جماعت میں عورت سے بڑھ کر ہیں۔ مرد چار جورو کر سکتا ہے، عورت ایک شوہر سے زیادہ نہیں کر سکتی، مرد کا حصہ میراث میں زیادہ ہے، طلاق و رجعت ہاتھ میں مرد کے ہے، نسب باپ کا ہوتا ہے نہ ماں کا۔ ان کے سوا اور بہت امور ہیں جن میں مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے۔"[2]

عربی تفسیر "فتح البیان" میں صراحت

عربی تفسیر میں مسئلہ زیر بحث میں ان کی صراحت حسب ذیل ہے:[3]

﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ أَيْ مَنْزِلَةٌ لَيْسَتْ لَهُنَّ وَهِيَ قِيَامُهُ

[1] تفسیر ترجمان القرآن: 642:2۔ [2] تفسیر ترجمان القرآن: 644/2۔ [3] فتح البیان: 323,322/1۔

عَلَيْهَا فِي الْإِنْفَاقِ وَكَوْنُهُ مِنْ أَهْلِ الْجِهَادِ وَالْعَقْلِ وَالْقُوَّةِ، وَلَهُ مِنَ الْمِيرَاثِ أَكْثَرُ مِمَّا لَهَا، وَكَوْنُهُ يَجِبُ عَلَيْهَا امْتِثَالُ أَمْرِهِ وَالْوُقُوفُ عِنْدَ رِضَاهُ وَالشَّهَادَةُ وَالدِّيَةُ وَصَلَاحِيَّةُ الْإِمَامَةِ وَالْقَضَاءِ، وَلَهُ أَنْ يَتَزَوَّجَ عَلَيْهَا وَيَتَسَرَّى، وَلَيْسَ لَهَا ذٰلِكَ، وَبِيَدِهِ الطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ وَلَيْسَ شَيْءٌ مِّنْ ذٰلِكَ بِيَدِهَا، وَلَوْ لَمْ يَكُنْ مِنْ فَضِيلَةِ الرِّجَالِ عَلَى النِّسَاءِ إِلَّا كَوْنُهُنَّ خُلِقْنَ مِنَ الرِّجَالِ لِمَا ثَبَتَ أَنَّ حَوَّاءَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعِ اٰدَمَ لَكَفٰى، وَقَدْ أَخْرَجَ أَهْلُ السُّنَنِ عَنْ عَمْرِو بْنِ الْأَحْوَصِ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: أَلَا إِنَّ لَكُمْ عَلٰى نِسَاءِكُمْ حَقًّا، وَلِنِسَاءِكُمْ عَلَيْكُمْ حَقًّا، فَأَمَّا حَقُّكُمْ عَلٰى نِسَائِكُمْ فَلَا يُوطِئْنَ فُرُشَكُمْ مَنْ تَكْرَهُونَ، وَلَا يَأْذَنَّ فِي بُيُوتِكُمْ لِمَنْ تَكْرَهُونَ أَلَا وَحَقُّهُنَّ عَلَيْكُمْ أَنْ تُحْسِنُوا إِلَيْهِنَّ فِي كِسْوَتِهِنَّ وَطَعَامِهِنَّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَصْلُهُ عِنْدَ مُسْلِمٍ فِي الصَّحِيحِ وَأَخْرَجَ أَحْمَدُ وَأَبُودَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَابْنُ جَرِيرٍ وَالْحَاكِمُ وَصَحَّحَهُ وَالْبَيْهَقِيُّ عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ حَيْدَةَ الْقُشَيْرِيِّ: أَنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ مَا حَقُّ الْمَرْأَةِ عَلٰى الزَّوْجِ قَالَ أَنْ تُطْعِمَهَا إِذَا طَعِمْتَ، وَتَكْسُوهَا إِذَا اكْتَسَيْتَ وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلَا تَهْجُرْ إِلَّا فِي الْبَيْتِ، وَعَنِ ابْنِ أَبِي ظِبْيَانَ أَنَّ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ خَرَجَ فِي غَزَاةٍ بَعَثَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِيهَا ثُمَّ رَجَعَ فَرَأٰى رِجَالًا يَسْجُدُ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ، فَذَكَرَ ذٰلِكَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ فَقَالَ: لَو أَمَرْتُ أَحَدًا أَنْ يَّسْجُدَ لِأَحَدٍ

لَأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا، رَوَاهُ الْبَغَوِيُّ بِسَنَدِهِ»

اور آیت: ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ کے تحت فرماتے ہیں:[1]

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ﴾ مُسَلَّطُونَ ﴿عَلَى النِّسَآءِ﴾ كَلَامٌ مُسْتَأْنِفٌ سِيقَ لِبَيَانِ سَبَبِ اسْتِحْقَاقِ الرِّجَالِ الزِّيَادَةَ فِي الْمِيرَاثِ تَفْصِيلًا إِثْرَ بَيَانِ تَفَاوُتِ اسْتَحْقَاقِهِمْ إِجْمَالًا، وَعُلِّلَ ذٰلِكَ بِأَمْرَيْنِ، أَوَّلُهُمَا: وَهْبِيٌّ، وَالثَّانِي: كَسْبِيٌّ، وَالْمَعْنٰى أَنَّهُمْ يَقُومُونَ بِالذَّبِّ عَنْهُنَّ كَمَا يَقُومُ الْحُكَّامُ وَالْأُمَرَاءُ بِالذَّبِّ عَنِ الرَّعِيَّةِ، وَهُمْ أَيضًا يَقُومُونَ بِمَا يَحْتَجْنَ إِلَيهِ مِنَ النَّفَقَةِ وَالْكِسْوَةِ وَالْمَسْكَنِ، وَجَاءَ بِصِيغَةِ الْمُبَالَغَةِ لِتَدُلَّ عَلٰى إِصَالَتِهِمْ فِي هٰذَا الْأَمْرِ وَهُوَ جَمْعُ قَوَّامٍ وَهُوَ الْقَائِمُ بِالْمَصَالِحِ وَالتَّدْبِيرِ وَالتَّأْدِيبِ، يُشِيرُ بِهِ إِلٰى أَنَّ الْمُرَادَ قِيَامُ الْوُلَاةِ عَلَى الرِّعَايَا قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: أُمِّرُوا عَلَيْهِنَّ فَعَلَى الْمَرْأَةِ أَنْ تُطِيعَ زَوْجَهَا فِي طَاعَةِ اللهِ، ﴿بِمَا﴾ اَلْبَاءُ، سَبَبِيَّةٌ، وَ(مَا) مَصْدَرِيَّةٌ ﴿فَضَّلَ اللّٰهُ﴾ وَالضَّمِيرُ فِي قَولِهِ ﴿بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ لِلرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ أَيْ إِنَّمَا اسْتَحَقُّوا هٰذِهِ الْمَزِيَّةَ لِتَفْضِيلِ اللهِ إِيَّاهُمْ عَلَيهِنَّ بِمَا فَضَّلَهُمْ بِهِ مِنْ كَونِ فِيهِمُ الْأَنْبِيَاءُ وَالْخُلَفَاءُ وَالسَّلَاطِينُ وَالْحُكَّامُ وَالْأَئِمَّةُ وَالْغُزَاةُ، وَزِيَادَةُ الْعَقْلِ وَالدِّينِ وَالشَّهَادَةُ وَالْجُمُعَةُ وَالْجَمَاعَاتُ، وَأَنَّ الرَّجُلَ يَتَزَوَّجُ بِأَرْبَعِ نِسْوَةٍ وَلَا يَجُوزُ لِلْمَرْأَةِ غَيرُ زَوْجٍ وَاحِدٍ، وَزِيَادَةُ النَّصِيبِ وَالتَّعْصِيبُ فِي

1 فتح البيان: 67/2.

الْمِيرَاثِ وَبِيَدِهِ الطَّلَاقُ وَالنِّكَاحُ وَالرَّجْعَةُ وَإِلَيْهِ الْاِنْتِسَابُ، وَغَيْرُ ذٰلِكَ مِنَ الْأُمُورِ فَكُلُّ هٰذَا يَدُلُّ عَلَى فَضْلِ الرِّجَالِ عَلَى النِّسَاءِ»

عربی تفسیر کی مذکورہ دونوں عبارتوں کا وہی مفہوم ہے جو انھوں نے اردو تفسیر میں بیان کیا ہے اور پہلے نقل کیا جا چکا ہے، اس لیے ان عربی عبارات کے ترجمہ کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

بہر حال نواب صدیق حسن خان کی ان واضح تصریحات کے بعد اس امر میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہ جاتا ہے کہ نواب صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک بھی عورت امامت کبریٰ (حکمرانی) کی اہل نہیں ہے، اس معاملے میں بھی مرد کو بعض دیگر امتیازی خوبیوں کے ساتھ عورت پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے۔

اسلامی مملکت میں خاتون کی حکمرانی، کسی طور جائز نہیں

شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ

سوال اگر کوئی خاتون ملک کی وزیراعظم، وزارت یا کسی اور بڑے منصب کے لیے بنفس نفیس خود کو پیش کرے تو شرع اسلامی کا اس سلسلے میں کیا موقف ہے۔ ازراہ کرم جواب دے کر ممنون فرمائیں؟

جواب کسی خاتون کا ملک کا وزیراعظم بننا یا بنایا جانا یا کسی اور بڑے منصب پر تعین، اسلام میں جائز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم، سنت نبی کریم ﷺ اور اجماع کی وضاحتیں بصراحت موجود ہیں۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ اس آیت میں حکم عام ہے۔ مرد کو اللہ تعالیٰ نے قوام بنایا ہے۔ خاندان میں بھی، ریاست میں بھی، اس آیت کریمہ سے صاف واضح ہے کہ مرد کو اللہ تعالیٰ نے عورت پر افضلیت عطا فرمائی ہے۔ اس میں عقل کی، رائے کی اور ہر طرح کی افضلیت شامل ہے۔

اور حدیث نبوی ﷺ سے ہمیں بخاری شریف کی یہ حدیث ملتی ہے کہ ''وہ قوم تباہ و برباد ہوئی جس نے عورت کو اپنا حاکم اور سربراہ بنایا۔'' اس حدیث صحیح کے بعد اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ کسی خاتون کو صاحب امر بنانا یا اس کی تولیت میں مملکت کی زمام کار دے دینا احکام رسول کریم ﷺ کی کتنی بڑی خلاف ورزی اور جسارت کی بات ہے۔ اس

حدیث کی خلاف ورزی میں کئی ایسی حدیثوں کا متن بھی شامل ہو جاتا ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ جانتے بوجھتے سنت رسول کا بطلان کفر کی حدوں تک پہنچتا ہے اور صورت حال سے واقف ہونے کے بعد کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ احکام رسول کی خلاف ورزی کرے۔

اجماع کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد کی تین صدیوں تک علمائے کرام کا عمل یہ رہا کہ کسی خاتون کو امارت یا عہدۂ قضا پر مامور نہیں کیا گیا۔ اس دور کی خواتین میں اکثر ایسی تھیں جنھوں نے کتاب و سنت کی روشنی میں خود اس بات کی وضاحت فرمائی کہ خواتین کے لیے یہ مناصب مناسب نہیں ہیں۔

اس کے علاوہ بھی شرعی احکام واضح ہیں۔ حکام وقت کا بیشتر وقت دیگر مردوں اور اعمال حکومت سے گفت و شنید، دوروں، ملاحظوں، افواج کی قیادت و اجتماعات میں شرکت اور ان کی رہبری و رہنمائی اور خطبات و تقاریر میں گزرتا ہے۔ انھیں دیگر ممالک کے دورے بھی کرنے ہوتے ہیں۔ مختلف ممالک سے پیکٹ (Pact) ہوتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے صدور و وزراء اور سفراء سے معانقے، دعوتیں، غرض ایسے بے انتہا کام ہیں جن میں وزیر اعظم، صدر مملکت یا ملک کے اہم مناصب پر فائز لوگوں کو دن رات مشغول رہنا ہوتا ہے، اس لیے دینی، عقلی اور علمی کسی طرح مناسب نہیں کہ کسی خاتون یا خواتین کو ایسے مناصب دیے جائیں جو ان کے لیے مناسب نہیں ہیں۔

مزید برآں اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی عقل کی روشنی میں بھی یہ بات بالکل واضح ہے کہ عورت کے مقابلے میں مرد کی عقل، فہم، حسن تدبیر اور دیگر سارے قوائے جسمانی زیادہ بہتر ہیں، لہٰذا ملک کے متذکرہ بالا اعلیٰ مناصب کے لیے مرد ہی زیادہ مناسب ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں دین حنیف اور سنت رسول ﷺ کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔[1]

1 عربی مجلّہ "المجتمع" کویت سے تلخیص و ترجمہ۔ بشکریہ ہفت روزہ "تکبیر" کراچی۔

عورت کی سربراہی کے عدم جواز پر امت کا اجماع ہے

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی

قرآن وسنت کے دلائل کی وجہ سے چودہ صدیوں کے ہر دور میں امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع رہا ہے کہ اسلام میں سربراہ حکومت کی ذمّے داری کسی عورت کو نہیں سونپی جاسکتی اور اجماع امت شریعت کی ایک مستقل دلیل ہے۔

اجماع کے ثبوت کے لیے ابن حزم رحمہ اللہ کی یہ تحریر بڑی واضح ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

«وَاتَّفَقُوا أَنَّ الْإِمَامَةَ لَا تَجُوزُ لِامْرَأَةٍ»

''اس بات پر تمام علماء متفق ہیں کہ حکومت کی سربراہی کا منصب کسی عورت کے لیے جائز نہیں ہے۔''[1]

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ جیسے باخبر عالم نے "نقد مراتب الإجماع" کے نام سے علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کی مذکورہ کتاب پر ایک تنقید لکھی ہے اور بعض ان مسائل کا ذکر فرمایا جنھیں علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے اجماعی قرار دیا ہے لیکن علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق وہ اجماعی نہیں ہیں بلکہ ان میں کسی نہ کسی کا اختلاف موجود ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے بھی عورت کی سربراہی کے مسئلے میں علامہ ابن حزم رحمہ اللہ پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔[2]

---

1 مراتب الإجماع، ص: 129. 2 دیکھیے نقد مراتب الإجماع، ص: 126.

ان حضرات کے علاوہ جن علماء وفقہاء اور اسلامی ریاست کے ماہرین نے اسلام کے سیاسی نظام پر کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے ہر ایک نے اس مسئلے کو ایک متفقہ مسئلے کے طور پر ذکر کیا ہے۔

علامہ ماوردی رحمہ اللہ کی کتاب اسلامی سیاست کا اہم ترین ماخذ سمجھی جاتی ہے۔ اس میں انھوں نے حکومت کی سربراہی تو کجا، عورت کو وزارت کی ذمہ داری سونپنا بھی ناجائز قرار دیا ہے بلکہ انھوں نے وزارت کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک وزارت تفویض، جس میں پالیسی کا تعین بھی وزیر کا کام ہوتا ہے اور دوسری وزارتِ تنفیذ، جو پالیسی کا تعین نہیں کرتی بلکہ طے شدہ پالیسی کو نافذ کرتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وزارتِ تنفیذ میں اہلیت کی شرائط وزارت تفویض کے مقابلے میں کم ہیں۔ اس کے باوجود وہ عورت کو وزارتِ تنفیذ کی ذمہ داری سونپنا بھی جائز قرار نہیں دیتے، وہ لکھتے ہیں۔

«وَأَمَّا وِزَارَةُ التَّنْفِيذِ فَحُكْمُهَا أَضْعَفُ وَشُرُوطُهَا أَقَلُّ ... وَلَا يَجُوزُ أَنْ تَقُومَ بِذٰلِكَ امْرَأَةٌ وَأَنَّ خَبَرَهَا مَقْبُولٌ لِمَا تَضَمَّنَهُ مَعْنَى الْوِلَايَاتِ الْمَصْرُوفَةِ عَنِ النِّسَاءِ لِقَولِ النَّبِيِّ ﷺ مَا أَفْلَحَ قَومٌ أَسْنَدُوا أَمْرَهُمْ إِلَى امْرَأَةٍ وَلِأَنَّ فِيهَا مِنْ طَلَبِ الرَّأْيِ وَثَبَاتِ الْعَزْمِ مَا تَضْعُفُ عَنْهُ النِّسَاءُ وَمِنَ الظُّهُورِ فِي مُبَاشَرَةِ الْأُمُورِ مَا هُوَ عَلَيهِنَّ مَحْظُورٌ»

''جہاں تک وزارت تنفیذ کا تعلق ہے وہ نسبتاً کمزور ہے اور اس کی شرائط کم ہیں۔ لیکن یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی عورت اس کی ذمہ دار بنے، اگرچہ عورت کی خبر مقبول ہے کیونکہ یہ وزارت ایسی ولایتوں پر مشتمل ہے جن کو (شریعت نے) عورتوں سے الگ رکھا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو قوم اپنے معاملات

کسی عورت کے سپرد کرے وہ فلاح نہیں پائے گی۔'' نیز اس لیے بھی کہ اس وزارت کے لیے جو اصابت رائے اور اولوالعزمی درکار ہے، عورتوں میں اس کے لحاظ سے ضعف پایا جاتا ہے۔ نیز اس وزارت کے فرائض انجام دینے کے لیے ایسے انداز سے لوگوں کے سامنے ظاہر ہونا پڑتا ہے جو عورتوں کے لیے شرعاً ممنوع ہے۔''[1]

اسلام کے سیاسی نظام پر دوسرا اہم ماخذ امام ابو یعلیٰ حنبلی رحمہ اللہ ہیں۔ انھوں نے بھی اپنی کتاب میں لفظ بہ لفظ یہی عبارت تحریر فرمائی ہے۔

امام الحرمین علامہ جوینی رحمہ اللہ نے اسلام کے سیاسی نظام پر بڑے معرکے کی کتابیں لکھی ہیں۔ وہ نظام الملک طوسی جیسے نیک نام حاکم کے زمانے میں تھے اور انھی کی درخواست پر انھوں نے اسلام کے سیاسی احکام پر اپنی مجتہدانہ کتاب ''غیاث الامم'' تحریر فرمائی ہے اس میں وہ سربراہ حکومت کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

«وَمِنَ الصِّفَاتِ اللَّازِمَةِ الْمُعْتَبَرَةِ، الذُّكُورَةُ وَالْحُرِّيَّةُ وَالْعَقْلُ وَالْبُلُوغُ وَلَا حَاجَةَ إِلَى الْإِطْنَابِ فِي نَصْبِ الدَّلَالَاتِ عَلٰى إِثْبَاتِ هٰذِهِ الصِّفَاتِ»

''اور جو لازمی صفات سربراہ کے لیے شرعاً معتبر ہیں ان میں سے اس کا مذکر ہونا، آزاد ہونا اور عاقل و بالغ ہونا بھی ہے اور ان شرائط کو ثابت کرنے کے لیے تفصیلی دلائل پیش کرکے طول دینے کی ضرورت نہیں۔''[2]

یہی امام الحرمین رحمہ اللہ اپنی ایک دوسری کتاب ''الارشاد'' میں تحریر فرماتے ہیں:

«وَأَجْمَعُوا أَنَّ الْمَرْأَةَ لَا يَجُوزُ أَنْ يَكُونَ إِمَامًا وَإِنِ اخْتَلَفُوا

---

1 الأحكام السلطانية، ص: 25-27 . 2 غياث الأمم، للجويني، ص:82 مطبوعه قطر .

فِي جَوَازِ كَوْنِهَا قَاضِيَةً فِيمَا يَجُوزُ شَهَادَتُهَا فِيهِ»

''اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ عورت کے لیے سربراہ حکومت بننا جائز نہیں، اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ جن امور میں اس کی گواہی جائز ہے ان میں وہ قاضی بن سکتی ہے یا نہیں۔''[1]

علامہ قلقشندی رحمہ اللہ ادب وانشاء اور تاریخ وسیاست کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے اسلام کے اصول سیاست پر جو کتاب لکھی ہے اس میں انھوں نے سربراہ حکومت کی چودہ صفات اہلیت بیان کی ہیں، ان شرائط کے آغاز ہی میں وہ فرماتے ہیں:

«اَلْأَوَّلُ الذُّكُورَةُ ... وَالْمَعْنٰى فِي ذٰلِكَ أَنَّ الْإِمَامَ لَا يَسْتَغْنِي عَنِ الْاخْتِلَاطِ بِالرِّجَالِ وَالْمُشَاوَرَةِ مَعَهُمْ فِي الْأُمُورِ، وَالْمَرْأَةُ مَمْنُوعَةٌ مِنْ ذٰلِكَ، وَلِأَنَّ الْمَرْأَةَ نَاقِصَةٌ فِي أَمْرِ نَفْسِهَا، حَتّٰى لَا تَمْلِكُ النِّكَاحَ فَلَا تُجْعَلُ إِلَيْهَا الْوِلَايَةُ عَلٰى غَيْرِهَا»

''پہلی شرط مذکر ہونا ہے۔ اور اس حکم کی حکمت یہ ہے کہ سربراہ حکومت کو مردوں کے ساتھ اختلاط اور ان کے ساتھ مشوروں وغیرہ کی ضرورت پیش آتی ہے اور عورت کے لیے یہ باتیں ممنوع ہیں، اس کے علاوہ عورت اپنی ذات کی ولایت میں بھی کمزور ہے، یہاں تک کہ وہ نکاح کی ولی نہیں بن سکتی، لہٰذا اس کو دوسروں پر بھی ولایت نہیں دی جاسکتی۔''

امام بغوی رحمہ اللہ پانچویں صدی ہجری کے مشہور مفسر، محدث اور فقیہ ہیں، وہ تحریر فرماتے ہیں:

«اِتَّفَقُوا عَلٰى أَنَّ الْمَرْأَةَ لَا تَصْلُحُ أَنْ تَكُونَ إِمَامًا ... لِأَنَّ

1 الإرشاد في أصول الاعتقاد للجويني، ص: 379 و 427، طبع مصر.

الْإِمَامَ يَحْتَاجُ إِلَى الْخُرُوجِ لِإِقَامَةِ أَمْرِ الْجِهَادِ، وَالْقِيَامِ بِأُمُورِ الْمُسْلِمِينَ . . . وَالْمَرْأَةُ عَورَةٌ لَا تَصْلُحُ لِلْبُرُوزِ»

''اس بات پر امت کا اتفاق ہے کہ عورت سربراہ حکومت نہیں بن سکتی کیونکہ امام کو جہاد کے معاملات انجام دینے اور مسلمانوں کے امور نمٹانے کے لیے باہر نکلنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور عورت پوشیدہ رہنی چاہیے۔ اس کا مجمع عام میں ظاہر ہونا درست نہیں۔''[1]

قاضی ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«وَهٰذَا نَصٌّ فِي أَنَّ الْمَرْأَةَ لَا تَكُونُ خَلِيفَةً وَلَا خِلَافَ فِيهِ»

''اور یہ حدیث اس بات پر نص ہے کہ عورت خلیفہ نہیں ہو سکتی اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔''[2]

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بھی اپنی تفسیر میں ابن العربی رحمہ اللہ کا یہ اقتباس نقل کر کے اس کی تائید کی ہے اور بتایا ہے کہ اس مسئلے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں اور امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«الرابع: الذُّكُورِيَّةُ فَلَا تَنْعَقِدُ الْإِمَامَةُ لِامْرَأَةٍ وَإِنِ اتَّصَفَتْ بِجَمِيعِ خِلَالِ الْكَمَالِ وَصِفَاتِ الْاِسْتِقْلَالِ»

''سربراہی کی چوتھی شرط مذکر ہونا ہے، لہٰذا کسی عورت کی امامت منعقد نہیں ہوتی، خواہ وہ تمام اوصاف کمال سے متصف ہو اور اس میں استقلال کی تمام صفات

---

1 شرح السنة، الإمارة والقضاء، باب كراهية تولية النساء، بعد حديث: 2486.

2 أحكام القرآن لابن العربي: 445/3 سورة النمل.

پائی جاتی ہوں۔"[1]

عقائد وکلام کی تقریباً تمام کتابیں امامت وسیاست کے احکام سے بحث کرتی ہیں اور سب نے مذکر ہونے کی شرط کو ایک اجماعی شرط کے طور پر ذکر کیا ہے۔ علامہ تفتازانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«يُشْتَرَطُ فِي الْإِمَامِ أَنْ يَكُونَ مُكَلَّفًا، حُرًّا، ذَكَرًا، عَدْلاً»

"سربراہ حکومت کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ عاقل بالغ ہو، آزاد ہو، مذکر ہو اور عادل ہو۔"[2]

فقہاء ومحدثین اور اسلامی سیاست کے علماء کے یہ چند اقتباسات محض مثال کے طور پر پیش کیے گئے ہیں، ورنہ جس کتاب میں بھی اسلام میں سربراہی کی شرائط بیان کی گئی ہیں، وہاں مذکر ہونے کو ایک اہم شرط کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اگر کسی نے یہ شرط ذکر نہیں کی تو اس بنا پر کہ یہ عاقل وبالغ ہونے کی شرط کی طرح اتنی مشہور ومعروف شرط تھی کہ اسے باقاعدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، ورنہ اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

عہد حاضر میں بعض محققین جنھوں نے اسلامی ریاست کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں، وہ اس بات پر متفق ہیں کہ عورت کے سربراہ بننے کے عدم جواز پر امت کا اجماع ہے۔ چند اقتباسات ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد منیر عجلانی لکھتے ہیں:

«لَا نَعْرِفُ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ مَنْ أَجَازَ خِلَافَةَ الْمَرْأَةِ، فَالْإِجْمَاعُ ـ فِي هٰذِهِ الْقَضِيَّةِ ـ تَامٌّ لَمْ يَشُذَّ عَنْهُ أَحَدٌ»

"ہمیں مسلمانوں میں کوئی ایسا عالم معلوم نہیں ہے جس نے عورت کی خلافت کو

---

1 فضائح الباطنية للغزالي، ص: 180 مأخوذ از عبدالله الدميجي، والإمامة العظمى، ص: 246. 2 شرح المقاصد: 277/2.

جائز کہا ہو، لہٰذا اس مسئلے میں مکمل اجماع ہے جس کے خلاف کوئی شاذ قول بھی موجود نہیں۔"[1]

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین الریس نے اسلام کے سیاسی احکام پر بڑی تحقیق کے ساتھ مبسوط کتاب لکھی ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

«إِذَا كَانَ قَدْ وَقَعَ بَيْنَهُمْ خِلَافٌ فِيمَا يَتَعَلَّقُ بِالْقَضَاءِ، فَلَمْ يُرْوَ عَنْهُمْ خِلَافٌ فِيمَا يَتَعَلَّقُ بِالْإِمَامَةِ، بَلِ الْكُلُّ مُتَّفِقٌ عَلٰى أَنَّهُ لَا يَجُوزُ أَنْ يَّلِيَهَا امْرَأَةٌ»

"اگرچہ فقہاء کے درمیان قضا کے بارے میں تو اختلاف ہوا ہے (کہ عورت قاضی بن سکتی ہے یا نہیں) لیکن حکومت کی سربراہی کے بارے میں کوئی اختلاف مروی نہیں بلکہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ کسی عورت کا سربراہی کے منصب پر فائز ہونا جائز نہیں۔"[2]

ڈاکٹر ابراہیم یوسف مصطفیٰ عجو لکھتے ہیں:

«مِمَّا اجْمَعَتْ عَلَيهِ الْأُمَّةُ عَلٰى أَنَّ الْمَرْأَةَ لَا يَجُوزُ لَهَا أَنْ تَلِيَ رِيَاسَةَ الدَّولَةِ»

"اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ عورت کے لیے ریاست کی سربراہی سنبھالنا جائز نہیں۔"[3]

عبداللہ بن عمر بن سلیمان الدمیجی لکھتے ہیں:

«مِنْ شُرُوطِ الْإِمَامِ أَنْ يَّكُونَ ذَكَرًا، وَلَا خِلَافَ فِي ذٰلِكَ

---

1 عبقرية الإسلام في أصول الحكم، ص: 70، مطبوعة دارالنفائس، بيروت 1405ھ. 2 النظريات السياسة الإسلامية، ص: 294، طبع قاهره. 3 تعليق تهذيب الرياسة وترتيب السياسية للقلعي، ص: 82.

بَيْنَ الْعُلَمَاءِ»

''سربراہ حکومت کی شرائط میں یہ بات داخل ہے کہ وہ مذکر ہو اور اس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔''[1]

عہد حاضر کے مشہور مفسر قرآن علامہ محمد امین شنقیطی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

«مِنْ شُرُوطِ الْإِمَامِ الْأَعْظَمِ كَوْنُهُ ذَكَرًا، وَلَا خِلَافَ فِي ذٰلِكَ بَيْنَ الْعُلَمَاءِ»

''امام اعظم (سربراہ حکومت) کی شرائط میں اس کا مذکر ہونا بھی داخل ہے اور اس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔''[2]

اگر اس موضوع پر تاریخ اسلام کے ائمہ، مفسرین، فقہاء، محدثین، متکلمین اور اہل فکر و دانش کی تمام عبارتیں جمع کی جائیں تو یقیناً ان سے ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے لیکن یہ چند مثالیں یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اس مسئلے پر علماء اسلام کے درمیان اب تک چودہ صدیوں میں کوئی اختلاف نہیں رہا۔

حافظ ابن جریر طبری رحمہ اللہ کا مسلک

ہمارے زمانے میں بعض لوگوں نے مشہور مفسر قرآن حافظ ابن جریر طبری رحمہ اللہ کی طرف غلط طور پر یہ بات منسوب کی ہے کہ وہ عورت کی سربراہی کے جواز کے قائل ہیں لیکن کوئی بھی شخص امام ابن جریر رحمہ اللہ کا کوئی اپنا اقتباس پیش نہیں کرتا۔ ان کی تصانیف میں سے تفسیر ''جامع البیان'' تیس جلدوں میں چھپی ہوئی موجود ہے۔ اس میں سے کہیں کوئی ایک فقرہ بھی کوئی اب تک نہیں دکھا سکا جس سے ان کا یہ موقف معلوم ہوتا ہو۔ خود ہم نے بھی

---

1 الإمامة العظمٰى عند أهل السنة، ص: 243. 2 أضواء البيان في تفسير القرآن بالقرآن: 26/1.

ان کی تفسیر کے ممکنہ مقامات پر دیکھا لیکن اس میں کہیں کوئی ایسی بات نہیں ملی۔

اس کے علاوہ ان کی ایک کتاب ''تہذیب الآثار'' کی بھی کچھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، اس میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ملی۔

واقعہ یہ ہے کہ بعض علماء نے ان کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ وہ عورت کو قاضی بنانے کے جواز کے قائل ہیں۔ بعض لوگوں نے اس بات کو غلط طور پر سربراہی کے جواز کے عنوان سے نقل کر دیا ہے، چنانچہ قاضی ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

«وَهٰذَا نَصٌّ فِي أَنَّ الْمَرْأَةَ لَا تَكُونُ خَلِيفَةً وَلَا خِلَافَ فِيهِ، وَنُقِلَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جَرِيرٍ الطَّبَرِيِّ إِمَامِ الدِّينِ، أَنَّهُ يَجُوزُ أَنْ تَكُونَ الْمَرْأَةُ قَاضِيَةً وَلَمْ يَصِحَّ ذٰلِكَ عَنْهُ، وَلَعَلَّهُ كَمَا نُقِلَ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ أَنَّهَا إِنَّمَا تَقْضِي فِيمَا تَشْهَدُ فِيهِ، وَلَيْسَ بِأَنْ تَكُونَ قَاضِيَةً عَلَى الْإِطْلَاقِ، وَلَا بِأَنْ يُكْتَبَ لَهَا مَنْشُورٌ، بِأَنَّ فُلَانَةَ مُقَدَّمَةٌ عَلَى الْحُكْمِ إِلَّا فِي الدِّمَاءِ وَالنِّكَاحِ، فَإِنَّمَا ذٰلِكَ كَسَبِيلِ التَّحْكِيمِ أَوِ الْاِسْتِبَانَةِ فِي الْقَضِيَّةِ الْوَاحِدَةِ»

''اور یہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس بات پر نص ہے کہ عورت خلیفہ نہیں ہو سکتی اور اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ امام محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ان کے نزدیک عورت کا قاضی ہونا جائز ہے لیکن اس مذہب کی نسبت ان کی طرف صحیح نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مذہب ایسا ہی ہوگا جیسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ عورت ان معاملات میں فیصلہ کر سکتی ہے، جس میں وہ شہادت دے سکتی ہے اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ علی الاطلاق

قاضی بن جائے۔ اور نہ یہ مطلب ہے کہ اس کو قاضی کے منصب پر مقرر کرنے کا پروانہ دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ فلاں عورت کو قصاص اور نکاح کے معاملات کے سوا دوسرے امور میں قاضی بنایا جا رہا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو کسی مسئلے میں ثالث بنا لیا جائے یا کوئی ایک مقدمہ جزوی طور پر اس کے سپرد کر دیا جائے۔''[1]

امام ابن العربی کی اس وضاحت سے مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں:

① سربراہی کا مسئلہ علیحدہ ہے اور قاضی بننے کا مسئلہ علیحدہ۔

② سربراہی کے مسئلے میں امام ابن جریر رحمہ اللہ سمیت تمام علماء کا اتفاق ہے کہ عورت سربراہ نہیں بن سکتی۔

③ امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ سے قاضی بننے کا جواز منقول ہے لیکن ان کی طرف اس قول کی نسبت بھی درست نہیں۔

④ امام ابوحنیفہ یا ابن جریر رحمۃ اللہ علیہم سے عورت کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کا جواز منقول ہے، وہ اس کو باقاعدہ قاضی بنانے سے متعلق نہیں ہے بلکہ جزوی طور سے بطور ثالث کوئی انفرادی قضیہ نمٹانے سے متعلق ہے۔

بہر کیف! اگر فقہاء کے درمیان کوئی تھوڑا بہت اختلاف ہے تو وہ عورت کے قاضی بننے کے بارے میں ہے۔ سربراہ حکومت بننے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں، چنانچہ امام الحرمین جوینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«وَالذُّكُورَةُ لَا شَكَّ فِي اعْتِبَارِهَا وَمَنْ جَوَّزَ مِنَ الْعُلَمَاءِ تَوَلِّيَ الْمَرْأَةِ لِلْقَضَاءِ فِيمَا يَجُوزُ أَنْ تَكُونَ شَاهِدَةً فِيهِ أَحَالَ

1 أحكام القرآن لابن العربي: 445/3.

انْتِصَابَ الْمَرْأَةِ لِلإِمَامَةِ، فَإِنَّ الْقَضَاءَ قَدْ يَثْبُتُ مُخْتَصًّا، وَالْإِمَامَةُ يَسْتَحِيلُ فِي وَضْعِ الشَّرْعِ ثُبُوتُهَا عَلَى الْاِخْتِصَاصِ»

''سربراہی کے لیے مذکر ہونے کی شرط میں کوئی شک نہیں ہے اور جن علماء نے ان معاملات میں عورت کے قاضی بننے کو جائز کہا ہے کہ جن میں عورت گواہ بن سکتی ہے، وہ بھی سربراہی کے لیے عورت کی تقرری کو ناممکن قرار دیتے ہیں، اس لیے کہ قضا کے بارے میں تو یہ ممکن ہے کہ اس کی حدود اختیار کو کچھ معاملات کے ساتھ خاص کر دیا جائے لیکن حکومت کی سربراہی کو شرعی اصول کے مطابق کچھ محدود معاملات کے ساتھ خاص کرنا ممکن نہیں۔''[1]

1 غياث الأمم للجويني، ص: 83,82 .

عورت......اقبال کی نظر میں

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

❀❀❀

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مرد ہوش مند
غیرت نہ تجھ میں ہو گی نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض
کونسل کی ممبری کے لیے ووٹ چاہے گی

❀❀❀

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش

مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

❁❁❁

نہ پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

❁❁❁

قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں

❁❁❁

(بانگ درا اور ضرب کلیم سے اقتباسات)

عورت کی عفت و پاکیزگی کا مفہوم

اسلام میں عورت کو جس عفاف و پاکیزگی کا مکلّف ٹھہرایا گیا ہے، وہ اس کا زیور ہے بلکہ یوں کہیے کہ وہی اس کی فطرت نسوانی کا حسن اور نکھار ہے۔

یہ یاد رہے کہ ہمارے ہاں عفاف و عصمت کے یہی معنی نہیں ہیں کہ مصحف رخ پر ناپاک نگاہیں نہ پڑیں بلکہ اس سے زیادہ اس کا مفہوم ایک طرح کی ایجابیت لیے ہوئے ہے اور ایک مخصوص طرح کی سیرت و کردار کا مظہر ہے۔

عفاف کے معنی یہ ہیں کہ ایک عورت یہ سمجھتی ہے کہ محبت و تعلق خاطر کے تمام حقوق صرف ایک شخص کو حاصل ہیں اور وہ میرا شوہر ہے۔ صرف اس کی نظریں میرے جمال و زیبائش کا جائزہ لے سکتی ہیں اور اس کی محبت روح و قلب کی زندگی و بالیدگی کا باعث ہو سکتی ہے۔

اور آوارگی کے معنی صرف یہ نہیں کہ عورت بدکردار ہے بلکہ اس سے زیادہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ بدنصیب محبت و اخلاص کی اس دولت سے محروم ہے جو عائلی زندگی کی جان اور اساس ہے اور اگر معاشرہ اس بدکرداری کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ گھروں کو ان فطری سعادتوں سے اور اخلاص و تودد کی بے بہا نعمتوں سے محروم کر دینا چاہتا ہے اور یہی وہ نقطۂ زوال ہے کہ جو قومیں بھی محرومی و بدبختی کی اس منزل تک پہنچیں، پھر وہ ایسی مٹیں اور اس طرح ختم ہوئیں کہ دوبارہ نہیں ابھر سکیں۔ [1]

1 "الاعتصام" 2 مارچ 1951ء از مولانا محمد حنیف ندوی مرحوم۔

اے دخترِ اسلام

مظفر وارثی

لگتی ہے کلی کتنی بھلی شاخ چمن پر
ہاتھوں میں پہنچ کر کوئی قیمت نہیں رہتی

جو شمع سرِعام لٹاتی ہے اجالے
اس شمع کی گھر میں کوئی عزت نہیں رہتی

تسلیم کہ پردہ ہوا کرتا ہے نظر کا
نظروں میں بھی برداشت کی قوت نہیں رہتی

مردوں کے اگر شانہ بشانہ رہے عورت
کچھ اور ہی بن جاتی ہے عورت نہیں رہتی

جھانک اپنے گریباں میں کیا ہو گیا تجھ کو
حیرت سے تجھے تکتا ہے آئینۂ ایام

اے دخترِ اسلام

خود اپنی جڑوں پر ہی چلاتی ہے درانتی
بربادی احساس نمو مانگ رہی ہے

کب بخشی گئی ہیں تجھے آزادیاں اتنی
جو حق ہی نہیں ہے ترا تو مانگ رہی ہے

میں تو ترے ماتھے پہ پسینہ بھی نہ دیکھوں
مجھ سے مری غیرت کا لہو مانگ رہی ہے
جنت ہے ترے پاؤں میں فرمایا نبیؐ نے
دریا پہ کھڑی ہو کے سبو مانگ رہی ہے
وہ رتبۂ عالی کوئی مذہب نہیں دیتا
کرتا ہے جو عورت کو عطا مذہب اسلام
اے دخترِ اسلام
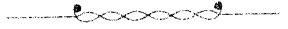
عورت اور مسئلۂ ولایت نکاح

بے پردگی نے جہاں اور بہت سے مسائل پیدا کیے ہیں، جن میں چند ایک پر ہم گزشتہ صفحات میں ضروری بحث کر آئے ہیں، وہاں نوجوان لڑکی کا والدین کی اجازت اور رضامندی کے بغیر از خود نکاح کرنے کا بھی اہم مسئلہ ہے۔ آج کل یہ مسئلہ کافی شدت اختیار کر گیا ہے اور اس قسم کے بعض معاملات عدالت میں بھی زیر بحث آتے رہتے ہیں اور اخبارات میں آئے دن کے واقعات کی اشاعت سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوجوان لڑکیوں میں مغربی معاشرے کی طرح از خود نکاح کرنے کا رجحان فروغ پا رہا ہے اور والدین کے حق ولایت کو ایک ناروا بوجھ اور ظلم سمجھا جا رہا ہے اور بعض لوگ فقہ حنفی کے حوالے سے بالغ لڑکی کے اس قسم کے اقدام کو جائز قرار دے رہے ہیں اور عدالتیں بھی بالعموم انھیں سند جواز مہیا کر رہی ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ اس بارے میں مسئلے کی صحیح نوعیت کو واضح کیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ تصور اسلام کے احکام کے مطابق ہے نہ فقہ حنفی کی تصریحات کے مطابق، البتہ مغرب کی حیا باختہ تہذیب کے عین مطابق ہے جس میں جوان ہونے کے بعد اولاد کا کوئی تعلق والدین کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ بالغ لڑکی جو چاہے کرے، والدین کو اس میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اگر والدین مداخلت کرتے ہیں تو لڑکی پولیس کے ذریعے سے والدین کو تھانے بھجوا کر جس کے ساتھ چاہے رنگ رلیاں منا سکتی ہے۔

اسلام میں تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد، دوسرے نمبر پر جو حکم ہے، وہ والدین کی اطاعت وفرماں برداری اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا ہے ،قرآن کریم میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ تم والدین کے سامنے اگر کوئی بات تمھیں ناگوار گزرے تو اُف (اُونہہ) تک نہ کہو،اس سے زیادہ والدین کے ادب واحترام اوراطاعت وفرماں برداری کی تاکید کیا ہوسکتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ والدین کو سخت تاکید ہے کہ وہ لڑکی کی رضامندی کے بغیر اس کا نکاح نہ کریں حتیٰ کہ اگر کوئی باپ لڑکی کی رضامندی کے بغیر نکاح کر دیتا ہے اور لڑکی کو وہ پسند نہ ہو تو شریعت نے لڑکی کو حق دیا ہے کہ وہ یہ نکاح فسخ کروا لے لیکن دوسری طرف لڑکی کو قطعاً یہ حق نہیں دیا گیا ہے کہ وہ ولی کی اجازت کے بغیر جہاں چاہے،نکاح کر لے بلکہ اس کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ولی (باپ، بھائی، چچا وغیرہ) کی اجازت اور رضامندی ہی سے نکاح کا مسئلہ حل کرے۔ اگر وہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے گی تو وہ نکاح ہی نہیں ہوگا۔ نبیٔ کریم ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ»

”ولی کے بغیر نکاح نہیں۔“[1]

دوسری روایت میں ہے:

«أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ إِذْنِ مَوَالِيهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ»

”جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تو اس کا نکاح باطل ہے۔اس کا نکاح باطل ہے،اس کا نکاح باطل ہے۔“[2]

1 سنن أبي داود، النكاح، باب في الولي، حديث: 2085 . 2 سنن أبي داود، النكاح، باب في الولي، حديث: 2083 .

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے دونوں کو ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنے اور ایک دوسرے کو راضی کرنے کی تاکید کی ہے۔ والدین کو جبر کرنے کی اجازت دی ہے نہ لڑکی کو والدین کی اجازت اور رضامندی کو نظر انداز کرنے کی اور جب بھی اور جہاں بھی لڑکی پر جبر کا پہلو پایا جائے یا والدین کی اجازت کو نظر انداز کر کے من مانی کی جائے تو دونوں صورتوں میں عدالت کے ذریعے سے اس ظلم و جبر کی تلافی کی جا سکتی ہے۔ یہ ہے اسلام کی صحیح تعبیر و تشریح۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ لڑکی کے مقابلے میں والدین کا حق مقدم اور فائق ہے اور تمام ائمۂ اسلام اسی بات کے قائل ہیں۔ کوئی بھی امام لڑکی کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ والدین کی اجازت اور رضامندی کو نظر انداز کر کے از خود نکاح کر لے۔ فقہ حنفی سے اس کا جو جواز ثابت کیا جاتا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ فقہ حنفی میں بیان کردہ جواز کو اس کے پورے سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو فقہ حنفی سے اس کا مطلق جواز ثابت نہیں ہوتا۔

اول تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردان رشید امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ، جنھیں صاحبین کہا جاتا ہے، فرماتے ہیں کہ عاقل و بالغ لڑکی بھی ولی کی رضامندی اور اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتی، البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے لیکن امام صاحب کے نزدیک بالغ لڑکی کا یہ اختیار مشروط ہے کفو کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھنے کے ساتھ۔ اگر کسی لڑکی نے ولی کی اجازت کے بغیر ''غیر کفو'' میں نکاح کر لیا تو ولی کو نہ صرف اعتراض کرنے بلکہ تنسیخ نکاح کے لیے عدالتی چارہ جوئی کا حق حاصل ہے۔

ثانیاً: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ایک شاگرد حضرت حسن بن زیاد رحمہ اللہ کی روایت کی رو سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہ مسلک ہے کہ اگر لڑکی ولی کی اجازت کے بغیر غیر کفو میں نکاح کرلے گی تو یہ نکاح ہی باطل ہوگا (ولی کو فسخ نکاح کرنے کے لیے عدالت میں جانے کی

بھی ضرورت نہیں ہے۔)[1]

کفو کا مطلب فقہاء کے ہاں یہ ہے کہ لڑکی کسی ایسی جگہ نکاح نہ کرے جس میں لڑکی کے ولی اور اہل خانہ عار محسوس کریں۔ اس شرط یا حق استرداد (ویٹو پاور) کی موجودگی میں جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ولی کو حاصل ہے، یہ کہنا کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے کہ حنفی مذہب میں بالغ لڑکی کو ولی کی اجازت کے بغیر شادی کرنے کا غیر مشروط حق حاصل ہے۔ اس شرط کے تو صاف معنی یہ ہیں کہ ولی کی رضامندی اور اجازت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی لڑکی ایسا کرے گی تو ایک روایت کی رو سے یہ نکاح باطل ہوگا اور ایک روایت کی رو سے ولی اسے فسخ کرانے کا اختیار رکھتا ہے۔

علمائے احناف کو اس نکتے پر غور کرنا چاہیے کہ جب کفو کو نظر انداز کرنے کی صورت میں امام صاحب کے نزدیک ولی کو لڑکی کا اختیار ختم کرنے اور نکاح کے رد کرنے اور کروانے کا حق حاصل ہے یا بقول حسن بن زیاد امام صاحب کے نزدیک سرے سے نکاح ہی باطل ہے تو وہ مطلقاً یہ فتویٰ یا رائے کیوں دیتے ہیں کہ بالغ لڑکی کو از خود نکاح کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہ مذکورہ شرط کو ساتھ بیان کیوں نہیں کرتے، جس سے امام صاحب کا موقف دوسرے ائمہ کے موقف کے قریب ہو جاتا ہے۔ احناف کے موجودہ طرز عمل سے لَو میرج، کورٹ میرج اور سیکرٹ میرج (محبت کی شادی، عدالت کے ذریعے سے شادی اور خفیہ شادی) کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ جج حضرات بھی یہ سمجھتے ہیں کہ مذکورہ قسم کی شادیوں کو، جن میں لڑکی اپنے ولی کی رضامندی اور اجازت کو نظر انداز کر کے اسلامی اقدار و روایات سے انحراف کرتی ہے، فقہ حنفی کی تائید حاصل ہے اور وہ اس کے حق میں فیصلہ کر دیتے ہیں، حالانکہ اس میں کفو کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہوتا ہے جو اس کے

---

1 تفصیل کے لیے دیکھیے: فیض الباری، علامہ انور شاہ کشمیری: 4/282-287.

جواز کی بنیادی شرط ہے کیونکہ اگر کفو کے تقاضوں کوملحوظ رکھتے ہوئے لڑکی شادی کرے تو والدین بالعموم اس سے اتفاق نہ کرنے کے باوجود قبول یا گوارا کر لیتے ہیں۔ اس قسم کی شادیوں میں جتنے بھی کیس عدالتوں میں جاتے ہیں وہ سب ایسے ہی ہوتے ہیں کہ والدین کے نزدیک لڑکی ایسی جگہ شادی کر لیتی ہے یا کرنے پر مصر ہوتی ہے جس میں لڑکی کے ولی اور اہل خاندان عار محسوس کرتے ہیں لیکن بدقسمتی سے عدالتیں لڑکیوں کے حق میں فیصلہ دے دیتی ہیں۔ علمائے احناف سے پوچھا جاتا ہے تو وہ بھی مذکورہ شرط کو نظر انداز کر کے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ فیصلے اور فتوے شریعت اسلامیہ کی نصوص کے بھی خلاف ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک کے بھی۔ علاوہ ازیں ان سے وہ خاندانی روایات شکست و ریخت کا شکار ہو رہی ہیں جو ایک اسلامی معاشرے کی امتیازی خصوصیات کے طور پر صدیوں سے قائم چلی آ رہی ہیں اور ان کی جگہ مغربی معاشرے کی وہ روایات فروغ پا رہی ہیں جن میں حیا وعفت کا کوئی تصور نہیں ہے اور اس حیا باختہ تہذیب نے مسلمانوں کے خاندانی نظام کو تباہ کر دیا ہے۔

بہرحال ''کفو'' کی شرط کی موجودگی میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک دوسرے ائمہ سے زیادہ مختلف نہیں رہتا کیونکہ کفو کی شرط کا مفاد یہ ہے کہ نکاح میں لڑکی اور اس کے ولی دونوں کی رضا کا اکٹھا ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ اگر ولی لڑکی کی رضامندی کو نظر انداز کرے گا تو لڑکی کو انکار کرنے کا حق ہے اور اگر لڑکی ولی کی رضامندی کو اہمیت نہیں دے گی تو ولی کو حق استرداد حاصل ہے اور یہی مسلک دوسرے ائمہ کا بھی ہے اور نصوص شریعت کا اقتضا بھی یہی ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکی کی رضامندی کے بغیر اس کی شادی کرنے سے منع فرمایا ہے اور اگر ولی نے لڑکی کی رضامندی کو نظر انداز کر کے لڑکی کی

شادی کر دی ہے تو ہمارے پیغمبر نے لڑکی کو فسخ نکاح کا حق عطا کیا ہے یہ تمام چیزیں احادیث میں موجود ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں، اس لیے صرف حوالے پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

اس لیے مسئلہ یہ نہیں ہے کہ دوسرے ائمہ لڑکی پر جبر کے قائل ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جبر کے قائل نہیں ہیں۔ یہ زندگی بھر کا مسئلہ ہے، اسے جبر کے ذریعے سے حل نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ کوئی بھی مکتب فکر جبر کا قائل نہیں ہے۔ سب کے نزدیک دونوں کی رضامندی ضروری ہے۔ شریعت صرف یہ کہتی ہے کہ نوجوان لڑکی، زندگی کے نشیب وفراز سے آگاہ نہیں ہوتی، علاوہ ازیں جوانی کے جذبات اور جوش میں وہ غلط فیصلہ کر سکتی ہے، اس لیے ولی کی اجازت اور رضامندی کے بغیر وہ شادی کرنے کا اقدام نہ کرے حقیقت یہ ہے کہ چند بدقماش اور خودغرض افراد کو چھوڑ کر، والدین سے بڑھ کر دنیا میں اولاد کا اور بالخصوص لڑکیوں کا کوئی خیرخواہ نہیں۔ ہر والد اپنی بچی کے لیے بہتر سے بہتر اور موزوں سے موزوں تر رشتے کا خواہش مند ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے بھرپور کوشش بھی کرتا ہے اور استثنائی صورتوں میں جہاں ولی کی طرف سے ظلم و جور کا ارتکاب ہو، وہاں شریعت نے خود لڑکی کو عدالت یا پنچائت کے ذریعے سے دادرسی کی اجازت دی ہے۔ اس قسم کے استثنائی کیسوں میں یقیناً لڑکی کے حق میں فیصلہ دیا جا سکتا ہے اور دیا جانا چاہیے لیکن جہاں ظلم و جبر کا کوئی پہلو نہ ہو، وہاں صرف اس بنیاد پر لڑکی کے حق میں فیصلہ کر دینا کہ لڑکی عاقل بالغ ہے، یکسر غلط ہے جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے اور تمام ائمۂ دین کی رائے کے بھی خلاف ہے۔ لڑکیوں کی اس آزادروی اور بے راہ روی کی تائید بہت خطرناک ہے۔

مرد کو اللہ تعالیٰ نے قوّام بنایا ہے جس کے معنی ہیں حاکم اور نگران۔ مرد عورت کے مقابلے میں گھر کا سربراہ اور اس کا محافظ ونگران ہے۔ اس برتری اور ایک گونہ فضیلت کی

دو وجہیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ نے مرد کو عورت کے مقابلے میں زیادہ عقل وفہم اور زیادہ جسمانی قوت و طاقت عطا کی ہے۔ دوسری، یہ کہ کسب معاش کا ذمے دار صرف اور صرف مرد ہے۔ ہر چھوٹے بڑے ادارے کے حسن انتظام کے لیے ایک سربراہ، منتظم اعلیٰ اور محافظ ونگران کا وجود ضروری ہے۔ اس کے بغیر کوئی ادارہ قائم ہوسکتا ہے نہ باقی ہی رہ سکتا ہے۔ اس اعتبار سے گھر کی سربراہی اللہ تعالیٰ نے مذکورہ دو امتیازی خوبیوں کی وجہ سے مرد کو عطا کی ہے جو فطری طور پر اسے حاصل ہے۔ اس کو تسلیم کیے بغیر گھر کا نظام صحیح طریقے سے نہیں چل سکتا۔

جب میاں بیوی میں سے حاکمیت مرد کو حاصل ہے تو اولاد پر بھی حاکمیت کا فطری حق مرد ہی کو حاصل ہے۔ اولاد کے مقابلے میں مرد کے حق حاکمیت کا نام قَوامیت کی بجائے ولایت ہے۔ جس طرح قَوامیت کے لغوی مفہوم تک میں بھی حاکمیت کا مفہوم شامل ہے۔ اسی طرح ولایت کے دو لغوی معنی ہیں۔ ایک محبت ونصرت اور دوسرے سلطنت و قدرت۔ ان دونوں مفہوموں کے اعتبار سے ولی کو اولاد پر ہر طرح فوقیت حاصل ہے۔ ولی کو اولاد سے محبت بھی ہوتی ہے اور اس کے اندر اس کی مدد اور اس کے حقوق و مفادات کی حفاظت کا جذبہ بھی۔ علاوہ ازیں اس کو اولاد پر غلبہ و تسلط بھی حاصل ہے۔ ایک تو فطری طور پر ہی، جیسا کہ ابھی وضاحت گزری۔ دوسرے، باپ کی شفقت و رعایت اور اس کے مالی اور دیگر ہر قسم کے تعاون ہی سے اولاد نشوونما پاتی اور پروان چڑھتی ہے۔

اب یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ اولاد جوان ہونے کے بعد ولی پر فائق اور برتر ہو جائے۔ یہ فطرت کے بھی خلاف ہے اور جذبۂ ممنونیت و احساس تشکر کے بھی برعکس، اس لیے منشائے شریعت بھی یہی ہے اور تقاضائے انصاف بھی کہ ولی کا حق ہر لحاظ سے غالب اور مقدم رہے اور ولی اور اولاد میں اختلاف کی صورت میں صرف اولاد کی بلوغت کو دیکھ کر

ولی کی ولایت کونظر انداز کر دینا روح شریعت کے بھی خلاف ہے اور انصاف کے تقاضوں سے بھی انحراف۔ ہاں! اگر ولی اپنے حق ولایت کو غلط استعمال کرے اور جبر کے ذریعے سے ظلم وزیادتی کا ارتکاب کرے تو اور بات ہے۔ اس قسم کی صورتوں میں خود شریعت نے بھی دوسرے لوگوں کو مداخلت کر کے انصاف کا اہتمام کرنے کی تاکید کی ہے۔ فقہی اصطلاح میں ایسے غیر مشفق باپ کو ''ولیٔ عاضل'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کی ولایت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ اس صورت میں چچا، تایا وغیرہ ولی قرار پائیں گے یا پھر وقت کا امام، قاضی اور حاکم۔ [1]

حالات کی تبدیلی سے اجتہادی احکام تبدیل ہو سکتے ہیں نہ کہ منصوص احکام

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اب حالات بدل گئے ہیں اور معاشرے میں سماجی، سیاسی اور قانونی لحاظ سے عورت کی حیثیت پہلے سے مختلف ہو چکی ہے، لہٰذا عورتوں کے حوالے سے نصوص اسلامی کی نئی تشریح یا دوسرے لفظوں میں عورتوں سے متعلق اجتہادی قوانین پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ [2]

لیکن ہم عرض کریں گے کہ ایسے اہل علم وفکر اور اصحاب دانش وبینش یا تو مغربی افکار سے متاثر ہیں یا ذہنی تضاد کا شکار ہیں۔ ایک طرف یہ حضرات ائمہ کے مسالک اور ان کے دلائل بھی نقل فرماتے ہیں اور دوسری طرف انھیں ان کا اجتہاد قرار دے کر ان میں تبدیلی کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اجتہادی مسائل، ابدی نہیں ہیں، ان میں حالات وظروف کے مطابق تغیر وتبدل کے تمام علماء قائل ہیں لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ عورتوں

---

1 مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''مفرور لڑکیوں کا نکاح اور ہماری عدالتیں، مسئلۂ ولایت نکاح کا تحقیقی جائزہ'' مطبوعہ دار السلام، لاہور۔ 2 نوائے وقت، لاہور، 2 مئی 1996ء میں شائع شدہ ایک اسلامی دانشور کے مضمون سے اقتباس۔

سے متعلقہ احکام و مسائل اجتہادی ہیں یا نصوص شریعت پر مبنی۔ اجتہادی مسئلہ تو وہ ہوتا ہے جس کی بابت قرآن کریم یا حدیث رسول ﷺ میں کوئی نص نہ ہو اور علماء نے اس سے ملتے جلتے کسی مسئلے پر قیاس کر کے اس کے جواز یا عدم جواز کا حکم اخذ کیا ہو۔ کیا خیارِ بلوغ یا عاقل بالغ لڑکی کے ولی کی اجازت کے بغیر از خود شادی کر لینے یا حجاب وغیرہ کے مسائل اجتہادی ہیں یا نصوص پر مبنی۔ اگر یہ فقہاء کے اجتہادی مسائل ہیں، پھر تو یقیناً ان میں حالات کے مطابق تبدیلی کا مشورہ صحیح ہے اور اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے کیونکہ خود یہ حضرات بھی ائمہ کے دلائل نقل فرماتے ہیں جو نصوص قرآن و حدیث پر مبنی ہیں نہ کہ وہ اجتہادی اقوال و آراء ہیں تو پھر ان مسائل میں تبدیلی کا مشورہ مغرب زدہ متجددین کی ہم نوائی کے سوا کیا ہے۔ جو تغیر حالات کے نام پر ساری شریعت ہی کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ حضرات بھی نصوص میں تبدیلی کے قائل ہیں۔ اگر نہیں ہیں تو پھر ان حضرات کی طرف سے اس قسم کا مشورہ ان کے فکری تضاد ہی کا غماز کہلائے گا۔

ان کی ایک دلیل ان کا یہ کہنا بھی ہے کہ مدینہ اور حجاز کا معاشرہ بدوی تھا اور وہاں دوسری تہذیبوں کے اثرات کم تھے۔ یہ وہی بات ہے جو متجددین بھی کہتے ہیں اور وہ اس حوالے سے عورت کو مغرب کی طرح مادر پدر آزادی دینا چاہتے ہیں اور اسلامی احکام میں ایسی ترمیم و اصلاح کرنا پسند کرتے ہیں جس سے اسلامی تہذیب کی خصوصیات ختم اور مغرب کی حیا باختہ تہذیب کا جواز ثابت ہو جائے، حالانکہ اسلام ایک ایسا ابدی مذہب ہے جس کے ساتھ ہی نبوت کا خاتمہ بھی کر دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے، کسی مخصوص علاقے اور ملک کے لیے نہیں ہے اور قیامت تک کے لیے ہے، کسی محدود دور کے لیے نہیں ہے۔

اس لیے جدید مفکرین اور دانش وران عصر کا یہ دعویٰ کہ مدینہ و حجاز کا معاشرہ بدوی

تھا، یکسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے احکام کسی معاشرے کے مطابق اور اس کی رعایت میں نازل نہیں فرمائے بلکہ انسانی فطرت کے مطابق اتارے ہیں، جس میں کوئی تبدیلی جغرافیائی اعتبار سے آ سکتی ہے نہ لیل ونہار کی کسی گردش سے، یعنی زمان و مکان اور اس کی تبدیلیوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انسان کسی بھی علاقے اور ملک سے تعلق رکھتا ہو اور قیامت تک کسی بھی زمانے میں وہ وجود پذیر ہو۔ اسلامی احکام وتعلیمات اس کے لیے مینارۂ نور، مشعل ہدایت اور ضابطۂ حیات ہے۔ اس سے انحراف میں اس کے لیے گمراہی، تاریکی اور بربادی ہے۔ امن وسکون اور نجات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی احکام قیامت تک کے لیے نازل کیے ہیں، انسانی فطرت سے بھی وہ آ گاہ ہے بلکہ صرف وہی آ گاہ ہے کیونکہ وہی انسان کا خالق ہے، اس لیے ہر دور کے انسان کی نجات، چاہے وہ ترقی کر کے چاند پر پہنچ جائے، احکام الٰہی کی پیروی ہی میں ہے۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا کوئی مجاز ہے نہ اس کی اصلاح ہی ممکن ہے۔ اس میں اصلاح وترمیم ایسے ہی ہے جیسے کسی طبیب حاذق کے نسخے میں کوئی عطائی نیم حکیم اپنی طرف سے، بزعم خویش، اسے بہتر بنانے کے لیے ردوبدل کر دے۔

مغرب کی کامیابی، لادینیت کا نہیں، مسلسل عمل اور علم وہنر کا نتیجہ ہے

ہمیں یہ دیکھ کر کہ مغرب میں عورت، مرد کے دوش بدوش ہر کام میں حصہ لے رہی ہے، اس پر پردے کی یا اپنی عصمت کے تحفظ کی کوئی پابندی نہیں ہے، وہ ہر معاملے میں خود مختار ہے، والدین کا اس پر کوئی دباؤ ہے نہ خاوند کا کوئی اثر اور نہ خاندان کا کوئی نظام۔ وہ والدین کی موجودگی میں بھی اپنے رفیق حیات کے انتخاب میں آزاد ہے اور عقد نکاح میں بندھنے کے باوجود صرف اپنے شوہر کے ساتھ ہی وابستہ رہنے کی پابند نہیں۔ وہ ایک مرد کی بیوی ہونے کے باوصف کئی مردوں سے دوستانہ تعلق قائم کر سکتی اور رکھ سکتی ہے۔

مغرب میں عورت کی یہ آزادی دیکھ کر بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ مغرب کی ترقی کا راز اسی نظریۂ مساوات مرد وزن میں مضمر ہے۔ اس کی خیرہ کن اور محیر العقول ایجادات کی وجہ عورت کی بے پردگی اور اس کی اخلاق باختگی ہے اور مادّی آسائشوں اور سہولتوں کی فراوانی، ہر قسم کی پابندی سے آزادی کا نتیجہ ہے، اس لیے وہ مشورہ دیتے ہیں کہ اب معاشرہ بہت بدل گیا ہے۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ ہمیں بھی مغرب کی طرح عورت کو کچھ نہ کچھ آزادی دینی چاہیے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مغرب کی ترقی لادینیت اختیار کرنے اور عورت کو گھر سے باہر نکال کر بے پردہ کر دینے کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی پشت پر اصل چیز ان کی منصوبہ بندی اور اس پر عمل، علم و ہنر کا حصول اور اس کا صحیح استعمال، نظم و ضبط اور قانون کی پابندی وغیرہ، خوبیاں ہیں۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ جنھوں نے خود مغرب میں رہ کر ہر چیز کا مشاہدہ کیا تھا، یورپ کی ترقی پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ رُو است
نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ مُو است
محکمیٔ او نہ از لادینی است
نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و بریدِ جامہ نیست
مانعِ علم و ہنر عمامہ نیست

بہر حال عورت کے بارے میں اسلام نے جو کچھ بھی احکام دیے ہیں، اس سے ایک تو اسلام کے تصور حیاء وعفت کا تحفظ مقصود ہے۔ مغرب نے عورت کی عفت و تقدس کی ردا کو تار تار کر کے پھینک دیا ہے، اس لیے اس کی حفاظت کی ان کے ہاں کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔ دوسرا مقصد، اسلام کا عورت کی صنفی مجبوریوں اور اس کی فطری استعداد و صلاحیت کا احترام و رعایت ہے۔ اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ مرد اور عورت دونوں کا مقصد تخلیق ایک دوسرے سے جدا ہے اور اسی اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے دونوں کی فطری صلاحیتوں اور قوت عمل میں بھی فرق رکھا ہے۔ شریعت اسلامیہ نے اسی لیے دونوں کا دائرۂ کار بھی ایک دوسرے سے الگ رکھا ہے۔ ایک کا دائرۂ عمل گھر کی چار دیواری ہے، وہاں کے خانگی امور ہیں، بچوں کی نگرانی اور دیکھ بھال ہے، خاوند کی خدمت و اطاعت ہے۔ دوسرے کا دائرۂ عمل گھر سے باہر ہے، وہ محنت مزدوری کرے یا ملازمت، کھیتی باڑی کرے یا تجارت، کسب معاش اسی کی ذمے داری ہے۔ عورت صرف گھر کی ملکہ ہے، اس کا کام سڑکوں کی خاک چھاننا نہیں ہے، ملازمت کے لیے در بدر کی ٹھوکریں کھانا نہیں ہے، غیروں کی ناز برداری یا اپنے ناز وادا سے ان کا دل بہلانا نہیں ہے۔

اس لیے ہمارا پختہ ایمان ہے کہ دیگر تعلیمات کی طرح عورت کے بارے میں بھی اسلام کا ایک ایک حکم حکمت بالغہ پر مبنی ہے اور انسانی معاشروں کی اصلاح اور انسانیت کی فلاح و بہبود ان احکام کی پابندی ہی میں منحصر ہے۔ ان سے انحراف میں فساد اور بربادی ہی بربادی ہے ان سے صرف نظر، یا گریز واعراض کر کے کوئی معاشرہ حقیقی فلاح اور امن وسکون سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا، بنابریں اس کے کسی حکم میں حالات وزمانے کے اعتبار سے ترمیم اور حک واضافہ نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ اس ذات کے نازل کردہ ہیں جو "عَالِمُ مَا كَانَ وَمَا يَكُونُ" ہے جو ماضی اور حاضر و مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات سے باخبر ہے۔

مرد کا چار تک شادیاں کرنے کا اختیار

تعدُّدِ ازدواج اور اس کی حکمتیں

عورت کے امتیازی مسائل میں ایک مسئلہ تعددِ ازدواج کا بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مرد بیک وقت ایک سے زیادہ چار تک بیویاں رکھ سکتا ہے جبکہ عورت ایک وقت میں ایک مرد سے زیادہ تعلق زوجیت قائم نہیں کرسکتی۔ یہ مسئلہ قرآن و حدیث کی نصوص سے ثابت ہے جس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝﴾

''اگر تم اس بات سے ڈرو کہ تم یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے انصاف نہیں کرسکو گے تو تم دوسری عورتوں سے، جو تمھیں زیادہ پسند ہوں، نکاح کرلو، دو دو، تین تین اور چار چار سے، تاہم اگر تمھیں یہ اندیشہ ہو کہ تم (ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی صورت میں ان کے مابین) انصاف (عدل) نہیں کرسکو گے تو پھر ایک ہی عورت سے (نکاح کرو) یا (ان سے استمتاع کرو) جس کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہیں۔ یہ زیادہ قریب ہے اس بات کے کہ تم ناانصافی نہ کرو۔''[1]

[1] النسآء 4:3 .

اس آیت سے بیک وقت چار عورتوں تک شادی کرنے کی اجازت ثابت ہوتی ہے۔
اس آیت کی تفسیر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس طرح مروی ہے کہ صاحب حیثیت اور صاحب جمال یتیم لڑکی کسی ولی کے زیر پرورش ہوتی تو وہ اس کے مال اور حسن و جمال کی وجہ سے اس سے شادی تو کر لیتا لیکن اس کو دوسری عورتوں کی طرح اس کا پورا حق مہر نہ دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس ظلم سے روکا کہ اگر تم گھر کی یتیم بچیوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے تو تم ان سے نکاح ہی مت کرو، تمھارے لیے دوسری عورتوں سے نکاح کرنے کا راستہ کھلا ہے۔[1]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان مرد اگر ضرورت مند ہے اور بیویوں کے درمیان عدل و انصاف کا اہتمام بھی کر سکتا ہے تو چار عورتیں بیک وقت اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے لیکن اس سے زیادہ نہیں جیسا کہ صحیح احادیث میں اس کی مزید صراحت اور تحدید کر دی گئی ہے۔

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو چار سے زائد شادیاں کیں وہ آپ کے خصائص میں سے ہے جس پر کسی امتی کے لیے عمل کرنا جائز نہیں۔[2]

تاہم اس اجازت کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ عافیت ایک ہی عورت سے شادی کرنے میں ہے کیونکہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی صورت میں انصاف کا اہتمام بہت مشکل ہے جس کی طرف قلبی میلان زیادہ ہوگا، ضروریات زندگی کی فراہمی میں زیادہ توجہ بھی اسی کی طرف ہوگی۔ یوں بیویوں کے درمیان وہ انصاف کرنے میں ناکام رہے گا اور اللہ کے ہاں مجرم قرار پائے گا۔ قرآن نے اس حقیقت کو دوسرے مقام پر نہایت بلیغانہ انداز میں اس طرح بیان فرمایا:

1 صحيح البخاري، التفسير، باب ﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتٰمٰى﴾، حديث: 4574.
2 تفسير ابن كثير: 182/2.

﴿وَلَن تَسْتَطِيعُوٓا أَن تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ﴾

''اور تم سے یہ کبھی نہ ہو سکے گا کہ تم اپنی بیویوں میں ہر طرح سے عدل کرو، خواہ تم اس کی کتنی ہی خواہش رکھو، پھر تم کسی ایک کی طرف پوری طرح مائل نہ ہو جاؤ کہ دوسری کو بیچ میں لٹکتی چھوڑ دو۔''[1]

یہ دوسری آیت بھی ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت میں نص صریح ہے، اس لیے کہ یہاں بھی اللہ نے متعدد بیویوں کے درمیان انصاف کرنے کو نہایت مشکل عمل بتلایا ہے لیکن اس کے باوجود اس اجازت کو ختم نہیں فرمایا بلکہ کسی بیوی کو یکسر نظرانداز کرنے سے منع فرمایا ہے اور یہ تاکید کی ہے کہ اگر قلبی میلان میں تم خواہش رکھنے کے باوجود عدل نہیں کر سکتے تو تم باری مقرر کرنے اور نان ونفقہ اور دیگر ضروریات مہیا کرنے میں تو عدل کرو اور کسی ایک بیوی کو بالکل فراموش نہ کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ شادی ناگزیر ضرورت کے بغیر کرنا نامناسب اور نہایت خطرناک ہے، تاہم عندالضرورت اس کے جواز میں کوئی شک نہیں جیسا کہ قرآن کریم کی دونوں آیات سے واضح ہے۔

اور پہلی آیت سے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ آیت میں عدد کے تینوں کلمات عدل اور وصف کی بنیاد پر غیر منصرف ہیں۔ گویا یہ معدول ہیں۔ یہ کس سے معدول ہیں؟ یہ معدول (پھرے ہوئے) ہیں اِثْنَيْنِ، ثَلَاثَة اور أَرْبَعَة سے۔ اوران میں سے ہر ایک اپنی نوع کی تکرار پر دلالت کرتا ہے۔ پس ''مثنٰی'' اِثْنَيْنِ اِثْنَيْنِ ''ثُلَاث'' ثَلَاثَةْ ثَلَاثَةْ اور ''رُبَاعَ'' أَرْبَعَةَ أَرْبَعَةَ پر دلالت کرتا ہے، جیسے کہا جائے: جَآءَنِي الْقَوْمُ مَثْنٰى أَوْ ثُلَاثَ أَوْ

[1] النسآء 4:129۔

رُبَاعَ تو اس کے معنی ہوں گے، میرے پاس قوم کے لوگ دو دو، یا تین تین یا چار چار کر کے آئے۔ یہ عربی زبان کا ایسا اسلوب ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس اعتبار سے آیت میں یہاں ان الفاظ کا ترجمہ، دو دو، تین تین اور چار چار ہی ہوگا، جس سے بیک وقت ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنے کا جواز اور چار سے زائد کا عدم جواز ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں آگے ''فَوَاحِدَةً'' سے بھی اس کی تائید ہو رہی ہے، یعنی اگر تم محسوس کرو کہ ایک سے زائد 2 یا 3 یا 4 بیویوں کے درمیان تم انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی عورت سے نکاح کرو۔

اس تفسیر کی تائید احادیث صحیحہ سے ہوتی ہے۔ بعض صحابہ جب مسلمان ہوئے تو ان کے عقد میں چار سے زائد بیویاں تھیں، مثلاً: قیس بن حارث کے نکاح میں آٹھ اور غیلان بن سلمہ ثقفی کے نکاح میں 10 بیویاں تھیں۔ قبول اسلام کے بعد نبی ﷺ نے ان سے فرمایا:

«اِخْتَرْ مِنْهُنَّ أَرْبَعًا»

''ان میں سے چار کو پسند کرلو۔''[1]

یعنی باقی کو طلاق دے کر اپنے حبالۂ عقد سے خارج کر دو۔ بہرحال قرآن وحدیث سے بیک وقت زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھنا ثابت ہے، بشرطیکہ ان کے درمیان عدل وانصاف کا اہتمام کیا جا سکے۔ بیویوں کے درمیان عدل کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ان کی باریاں مقرر کرنے میں، انھیں خوراک، پوشاک، رہائش اور دیگر ضروریات مہیا کرنے

---

1 سنن أبي داود، الطلاق، باب في من أسلم وعنده نساء أكثرمن أربع أوأختان، حديث: 2241، وجامع الترمذي، النكاح، باب ماجاء في الرجل يسلم وعنده عشر نسوة، حديث: 1128، و سنن ابن ماجة، النكاح، باب الرجل يسلم وعنده أكثر من أربع نسوة، حديث: 1953,1952.

میں مساوات برتے۔ یہ نہ کرے کہ جس کے ساتھ محبت اور تعلق خاطر زیادہ ہو تو مادی ضروریات مہیا کرنے میں بھی اس کے ساتھ ترجیحی سلوک کرے۔ اگر ایسا کرے گا تو یہ ظلم ہوگا۔ ایسے شخص کی بابت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا كَانَ عِنْدَ الرَّجُلِ امْرَأَتَانِ، فَلَمْ يَعْدِلْ بَيْنَهُمَا، جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَشِقُّهُ سَاقِطٌ»

"جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان عدل نہ کرے تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے جسم کا ایک حصہ، یعنی نصف ساقط ہوگا۔"[1]

تعددِ ازدواج کی حکمتیں

مذکورہ تفصیل سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو یہ اجازت دی ہے کہ اگر وہ ایک سے زیادہ بیویوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو عدل و انصاف مہیا کرنے کے ساتھ وہ بیک وقت چار تک بیویاں رکھ سکتا ہے اور یہ صرف اجازت ہے جس سے بوقت ضرورت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کا حکم ایسا نہیں ہے کہ جس پر عمل کرنے کی ہر مسلمان کوشش کرے۔

اجازت اور حکم کے فرق کو نظر انداز کر کے بعض لوگ اسلام کی اس نہایت اہم اجازت پر بڑی نکتہ چینی کرتے ہیں، حالانکہ یہ اجازت اسلام کی عظیم خوبیوں میں سے ایک نہایت عظیم خوبی ہے کیونکہ بعض دفعہ مرد کے لیے ایک سے زیادہ بیویاں ناگزیر ہو جاتی ہیں اور بعض دفعہ کچھ اور مصلحتیں اس کی متقاضی ہوتی ہیں، اس لیے جہاں کوئی ضرورت یا مصلحت ہو، وہاں دوسری، تیسری اور چوتھی شادی کرنا جائز ہوگا۔ اس کی چند حکمتیں اور مصلحتیں، جو

1 جامع الترمذي، النكاح، باب ما جاء في التسوية بين الضرائر، حديث: 1141 .

علماء نے بیان فرمائی ہیں، حسب ذیل ہیں:

① نکاح کا مقصد جہاں جنسی خواہش کی تسکین ہے، وہاں دوسرا مقصد اولاد کا حصول بھی ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو جو ایک ایسی عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا جو صاحب جمال بھی تھی اور صاحب حسب بھی لیکن اس سے اولاد کی امید نہیں تھی۔ آپ نے اس عورت سے شادی کرنے کی اجازت مرحمت نہیں فرمائی۔ وہ دوسری مرتبہ آیا تب بھی اجازت نہیں دی، تیسری مرتبہ جب وہ اسی عورت سے شادی کرنے کے لیے اجازت طلب کرنے آیا تو نبی ﷺ نے فرمایا:

«تَزَوَّجُوا الْوَدُودَ الْوَلُودَ فَإِنِّي مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْأُمَمَ»

''تم زیادہ محبت کرنے والی اور زیادہ بچے جننے والی عورت سے شادی کرو، اس لیے کہ میں تمھاری وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔''[1]

خوب محبت کرنے والی بیوی سے انسان کو تسکین اور زیادہ بچے جننے والی بیوی سے اولاد حاصل ہوتی ہے اور یہ دونوں ہی خواہشیں فطری ہیں۔ جنسی جذبات بھی انسان کی فطرت کا ایک حصہ ہیں اور انسان محنت اور جدوجہد کر کے مال و دولت حاصل کرتا اور جائیداد بناتا ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ترکے کا کوئی وارث بھی ہو۔ یہ خواہش بھی جائز اور فطری ہے لیکن بعض دفعہ ایک مرد جس عورت سے شادی کرتا ہے، وہ بانجھ ہوتی ہے اور مرد کا وارث پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم حتی کہ ہر طرح کا علاج کرنے کے باوجود عورت کا بانجھ پن ختم نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں مرد کے لیے دو راستے ہیں۔

① وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر اپنے گھر سے رخصت کر دے اور اسے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔

1 سنن أبي داود، النكاح، باب النهي عن تزويج من لم يلد من النساء، حديث: 2050.

② یا اس کے ساتھ ساتھ ایک اور شادی کر لے تاکہ اس کی پہلی بیوی کی زندگی بھی برباد نہ ہو اور اس کی اولاد کی خواہش بھی پوری ہو جائے۔ دوسری بیوی سے بھی یہ خواہش پوری نہ ہو تو وسائل، طاقت اور انصاف کی شرط کے ساتھ وہ چار تک شادیاں کر سکتا ہے۔

اب بتلایا جائے کہ پہلا راستہ بہتر ہے جس میں ایک جوان عورت بے سہارا بھی ہو جاتی ہے اور جنسی خواہش کی تسکین کے جائز طریقے سے محروم بھی اور اس کے بانجھ پن کی وجہ سے اس کی دوبارہ شادی کے امکانات بھی بہت کم ہوتے ہیں، یا دوسرا راستہ بہتر ہے جس میں پہلی بیوی مذکورہ دونوں خرابیوں سے محفوظ رہتی ہے؟

علاوہ ازیں اس صورت میں اسلام نے مرد کو دوسری شادی کی اجازت دے کر عورت پر ظلم کیا ہے یا اس کی عزت و وقار کا تحفظ؟ ہر سمجھ دار آدمی کا جواب یہی ہوگا کہ دوسرا راستہ ہی ہر لحاظ سے بہتر اور عورت کی عزت و وقار کا محافظ ہے۔

② اسی طرح بعض دفعہ عورت بیمار اور مرد کی جنسی خواہش پوری کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتی ہے۔ اس صورت میں بھی مرد کے لیے مذکورہ دو راستوں میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے یہاں بھی عورت کے لیے دوسرا راستہ ہی بہتر ہے کیونکہ وہ بے سہارا اور بے مرد ہونے سے بچ جائے گی۔

③ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ معاشرے میں عورتوں کی کثرت اور مردوں کی قلت ہو جاتی ہے، بالخصوص جنگوں میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اب یک زوجی پر اصرار کر کے بے حیائی کا راستہ کھولنا صحیح ہوگا یا متعدد شادیوں کی اجازت دے کر بے حیائی کے راستے کو مسدود کر دینا؟

اسلام نے یہاں بھی دوسرا راستہ اختیار کر کے عورتوں کی کفالت کا آبرومندانہ انتظام بھی کیا ہے اور ان کی عزت و عصمت کے تحفظ کا اہتمام بھی۔

④ بعض مرد ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے اندر جنسی خواہش اور قوت زیادہ ہوتی ہے، ایک عورت سے ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی، بالخصوص ماہواری کے ایام میں، جبکہ عورت سے ہم بستری شرعًا ممنوع ہے، ایسے مردوں کے لیے بدکاری کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ شریعت نے ایسے لوگوں کو چار تک بیویاں رکھنے کی اجازت دے کر بدکاری کا راستہ بند کر دیا ہے۔

مغرب میں ایک سے زیادہ شادی کرنا قانونًا ممنوع ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں مذکورہ قسم کے مردوں نے بغیر شادی کیے کئی کئی عورتوں سے جنسی تعلقات قائم کر رکھے ہیں اور یوں بے حیائی اور بدکاری وہاں عام ہے۔ کیا ایسے مردوں کے لیے ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت معقول راستہ ہے جس میں وہ تعلقات زوجیت کے نتائج و اثرات کا ذمے دار ہوتا ہے یا حرام کاری کا راستہ معقول ہے جس میں مرد صرف جنسی خواہش کی تکمیل تو کر لیتا ہے لیکن اس کے نتائج کا ذمے دار نہیں ہوتا۔ ظاہر بات ہے کہ سمجھ دار آدمی پہلے ہی راستے کو معقول قرار دے گا جس سے معاشرے میں جنسی انارکی پھیلتی ہے نہ حرام اولاد کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

⑤ بعض دفعہ ایک عورت جوانی ہی میں بیوہ ہو جاتی ہے، ایسی صورت میں اس کے قریبی اعزہ کا اس کے ساتھ دوسری شادی کر کے اس کو سہارا مہیا کرنا، اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کرنا اور اس کے بچوں پر دست شفقت رکھنا زیادہ معقول راستہ ہے یا دوسری شادی پر قدغن عائد کر کے، بیوہ عورت اور اس کے معصوم بچوں کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا معقول راستہ ہے؟ یہاں بھی ہر معقول آدمی پہلے راستے ہی کو معقول قرار دے گا۔

بہر حال یہ اور اسی قسم کی دیگر مصلحتوں اور حکمتوں ہی کی وجہ سے اسلام نے دوسری، تیسری اور چوتھی شادی کی اجازت دی ہے۔ اسلام کے اس پر حکمت نظام کی برکت ہے:

- مسلمان معاشروں میں بدکاری عام نہیں ہے۔
- وہاں حرام اولاد کا مسئلہ اتنا زیادہ نہیں ہے۔
- وہاں خاندانی نظام بہت حد تک ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ ہے۔
- اور حیا وعفت کے تحفظ کا احساس عام اور جذبہ قوی ہے۔

اس کے برعکس مغربی معاشرے میں، جہاں ایک سے زیادہ شادی تو ممنوع ہے لیکن مرد وعورت کو ایک دوسرے کے ساتھ دوستیاں قائم کرنے کی اجازت ہے، بدکاری عام ہے، حرام اولاد کی بہتات ہے، خاندانی نظام بکھر گیا ہے اور حیا وعفت کا تصور ختم ہو گیا ہے۔ گویا ایک سے زیادہ عورتوں سے تعلق قائم کرنے اور ان سے ''استمتاع'' کرنے کی تو مغرب میں عام اجازت ہے لیکن اس کے نتائج برداشت کرنے کے لیے وہ تیار نہیں۔ یہ عورت پر ظلم نہیں تو کیا ہے؟ اسلام اس ظلم کی بجائے یہ تلقین کرتا ہے کہ اگر تمھارا کسی وجہ سے ایک عورت سے گزارا نہیں ہوتا تو تم چار تک بیویاں رکھ سکتے ہو لیکن اس کے جو تقاضے اور ذمے داریاں ہیں، انھیں بھی پورا کرنا ہوگا۔ یہ اجازت محض جنسی لذت و استمتاع ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے قانونی اور معاشرتی تقاضوں کی تکمیل بھی ضروری ہے۔

عورت بیک وقت ایک سے زیادہ مردوں سے نکاح نہیں کرسکتی

مرد کو تو اللہ تعالیٰ نے یہ اجازت دے دی ہے کہ وہ بیک وقت چار تک شادیاں کرسکتا ہے، بشرطیکہ وہ اس کی استطاعت رکھتا اور عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرسکتا ہو لیکن عورت کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ بیک وقت چار مردوں سے زوجیت کا تعلق استوار کر لے۔ اس میں عورت کی کمزوری کے علاوہ نسب کی حفاظت وغیرہ کے مقاصد بھی شامل ہیں۔ ہر شخص یہ بات سمجھتا اور تسلیم کرتا ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں کمزور ہے، اس

لیے مرد تو بیک وقت ایک سے زیادہ بیویوں سے زوجیت کا تعلق قائم کر سکتا اور نبھا سکتا ہے لیکن عورت بالعموم ایسا نہیں کر سکتی۔

علاوہ ازیں ایک عورت کے تین چار خاوند ہوں تو ان کے درمیان رقیبانہ اور حریفانہ کشمکش رہے گی جو عورت کی زندگی کو اجیرن بنانے کے لیے کافی ہے۔ اس کا اندازہ ان واقعات سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے جو ان بے حیا عورتوں کے ساتھ پیش آتے رہتے ہیں جو بیک وقت کئی مردوں سے محبت اور آشنائی کے تعلقات قائم کر لیتی ہیں۔ وہ یا تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں کیونکہ محبوب کی محبت میں دوسروں کی شرکت ان کو گوارا نہیں ہوتی یا کوئی آشنا اس محبوبہ کو ہی یہ کہہ کر موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے کہ یہ ہرجائی اور بے وفا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے مرد کی فطرت میں یہ بات رکھی ہے کہ وہ جس عورت سے محبت رکھتا ہے، اس میں وہ کسی اور کی شرکت برداشت نہیں کر سکتا۔ اس اعتبار سے عورت کی بابت اللہ کا یہ فیصلہ کہ وہ صرف ایک ہی مرد کی بیوی بن سکتی ہے، بیک وقت کئی مردوں کی نہیں، انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور اسی میں عورت کی عزت و وقار اور اس کی جان کا تحفظ ہے اور سب سے بڑھ کر نسب کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔

اسلام میں تحفظ نسب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ شادی شدہ مرد یا عورت اگر زنا کا ارتکاب کرے تو اسلام میں اس کی سزا رجم ہے۔ اتنی سخت سزا کیوں ہے؟ اسی لیے کہ شادی شدہ مرد و عورت کی زنا کاری سے نسب کا معاملہ مشکوک ہو جاتا ہے۔ کنوارے زانی یا زانیہ کے عمل فاحشہ سے نسب کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا، اس لیے ان کی سزا بھی ہلکی، یعنی سو کوڑے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ طلاق یافتہ عورت یا فوت شدہ خاوند کی بیوی عدت کے اندر کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ مطلقہ کی عدت 3 حیض یا 3 مہینے یا وضع حمل اور فوت شدہ خاوند کی بیوی کی عدت 4 مہینے اور 10 دن یا وضع حمل ہے۔

اس عدت کا مقصد بھی استبرائے رحم ہے، یعنی اس عدت سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے رحم میں اس کے خاوند کا نطفہ نہیں ہے اور وضع حمل سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے، اس لیے اس کے بعد ان عورتوں کو اجازت ہے کہ وہ نئی جگہ شادی کر لیں۔ اب سوچیں کہ اگر عورت کے دو یا تین یا چار خاوند ہوں تو اس عورت کو جو حمل ٹھہرے گا، وہ کس خاوند کا شمار ہوگا اور ہونے والی اولاد کا باپ کون ہوگا؟ اگر وہ سارے ہی خاوند اولاد کی ذمے داری قبول کرنے سے گریزاں ہوں گے تو ان میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرے گا کہ یہ اولاد میرے نطفے سے نہیں ہے اور اگر ان میں سے سارے ہی اولاد کے خواہاں ہوں گے تو ہر ایک کہے گا کہ یہ ہونے والا بچہ میرے ملاپ کا نتیجہ ہے۔ کیا اس صورت میں قطعیت کے ساتھ بچے کی نسبت اُبُوَّت کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا اسے حل کیے بغیر نسب کی حفاظت ممکن ہے جس کی اسلام میں بڑی تاکید ہے؟

بنابریں عورت کی بابت یہ امتیازی حکم کہ وہ مرد کی طرح ایک سے زیادہ خاوند نہیں کر سکتی، متعدد حکمتوں پر مبنی ہے۔ اس میں عورت کی فطری کمزوری کا بھی لحاظ ہے اور نسب کی حفاظت بھی پیش نظر، علاوہ ازیں حسن و جمال کی دنیا میں رقیبانہ و حریفانہ کشاکش کا خاتمہ بھی اور یہ سب باتیں ایسی ہیں جن سے مقصود عورت کا تحفظ اور معاشرے کو بے حیائی سے بچانا ہے۔
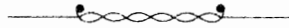
مرد کا حق طلاق اور اس کی حکمت

مرد وعورت کے درمیان نکاح کا رشتہ قائم ہو جانے کے بعد اکثر مذاہب میں علیحدگی اور طلاق کا کوئی تصور نہیں ہے، حالانکہ بعض دفعہ جب دونوں کے مزاجوں میں موافقت اور ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکے تو طلاق اور علیحدگی ہی میں دونوں کی بھلائی ہوتی ہے، اس لیے اسلام نے مرد کو طلاق کا حق دیا ہے اور یہ بھی اس کی ان امتیازی خصوصیات میں سے ہے جن میں مرد اور عورت کے درمیان فرق کیا گیا ہے، تاہم مرد کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنے اس حقِ طلاق کو آخری چارۂ کار کے طور پر ہی استعمال کرے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ایک طرف مرد کو حق طلاق دیا ہے تو دوسری طرف اسے ایسی ہدایات بھی دی ہیں جنھیں اختیار کرنے سے عام طور پر طلاق تک نوبت ہی نہیں پہنچتی۔ لیکن عوام کی اکثریت چونکہ اسلامی تعلیمات کا صحیح شعور نہیں رکھتی، اس لیے معمولی تلخیاں بھی طلاق پر منتج ہوتی ہیں۔ بنابریں ضروری ہے کہ مرد ان ہدایات اور تعلیمات کا بھی صحیح شعور حاصل کریں جو اسلام نے بیوی کے ساتھ نباہ کرنے کے لیے دی اور بتلائی ہیں۔ اس کی تفصیل ہماری کتاب ''ایک مجلس میں تین طلاقیں اور اس کا شرعی حل'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

عورت کو اللہ نے طلاق کا حق کیوں نہیں دیا؟

عورت کو اللہ نے یہ حق کیوں نہیں دیا کہ وہ مرد کو جب چاہے طلاق دے کر اس سے

علیحدہ ہو جائے؟ اس کی حکمت یہ ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں جسمانی اعتبار سے بھی کمزور ہے اور ذہنی و دماغی صلاحیتوں میں بھی کم تر۔ جسمانی کمزوری کی وجہ سے اس کے اندر صبر و ضبط کی کمی ہے اور دماغی صلاحیتوں میں تفاوت کی وجہ سے اس کے اندر سوچنے سمجھنے کی استعداد بھی کم ہے اور ان دونوں کمزوریوں کی وجہ سے اس کے فیصلے میں عجلت اور جذباتیت کا عنصر غالب رہتا ہے۔ اگر عورت کو بھی طلاق کا حق مل جاتا تو وہ اپنا یہ حق نہایت جلد بازی یا جذبات میں آ کر استعمال کر لیا کرتی اور اپنے پیروں پر آپ کلہاڑا مار لیا کرتی۔ اس سے معاشرتی زندگی میں جو فساد اور بگاڑ پیدا ہوتا، اس کا تصور ہی نہایت روح فرسا ہے۔ اس کا اندازہ آپ مغرب اور یورپ کی ان معاشرتی رپورٹوں سے لگا سکتے ہیں جو وہاں عورتوں کو حق طلاق مل جانے کے بعد مرتب اور شائع ہوئی ہیں۔

ان رپورٹوں کے مطالعے سے اسلامی تعلیمات کی حقانیت کا اور عورت کی اس کمزوری کا اثبات ہوتا ہے جس کی بنا پر مرد کو تو حق طلاق دیا گیا ہے لیکن عورت کو یہ حق نہیں دیا گیا۔ عورت کی جس زود رنجی، سریع الغضبی، ناشکرے پن اور جذباتی ہونے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، حدیث سے بھی اس کا اثبات ہوتا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَرَأَيْتُ النَّارَ فَإِذَا أَكْثَرُ أَهْلِهَا النِّسَاءُ يَكْفُرْنَ، قِيلَ: أَيَكْفُرْنَ بِاللهِ؟ قَالَ: يَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ، وَيَكْفُرْنَ الْإِحْسَانَ، لَوْ أَحْسَنْتَ إِلٰى إِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا قَالَتْ: مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ»

''میں نے جہنم کا مشاہدہ کیا تو اس میں اکثریت عورتوں کی تھی (اس کی وجہ یہ ہے کہ) وہ ناشکری کا ارتکاب کرتی ہیں۔ پوچھا گیا: کیا وہ اللہ کی ناشکری کرتی ہیں؟

آپ نے فرمایا: (نہیں) وہ خاوند کی ناشکری اور احسان فراموشی کرتی ہیں۔ اگر تم عمر بھر ایک عورت کے ساتھ احسان کرتے رہو، پھر وہ تمھاری طرف سے کوئی ایسی چیز دیکھ لے جو اسے ناگوار ہو تو وہ فوراً کہہ اٹھے گی کہ میں نے تیرے ہاں کبھی بھلائی اور سکھ دیکھا ہی نہیں۔''[1]

جب ایک عورت کی افتادِ طبع اور مزاج ہی ایسا ہے کہ وہ عمر بھر کے احسان کو مرد کی کسی ایک ناگوار بات پر فراموش کر دیتی ہے تو اسے اگر حق طلاق مل جاتا تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس آسانی کے ساتھ وہ اپنا گھر اجاڑ لیا کرتی۔ عورت کے اس مزاج کو صرف نبیٔ کریم ﷺ ہی نے بیان نہیں فرمایا بلکہ دانش ورانِ مغرب اور ان کے مفکرین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ بہر حال عورت کی یہی وہ کمزوری ہے جس کی وجہ سے اللہ نے مرد کو حق طلاق دیا ہے لیکن عورت کو نہیں دیا۔ عورت کا مفاد ایک مرد سے وابستہ اور اس کی رفیقۂ حیات بن کر رہنے ہی میں ہے، نہ کہ گھر اجاڑنے میں۔ اور عورت کے اس مفاد کو، عورت کے مقابلے میں مرد ہی صبر و ضبط اور حوصلہ مندی کا مظاہرہ کر کے زیادہ ملحوظ رکھتا اور رکھ سکتا ہے۔ بنا بریں اسلام کا یہ حکم بھی عورت کے مفاد ہی میں ہے، گو آج کی عورت، گمراہ کن پروپیگنڈے کا شکار ہو کر، اسے اپنے اوپر ظلم تصور کرے لیکن اللہ ارحم الراحمین نے اس قانون طلاق کے ذریعے سے اس پر اس کی فطری کمزوری کو ملحوظ رکھتے ہوئے، رحم ہی فرمایا ہے، اس پر ظلم نہیں کیا ہے۔
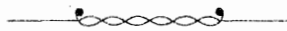
1 صحيح البخاري، الإيمان، باب كفران العشير وكفر دون كفر، حديث: 29 .

عورت کا حق خلع اور اس کے مسائل

تاہم اللہ تعالیٰ نے اس دوسرے پہلو کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ کسی وقت عورت کو بھی مرد سے علیحدہ ہونے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے، جیسے خاوند نامرد ہو، وہ عورت کے جنسی حقوق ادا کرنے پر قادر نہ ہو یا وہ نان ونفقہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو یا قادر تو ہولیکن اسے مہیا نہ کرتا ہو یا بلاوجہ اس پر ظلم وستم کرتا یا مار پیٹ سے کام لیتا ہو یا عورت اپنے بدشکل خاوند کو پسند نہ کرتی ہو اور محسوس کرتی ہو کہ وہ اس کے ساتھ نباہ یا اس کے حقوق زوجیت ادا نہیں کرسکتی۔

ان یا ان جیسی دیگر تمام صورتوں میں عورت خاوند کو یہ پیش کش کر کے کہ تو نے مجھے جو مہر اور ہدیہ وغیرہ دیا ہے، وہ میں تجھے واپس کر دیتی ہوں تو مجھے طلاق دے دے۔ اگر خاوند اس پر رضامند ہو کر اسے طلاق دے دے تو ٹھیک ہے بصورت دیگر وہ عورت عدالت یا پنچایت کے ذریعے سے خاوند سے گلوخلاصی حاصل کرسکتی ہے۔

عورت کے اس حق کو ''خلع'' کہتے ہیں۔ بعض فقہاء عورت کے اس حق خلع کو تسلیم نہیں کرتے لیکن شریعت نے اسے تسلیم کیا ہے، اس لیے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی تو اسلامی تعلیمات کا اعتدال اور حسن ہے کہ اس میں تمام فطری باتوں اور حقوق کا جواز ہے اور عورت کے لیے بعض دفعہ مذکورہ صورتوں میں علیحدگی کی ضرورت و اہمیت بلکہ ناگزیریت سے انکار کرنا، حقائق سے آنکھیں چرانا ہے جو کسی طرح بھی پسندیدہ امر نہیں۔ علاوہ ازیں اسلامی تعلیمات کے بھی مطابق نہیں۔ اس کے مختصر دلائل حسب ذیل ہیں:

جوازِ خلع کے دلائل

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّآ آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّآ أَنْ يَّخَافَآ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ ﴾

''تمھارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم نے ان (عورتوں) کو جو کچھ (مہر میں) دیا ہے (طلاق دینے کے بعد) اس میں سے کچھ (واپس) لے لو۔ مگر اس صورت میں (یہ جائز ہے) کہ وہ دونوں (میاں بیوی) یہ اندیشہ محسوس کریں کہ وہ اللہ کی حدوں کو قائم نہیں کر سکیں گے، پس اگر تم ڈرو کہ واقعی وہ دونوں اللہ کی حدوں کو قائم نہیں کر سکیں گے تو پھر عورت (خاوند سے گلو خلاصی کرانے کے لیے) جو بھی فدیہ (بدلہ) دے گی، اس میں ان دونوں (لینے دینے والوں) پر کوئی گناہ نہیں۔''[1]

یہ آیت خلع کے جواز میں نص صریح ہے۔ اس میں واضح طور پر بتلایا گیا ہے کہ طلاق کی صورت میں تو مہر میں سے کچھ بھی لینا جائز نہیں ہے، البتہ خلع میں مہر واپس لینے والے پر کوئی گناہ ہے نہ دینے والے پر کیونکہ دینے والی اپنی خوشی سے دے رہی ہے اور لینے والا والا اپنا وہ خرچ وصول کر رہا ہے جو اس نے اس عورت پر اس نقطۂ نظر سے کیا تھا کہ وہ اس کے گھر میں آباد رہے گی لیکن اب وہ آباد رہنے کے لیے تیار نہیں ہے تو اس کا یہ وہ حق ہے جو واپس لینا چاہے تو لے سکتا ہے۔

آیت میں جوازِ خلع کی وہ وجہ بھی بیان کر دی گئی ہے جس کی بنیاد پر ایسا کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ خوف ہے کہ کسی وجہ سے وہ دونوں اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے، یعنی

---

1 البقرۃ 229:2.

حق زوجیت کے ادا کرنے میں وہ کامیاب نہیں ہوسکیں گے جو نکاح کا اصل مقصد ہے۔
ظاہر بات ہے کہ جب ایک عورت مذکورہ وجوہات میں سے کسی ایک وجہ سے خاوند کو پسند ہی نہیں کرتی تو وہ خوش دلی سے خاوند کے ساتھ اپنا تعلق برقرار نہیں رکھ سکتی اور وہ اس کی جنسی خواہش پوری کرنے سے قاصر رہے گی۔

رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل اور فیصلے سے بھی خلع کا اثبات ہوتا ہے، چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ثابت بن قیس کی بیوی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی:

«يَارَسُولَ اللهِ! ثَابِتُ بْنُ قَيسٍ مَا أَعْتِبُ عَلَيْهِ فِي خُلُقٍ وَلَا دِينٍ، وَلٰكِنِّي أَكْرَهُ الْكُفْرَ فِي الْإِسْلَامِ، (وَفِي رِوَايَةٍ: وَلٰكِنِّي لَا أُطِيقُهُ) فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ أَتَرُدِّينَ عَلَيْهِ حَدِيقَتَهُ؟ قَالَتْ نَعَمْ، قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ اِقْبَلِ الْحَدِيقَةَ وَطَلِّقْهَا تَطْلِيقَةً»

''اللہ کے رسول! میرا خاوند ثابت بن قیس ہے میں یہ نہیں کہتی کہ وہ بد خلق ہے یا دین کے معاملے میں خراب ہے (اخلاقی اور دینی اعتبار سے اس میں کوئی عیب نہیں) لیکن میں اس بات سے ڈرتی ہوں کہ مسلمان ہوتے ہوئے کفریہ کام میں مبتلا ہو جاؤں (دوسری روایت کے الفاظ ہیں کہ میں اس کے ساتھ نباہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی) رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا: تجھے اس نے جو باغ دیا ہے وہ اسے واپس کر دے گی؟ اس نے کہا: ہاں! تو رسول اللہ ﷺ نے (اس کے اس خاوند سے) فرمایا: ''اس سے باغ واپس لے لے اور اسے ایک طلاق دے دے۔'' [1]

اس میں کفر یا کفریہ کام سے مراد، خاوند کے حقوق ادا نہ کرنا ہی ہے کیونکہ وہ خاوند کو

---

1 صحيح البخاري، الطلاق، باب الخلع وكيف الطلاق فيه، حديث: 5273-5275 .

ناپسند کرتی تھی، جس کی صراحت دوسری روایت میں ہے کہ میں اس کے ساتھ نباہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی اور اس کی وجہ دوسری روایات میں یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ خود نہایت حسین و جمیل عورت تھی جبکہ حضرت ثابت اس کے برعکس سیاہ فام اور بدشکل تھے۔[1]

جب بدشکل ہونے کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کو خلع کا حق دے دیا جبکہ یہ انسان کے اپنے اختیار کا معاملہ بھی نہیں تو جو خاوند اپنے اختیار سے عورت کے ساتھ ظلم و زیادتی کا معاملہ کرے یا اسے نان و نفقہ مہیا نہ کرے یا وہ اس کے جنسی حقوق ادا نہ کرے یا ادا کرنے کے قابل ہی نہ ہو تو پھر عورت بذریعہ خلع ایسے خاوند سے علیحدگی کیوں اختیار نہیں کر سکتی؟ یقیناً کر سکتی ہے۔ اسلام نے ہر ظلم کا راستہ بند کیا ہے تو عورتوں پر ظلم کا راستہ وہ کیوں بند نہ کرتا؟ عورت کو خلع کا یہ حق اسی لیے دیا گیا ہے کہ وہ اس کے ذریعے سے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا انسداد کر سکے۔

نان و نفقہ مہیا نہ کرنے پر علیحدگی کا جواز

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَفْضَلُ الصَّدَقَةِ مَا تَرَكَ غِنًى، وَالْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلَى، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ، تَقُولُ الْمَرْأَةُ: إِمَّا أَنْ تُطْعِمَنِي، وَإِمَّا أَنْ تُطَلِّقَنِي وَيَقُولُ الْعَبْدُ: أَطْعِمْنِي وَاسْتَعْمِلْنِي، وَيَقُولُ الْاِبْنُ أَطْعِمْنِي إِلَى مَنْ تَدَعُنِي؟ فَقَالُوا: يَا أَبَا هُرَيْرَةَ، سَمِعْتَ هٰذَا مِنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ؟ قَالَ: لَا، هٰذَا مِنْ كِيسِ أَبِي هُرَيْرَةَ»

”افضل صدقہ وہ ہے جو (اہل و عیال کو) بے نیاز چھوڑے (ان کی ضروریات پوری کرنے کے بعد کیا جائے تاکہ وہ کسی کے محتاج نہ رہیں) اور بلند (دینے

1 فتح الباري: 400,399/9 .

والا) ہاتھ، نچلے (لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے اور آغاز اس سے کرو جس کے (اخراجات کے) کفیل اور ذمے دار تم ہو۔ عورت کہتی ہے: مجھے کھلا یا مجھے طلاق دے۔ غلام کہتا ہے: مجھے کھلا اور مجھ سے کام لے (بعض روایات میں ہے مجھے کھلا ورنہ مجھے فروخت کر دے) اور بیٹا کہتا ہے: مجھے کھلا، مجھے کس کے سپرد کر رہا ہے؟ لوگوں نے پوچھا: ابوہریرہ! کیا یہ (سب باتیں) تم نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہیں؟ انھوں نے کہا: نہیں! یہ ابوہریرہ کی زنبیل سے ہے۔''[1]

مطلب یہ ہے کہ وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ تک تو بلاشبہ نبی ﷺ کا فرمان ہے۔ اس کے بعد کا حصہ وہ ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس حدیث رسول سے سمجھا اور استنباط کیا۔ گویا ایک صحابیٔ رسول نے نبیٔ کریم ﷺ کے اس فرمان سے یہ استنباط کیا کہ ایک مرد جن لوگوں کے اخراجات کا ذمے دار ہے، وہ اس کی بیوی، غلام اور اولاد ہے (جو ابھی کمانے کے قابل نہیں ہیں) وہ انھیں نان ونفقہ مہیا کرے ورنہ ان کو آزاد کر دے، یعنی بیوی کو طلاق دے دے، غلام کو فروخت کر دے، اسی طرح اولاد بھی کسی کے سپرد کر دے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے اسی استنباط اور قول سے جمہور علماء نے استدلال کیا ہے کہ جو شخص اپنی عورت کو نان ونفقہ مہیا نہیں کر سکتا اور اس کی بنا پر عورت علیحدہ ہونا پسند کرے تو ان کے درمیان تفریق کرا دی جائے، یعنی اسے طلاق دلوا دی جائے۔[2]

اس مسئلے میں جمہور علماء نے قرآن مجید کی اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے:

﴿وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا﴾

''اور تم ان عورتوں کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت روکو تاکہ تم ان پر ظلم و

[1] صحيح البخاري، النفقات، باب وجوب النفقة على الأهل والعيال، حديث: 5355. [2] فتح الباري: 621/9.

زیادتی کرو۔‘‘[1]

یہ بات اللہ تعالیٰ نے اگرچہ طلاق کے ضمن میں بیان فرمائی ہے کہ جن عورتوں کو تم نے (پہلی یا دوسری) طلاق دی ہے اور ان کی عدت ختم ہونے کے قریب ہے تو تمھیں اختیار ہے کہ عدت گزرنے سے پہلے پہلے رجوع کر لو یا پھر ان کو اپنے سے علیحدہ کر دو (عدت گزر جانے دو) لیکن دونوں صورتوں میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ ان کو رخصت کرنا ہو تب بھی انھیں کوئی ہدیہ وغیرہ دے کر اپنے سے علیحدہ کرو اور اگر رجوع کر کے انھیں اپنے گھر دوبارہ بسانا چاہتے ہو تب بھی تمھاری نیت انھیں صحیح طریقے سے آباد کرنا ہو، انھیں نقصان پہنچانا اور ان پر ظلم و زیادتی کرنا تمھارا مقصد نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن اس میں عموم ہے کہ عورت کے ساتھ کسی وقت اور کسی حالت میں ظلم و زیادتی کرنے کی اجازت نہیں ہے، تمھارے گھر میں آباد ہے تب بھی اور طلاق دے کر تم دوبارہ آباد کرنا چاہتے ہو تب بھی۔ اگر ظلم و زیادتی کرو گے تو افسرانِ مجاز یا معاشرے کے ذمے دار افراد اس کا ازالہ کرنے کے ذمے دار ہوں گے۔ اگر خاوند حسن سلوک کا اہتمام کرنے سے قاصر ہو گا اور عورت اس بنا پر اس سے علیحدہ ہونا چاہے گی تو ان کے درمیان جدائی کرانا ضروری ہو گا۔

آثارِ صحابہ و تابعین

بعض آثارِ صحابہ اور تابعین سے بھی مذکورہ موقف کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک سرکاری حکم نامہ جاری کیا تھا:

«أَنَّهُ كَتَبَ إِلٰى أُمَرَاءِ الْأَجْنَادِ فِي رِجَالٍ غَابُوا عَنْ نِسَائِهِمْ، إِمَّا أَنْ يُنْفِقُوا وَإِمَّا اَنْ يُّطَلِّقُوا وَيَبْعَثُوا نَفَقَةَ مَا حَبَسُوا»

1 البقرة 231:2 .

''حضرت عمر نے ان لوگوں کی بابت، جو اپنی بیویوں سے عرصۂ دراز سے دور (غائب) ہیں، لشکروں کے امراء کے نام یہ لکھا کہ وہ اپنی بیویوں کا خرچ بھیجیں یا ان کو طلاق دے دیں اور جتنا عرصہ انھوں نے خرچ روکے رکھا، ان دنوں کا خرچہ بھی بھیجیں۔''[1]

اسی طرح مشہور جلیل القدر تابعی سعید بن مسیّب رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ایسا شخص جو اپنی بیوی کا نان ونفقہ مہیا کرنے سے قاصر ہے تو اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کروادی جائے۔[2]

ابوالزناد کہتے ہیں: میں نے حضرت سعید بن مسیّب سے پوچھا: کیا یہ سنت ہے؟ انھوں نے کہا: یہ سنت ہے۔ یہ نہایت قوی مرسل روایت ہے۔[3]

فقہ حنفی کی صراحت

فقہ حنفی میں نان ونفقہ مہیا نہ کرنے کی صورت میں میاں بیوی کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں بلکہ تفریق کی بجائے اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ بیوی قرض لے کر گزارہ کرتی رہے لیکن ظاہر بات ہے کہ اس موقف میں معقولیت نہیں۔ آخر ایک گھریلو عورت کو زیادہ عرصے تک کون قرض دے گا؟ یا وہ کب تک قرض لے کر گزارہ کرے گی؟ پھر اس کی ادائیگی کب اور کون کرے گا؟ چنانچہ ان مشکلات کو دیکھتے ہوئے فقہائے احناف نے بھی تفریق کی اجازت دے دی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ معاملہ شافعی حاکم کی عدالت میں لے جا کر علیحدگی کا فیصلہ لے لیا جائے۔ حنفی حاکم ازخود یہ فیصلہ نہ کرے۔[4]

لیکن یہ سیدھے طریقے سے ناک پکڑنے کی بجائے، پیچھے سے ہاتھ گھما کر ناک

1 التعليق المغني، مولانا شمس الحق عظیم آبادی: 297/3. 2 سنن الدارقطني: 297/3، حديث: 3741. 3 التعليق المغني: 297/3. 4 شرح وقاية: 174/2.

پکڑنے والی بات ہے۔ افسوس! تقلید کی جکڑ بندیوں نے عقل و دانش پر کس طرح پہرے بٹھائے ہوئے ہیں۔ الامان والحفیظ - بہرحال جو کچھ بھی ہو، بالآخر فقہائے احناف نے بھی بالواسطہ عدم نان ونفقہ کی صورت میں تفریق بین الزوجین کی اہمیت کو تسلیم کر لیا ہے۔

نامردی کی صورت میں علیحدگی کا جواز

مرد اگر نامرد ہو تو اس صورت میں بھی نکاح کا مقصد پورا نہیں ہوتا، اس لیے اس صورت میں بھی عورت کی طرف سے طلاق کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔ اگر علاج معالجے کے باوجود مرد صحیح نہ ہو تو فی الفور علیحدگی کرا دی جائے ورنہ اسے علاج کے لیے ایک سال کی مہلت دی جا سکتی ہے، چنانچہ کتب حدیث میں ہے:

«قَضٰی بِهِ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فِي الْعِنِّينِ أَنْ يُّؤَجَّلَ سَنَةً»

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نامرد کے بارے میں یہ فیصلہ فرمایا کہ اسے ایک سال تک مہلت دی جائے۔''[1]

اس کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت ابو رکانہ عبد یزید رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ انھوں نے اپنی بیوی ام رکانہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دے کر مزینہ قبیلے کی ایک عورت سے شادی کر لی تو اس عورت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر حضرت ابو رکانہ رضی اللہ عنہ کی بابت یہ شکایت کی کہ وہ نامرد ہیں، اس لیے آپ میرے اور ان کے درمیان جدائی کروا دیں۔ آپ نے اس معاملے کی تحقیق کی تو یہ بات تو صحیح ثابت نہیں ہوئی کیونکہ ان کے سب بیٹے باپ کے مشابہ تھے، تاہم آپ نے ابو رکانہ سے کہا: اسے طلاق

1 سنن الدارقطني: 3/305، و بلوغ المرام، النكاح، باب الكفاءة والخيار،

دے دو، چنانچہ انھوں نے طلاق دے دی۔[1]

اس حدیث سے واضح ہے کہ نبی ﷺ نے محض نامردی کی تہمت ہی پر خاوند کو طلاق کا حکم فرمایا۔ گو حضرت ابو رکانہ رضی اللہ عنہ نامرد نہیں تھے، اس کے باوجود یہ دیکھ کر کہ یہ عورت ان کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی، آپ نے خاوند کو اسے اپنے سے علیحدہ کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ علاوہ ازیں عورت نے بھی علیحدگی کے لیے نامردی کو جواز بنایا، گویا اس کے نزدیک بھی علیحدگی کے لیے نامردانہ پن ایک معقول سبب تھا۔ اس سے فی الجملہ مذکورہ موقف ہی کی تائید ہوتی ہے۔

بعض دیگر بیماریوں کی وجہ سے علیحدگی کا جواز

اسی طرح خاوند میں کوئی اور ایسی بیماری ہو جسے عورت ناپسند کرے اور شادی سے پہلے اس کی بابت اسے بتلایا نہ گیا ہو تو وہ بھی نکاح فسخ کرا کے خاوند سے علیحدہ ہو سکتی ہے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

«أَيُّمَا رَجُلٍ تَزَوَّجَ امْرَأَةً وَبِهَا جُنُونٌ أَوْ جُذَامٌ أَوْ بَرَصٌ فَمَسَّهَا ، فَلَهَا صَدَاقُهَا كَامِلًا ، وَذٰلِكَ لِزَوْجِهَا غُرْمٌ عَلٰى وَلِيِّهَا»

”جس آدمی نے کسی عورت کے ساتھ شادی کی (بعد میں معلوم ہوا کہ) اسے دیوانگی، کوڑھ یا برص کی بیماری ہے (تو اسے اختیار ہے کہ اسے طلاق دے کر رخصت کر دے) اور اس سے اس نے صحبت کی ہے تو اسے اس کا پورا حق مہر دینا ہوگا اور یہ مہر خاوند عورت کے ولی سے وصول کرے گا[2] (اس لیے کہ اس نے اسے عورت کے ان عیبوں سے آگاہ نہیں کیا تھا۔“)

[1] سنن أبي داود، الطلاق، باب نسخ المراجعة بعد التطليقات الثلاث، حديث: 2196 اسے شیخ البانی نے صحیح قرار دیا ہے، دیکھیے: إرواء الغليل:7/144 . [2] الموطأ، النكاح، باب ماجاء في الصداق والحباء: 2/526 به ترقيم محمد فؤاد عبدالباقي .

اس اثر میں مرد کے اختیار کا بیان ہے لیکن اس پر قیاس کرتے ہوئے یہی اختیار اس عورت کو بھی ہوگا جس کی شادی ایسے مرد سے کر دی جائے جس کو مذکورہ بیماریوں میں سے کوئی بیماری یا کوئی اور خطرناک بیماری لگی ہو اور شادی سے پہلے اس بیماری کی اطلاع اسے نہ مل سکی ہو، نیز اس بیماری کی وجہ سے وہ اس کے پاس رہنا پسند نہ کرے تو اسے بھی یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ خاوند سے بذریعۂ طلاق یا بذریعۂ عدالت یا پنچایت نکاح فسخ کرا کے علیحدگی اختیار کر لے، چنانچہ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''قیاس کا تقاضا ہے کہ ہر وہ عیب جو میاں بیوی میں سے ایک کو دوسرے سے متنفر کر دے اور اس کی وجہ سے نکاح کا مقصود، شفقت و محبت حاصل نہ ہو، وہ دونوں کے لیے اکٹھے رہنے یا نہ رہنے کے اختیار کو واجب کر دیتا ہے اور یہ اختیار اس سے زیادہ اولیٰ ہے جو خرید و فروخت میں ملتا ہے۔ جیسے ان شرطوں کا پورا کرنا، جو نکاح میں باندھی جاتی ہیں، خرید و فروخت کی شرطوں سے اولیٰ ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے کبھی کسی ''مغرور'' (جس کو فریب دیا جائے) یا ''مغبون'' (جس سے بد دیانتی کی جائے) پر اس چیز کو لازم نہیں کیا ہے جس میں ان کے ساتھ دھوکہ اور بد دیانتی کی گئی ہو۔ جو شخص بھی شریعت کے مقاصد اور اس کے عدل و حکمت اور اس پر مشتمل مصلحتوں پر غور کرے گا تو اس پر اس رائے کا راجح ہونا اور اس کا قواعد شریعت کے قریب ہونا مخفی نہیں رہے گا۔''[1]

معقول وجہ کے بغیر خلع کے مطالبے پر سخت وعید

مذکورہ تفصیل سے واضح ہے کہ ہر اس خطرناک بیماری کی وجہ سے عورت خلع کروا سکتی ہے جس سے اسے سخت نفرت و کراہت ہو اور اس کی وجہ سے وہ مرد کے وہ حقوق ادا کرنے

1 زاد المعاد: 183/5 .

سے قاصر ہو جو اس پر عائد ہوتے ہیں، چنانچہ امام زہری کا قول ہے:

«يُرَدُّ النِّكَاحُ مِنْ كُلِّ دَاءٍ عُضَالٍ»

''ہر خطرناک بیماری کی وجہ سے نکاح رد کر دیا جائے گا۔''[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اہل کار تھا جس کی بابت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو علم تھا کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اسے انھوں نے اپنے کسی کام کے لیے بھیجا تو اس نے وہاں جا کر ایک عورت سے شادی کر لی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم میں جب یہ بات آئی تو انھوں نے اس سے فرمایا: ''تو نے اس عورت کو بتلایا کہ تو اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے۔'' اس نے کہا: نہیں! تو حضرت عمر نے اس سے کہا: ''جا اسے بتلا اور پھر اسے اختیار دے (کہ وہ اس صورت میں اس کے پاس رہنا پسند کرتی ہے یا نہیں)۔''[2]

تاہم جیسے کسی معقول وجہ کے بغیر، مرد کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ طلاق کا حق استعمال کرے۔ اسی طرح عورت کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ محض ذائقے کی تبدیلی کے لیے، معقول سبب کے بغیر، خلع کا مطالبہ کرے۔ اگر کوئی عورت ایسا کرے گی تو اس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی سخت وعید بیان فرمائی ہے۔ آپ نے فرمایا:

«أَيُّمَا امْرَأَةٍ سَأَلَتْ زَوجَهَا طَلَاقًا مِنْ غَيْرِ بَأْسٍ، فَحَرَامٌ عَلَيْهَا رَائِحَةُ الْجَنَّةِ»

''جس عورت نے بغیر کسی وجہ کے اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کیا تو اس پر جنت کی خوشبو بھی حرام ہے۔''[3]

---

1 زاد المعاد: 5/184. 2 المصنف لعبد الرزاق، حديث:10346. 3 جامع الترمذي، الطلاق، باب ماجاء في المختلعات، حديث: 187، وإرواء الغليل، الخلع:7/100، حديث:2035.

خلع کے چند ضروری مسائل

خلع، طلاق ہے یا فسخ نکاح۔ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ حافظ ابن قیم نے اسے فسخ نکاح قرار دیا ہے۔[1]

فقہائے محدثین بھی اسی رائے کے قائل ہیں۔

- خلع، طہر کی حالت میں ہو یا حیض کی۔ دونوں حالتوں میں جائز ہے۔
- خلع کی عدت، ایک حیض ہے جیسا کہ احادیث میں صراحت ہے۔
- خلع میں، فدیہ یا معاوضہ زیادہ لینے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ خاوند اس سے صرف وہی لے جو اس نے مہر یا ہدیہ وغیرہ دیا ہے۔
- خلع میں خاوند کو عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، البتہ دونوں کی رضامندی سے عدت گزرنے کے بعد باہم نکاح جائز ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو زادالمعاد: 4/196-200۔
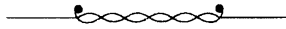
عورت اور مسئلۂ شہادت

خواتین کے امتیازی مسائل میں سے ایک مسئلہ عورت کی گواہی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ''اموال و دُیون'' کے بارے میں فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ط...... وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ ﴾

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! جب آپس میں ایک مقرر مدت تک قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو ...... اور دو مسلمان مردوں کو گواہ بنا لیا کرو۔ اگر دو مرد دستیاب نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنا لو۔''[1]

اس آیت میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیا گیا ہے اور اس کی وجہ اسی آیت میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اگر ایک خاتون بھول جائے تو دوسری عورت اسے یاد کرا دے۔ گویا قرآن کریم کی رو سے عورت کی گواہی مرد کی گواہی سے آدھی ہے اور اس کی وجہ اس کی ایک فطری کمزوری ہے وہ یہ کہ عورت کا حافظہ مرد کے مقابلے میں کمزور ہے اور اُس کے بھول چوک کا شکار ہو جانے کے امکانات زیادہ ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] البقرة 2:282۔

«يَامَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ فَإِنِّي أُرِيتُكُنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ، فَقُلْنَ وَبِمَ يَارَسُولَ اللهِ؟ قَالَ تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ، وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ، مَا رَأَيتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِينٍ أَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ إِحْدَاكُنَّ، قُلْنَ: وَمَا نُقْصَانُ دِينِنَا وَعَقْلِنَا يَارَسُولَ اللهِ؟ قَالَ أَلَيسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ؟ قُلْنَ: بَلٰى، قَالَ: فَذٰلِكَ مِنْ نُّقْصَانِ عَقْلِهَا، أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ؟ قُلْنَ: بَلٰى، قَالَ: فَذٰلِكَ مِنْ نُّقْصَانِ دِينِهَا»

''اے عورتوں کی جماعت تم (کثرت سے) صدقہ کیا کرو، اس لیے کہ میرے مشاہدے میں، جب مجھے جہنم دکھائی گئی، یہ بات آئی ہے کہ تمھاری اکثریت جہنمی ہے۔'' عورتوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ایسا کیوں ہے؟ آپ نے فرمایا: ''تم لعن طعن زیادہ کرتی ہو اور خاوند کی ناشکری کرتی ہو، میں نے عقل اور دین میں کم ہونے کے باوجود تم سے زیادہ سمجھ دار آدمی کی عقل کو ماؤف کرنے والا نہیں دیکھا۔'' انھوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ہمارے دین اور ہماری عقل میں کیا کمی ہے؟ آپ نے فرمایا: ''کیا عورت کی گواہی، مرد کی گواہی سے آدھی نہیں ہے؟'' عورتوں نے کہا: ہاں، کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''یہ عورت کی عقل کی کمی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ جب عورت کے ایام حیض شروع ہوتے ہیں تو وہ نماز پڑھتی ہے نہ روزے رکھتی ہے؟'' عورتوں نے کہا: ہاں، کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''پس یہ اس کے دین کی کمی ہے۔''[1]

عورت کے عقل و دین میں ناقص ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے

[1] صحيح البخاري، الحيض، باب ترك الحائض الصوم، حديث: 304، وصحيح مسلم، الإيمان، باب بيان نقصان الإيمان بنقص الطاعات...... ، حديث: 79.

عورت ملامت یا حقارت کی مستحق ہے بلکہ یہ عورت کی ایک فطری کمزوری کی وضاحت ہے تا کہ مرد اس کمزوری کی وجہ سے عورت کے فتنے سے بچ کر رہیں، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَلَيْسَ الْمَقْصُودُ بِذِكْرِ النَّقْصِ فِي النِّسَآءِ لَومُهُنَّ عَلٰى ذٰلِكَ، لِأَنَّهُ مِنْ أَصْلِ الْخِلْقَةِ، لٰـكِنَّ التَّنْبِيهَ عَلٰى ذٰلِكَ تَحْذِيرًا مِنَ الْافْتِتَانِ بِهِنَّ، وَلِهٰذَا رُتِّبَ الْعَذَابُ عَلٰى مَا ذُكِرَ، مِنَ الْكُفْرَانِ وَغَيْرِهِ لَا عَلَى النَّقْصِ»

''عورتوں کے نقص (کمی) کے ذکر سے مقصود، ان کو ملامت کرنا نہیں ہے، اس لیے کہ وہ پیدائشی (فطری) چیز ہے۔ اصل مقصود اس سے یہ تنبیہ کرنا ہے کہ مرد ان عورتوں کے فتنے میں مبتلا ہونے سے بچیں۔ یہی وجہ ہے کہ عورتوں کے جہنمی ہونے کا جو ذکر کیا گیا ہے تو اس کا سبب خاوند کی ناشکری وغیرہ ہے، نہ کہ عقل و دین کا نقص۔''[1]

بہر حال قرآن کریم اور حدیث رسول دونوں سے یہ بات ثابت ہے کہ عام حالات میں عورت کی گواہی، مرد کی گواہی سے نصف ہے اور اس کی وجہ اس کا مرد سے کم تر ہونا نہیں ہے بلکہ مرد سے بعض اوصاف میں کم ہونا ہے۔ اس کی تفصیل اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

عورت کی گواہی کی اقسام

عورت کی گواہی کی تین صورتیں ہیں۔

① مالی معاملات میں گواہی۔

[1] فتح الباري : 528/1 .

② ان معاملات میں گواہی جن پر صرف عورتیں ہی مطلع ہوسکتی ہیں۔

③ حدود وقصاص میں گواہی۔

پہلی قسم کا ذکر تو خود قرآن کریم میں ہے، اس لیے اس میں زیادہ اختلاف نہیں۔ دوسری قسم میں بھی اختلاف کی گنجائش نہیں کیونکہ ان معاملات میں عورت کی گواہی تسلیم کیے بغیر چارہ ہی نہیں۔

زیادہ اختلاف تیسری قسم میں ہے اور اسی گواہی میں ہی عورت کو عدالتی چکروں میں پڑنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جس میں ایک تو عورت کو بار بار گھر سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ دوسرے، مردوں کے ساتھ اختلاط ہوتا ہے اور عورت کے حق میں ان دونوں ہی باتوں کو اسلام پسند نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں عدالتی بحث و جرح کا مقابلہ کرنا بھی عورت کے لیے سخت مشکل ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم تینوں قسم کی گواہیوں پر قدرے تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

عدالتی شہادت میں عورت کی فطری کمزوری کی وضاحت

آگے چلنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی بعض فطری کمزوریوں کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے، اسے ذرا واضح کر دیا جائے کیونکہ آئندہ بحث کا مدار اسی بنیاد پر ہوگا۔

■ عورت خلقی طور پر مرد سے کمزور ہے، یہ ایسی واضح اور بدیہی چیز ہے کہ اس پر دلائل پیش کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اس کا جنسی نام ''صنف نازک'' بھی اس امر پر دال ہے۔ نبی ﷺ نے بھی [لَا تُكْسِرِ الْقَوَارِيرَ][1] فرما کر ان کو آبگینوں سے تشبیہ دی ہے۔ اسی لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«إِنَّ ضُعْفَ النِّسَاءِ بِالنِّسْبَةِ إِلَى الرِّجَالِ مِنَ الْأُمُورِ

[1] صحيح مسلم، الفضائل، باب رحمته ﷺ النساء...... ، حديث: 2323.

الْمَحْسُوسَةِ الَّتِي لَا تَحْتَاجُ إِلٰى دَلِيلٍ خَاصٍّ»

''مردوں کی نسبت عورتوں کا کمزور ہونا ایسے عام مشاہدے کی بات ہے جو کسی خاص دلیل کا محتاج نہیں۔''[1]

■ عدالتی شہادت میں بڑے بڑے زبان آور بھی تأمل اور حجاب محسوس کرتے ہیں تو عورت جرح سے کس طرح کماحقہ عہدہ برآ ہو سکتی ہے جس کے بارے میں خود قرآن نے کہا ہے: ﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ﴾ قرآن کریم میں مشرکین کے اس نظریے کی تغلیط وتردید کرتے ہوئے کہ ''فرشتے اللہ تعالیٰ کی لڑکیاں ہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿أَوَمَن يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ۝﴾

''اور کیا اسے رحمان کی اولاد قرار دیا ہے جس کی نشو ونما زیورات میں ہوتی ہے اور جھگڑے کے وقت وہ اظہار مدعا پر قادر نہیں؟''[2]

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے عورت کی دو فطری کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے۔ ایک یہ کہ عورت آرائش و زیبائش اور زیورات کی دلدادہ ہے اور دوسری، جھگڑے کے موقعے پر وہ اپنا مافی الضمیر صحیح طریقے سے ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ تمام مفسرین نے اس آیت کی تفسیر یہی کی ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے جو تشریحات پیش کی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔ پہلے چند اُردو کے تراجم اور تفاسیر ملاحظہ فرمائیں:

مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ وتفسیر

''کیا جو کہ آرائش میں نشو ونما پائے اور وہ مباحثہ میں قوت بیانیہ نہ رکھے۔''

تفسیر ''یعنی گو لڑکی ہونا فی نفسہٖ موجب عار و مذلت نہیں جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو لیکن

[1] فتح الباري:233/3. [2] الزخرف 18:43.

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ باعتبار اپنی اصل وضع کے...... قطع نظر عوارض سے...... ناقص العقل ضعیف الرائے ضرور ہے۔ جب یہ بات ہے تو کیا خدا نے اولاد بنانے کے لیے لڑکی کو پسند کیا ہے جو کہ عادتاً آرائش و زیبائش میں نشو ونما پائے (جو علامت اور نیز سبب ہے رغبت الی الحلیہ کا جس کے لوازمِ عادیہ سے ہے ضعف رائے و عقل) اور وہ بوجہ ضعف قوت فکریہ کے مباحثے میں قوت بیانیہ بھی نہ رکھے، چنانچہ ان (عورتوں) کی تقریرات میں ذرا غور کرنے سے مشاہدہ ہوتا ہے کہ نہ اپنے دعوے کو کافی بیان سے ثابت کر سکیں اور نہ دوسرے کے دعوے کو ہدم کر سکیں، ہمیشہ ادھوری بات کہیں گی یا فضول باتیں اس میں ملا دیں گی جن کو مطلوب میں کچھ دخل نہ ہو کہ اس سے بھی تبیینِ مقصود میں خلل پڑ جاتا ہے اور مباحثہ کی تخصیص اس حیثیت سے ہے کہ اس میں بوجہ زیادتی احتیاجِ بیان کے ان کا عجز زیادہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ پس ہر کلام مطول اسی کے حکم میں ہے اور معمولی جملوں کا ادا ہو جانا قوت بیانیہ کی دلیل نہیں، جیسے میں آئی تھی، وہ گئی تھی۔'' [1]

ترجمہ وتفسیر از مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی

(کیا جو آرائش میں نشو ونما پائے) اس سے معلوم ہوا کہ عورت کے لیے زیور کا استعمال اور موافق شرع آرائش کے طریقے اختیار کرنا جائز ہے، چنانچہ اس پر اجماع ہے لیکن ساتھ ہی پیرایۂ بیان یہ بتا رہا ہے کہ آرائش میں اتنا انہماک کہ صبح و شام بناؤ سنگھار ہی میں لگی رہے۔ یہ مناسب نہیں بلکہ یہ ضعف عقل ورائے کی علامت بھی ہے اور اس کا سبب بھی۔

(اور وہ مباحثہ میں قوت بیانیہ بھی نہ رکھے) مطلب یہ ہے کہ عورتوں کی اکثریت ایسی ہے کہ وہ مافی الضمیر کو قوت اور وضاحت کے ساتھ بیان کرنے پر مردوں کے برابر قادر نہیں ہوتی۔ اسی لیے اگر کہیں مباحثہ ہو جائے تو اپنے دعوے کو ثابت کرنا اور دوسرے کے

1 ترجمہ وتفسیر بیان القرآن، ص: 946، مطبوعہ تاج کمپنی۔

دلائل کو رد کرنا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے لیکن یہ حکم اکثریت کے اعتبار سے ہے، لہٰذا اگر کچھ عورتیں سلیقۂ گفتار کی مالک ہوں اور اس معاملے میں مردوں سے بھی بڑھ جائیں تو اس آیت کے منافی نہیں کیونکہ حکم اکثریت پر لگتا ہے اور اکثریت بلاشبہ ایسی ہی ہے۔"[1]

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی

کیا بیٹی (ذات) جو زیوروں میں نشو و نما پائے (اور کوئی جھگڑا آ پڑے تو) جھگڑے کے وقت (اچھی طرح) اظہارِ (مطلب) نہ کر سکے (وہ خدا کی شان کے زیبا ہے؟)

حاشیہ: عورتوں کو خدا نے ایسا ضعیف القلب پیدا کیا ہے کہ عام جلسوں میں ان سے گفتگو تک کرتے بن نہیں پڑتی اور یہ ان کا خلقی نقصان ہے، چنانچہ اب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے انگریز اپنی بی بیوں کو درباروں میں لیے پھرتے ہیں اور لوگ مارے خوشامد کے ان بی بیوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور ان کی خدماتِ ملکی گنواتے ہیں مگر ان عورتوں سے کچھ بھی کہتے بن نہیں پڑتا، ہاں، ان کے شوہر ان کی طرف سے جواب بھی دیتے ہیں، شکریہ بھی ادا کرتے ہیں۔[2]

مولانا احمد رضا خاں بریلوی

(وہ جو گہنے میں پروان چڑھے)، یعنی زیوروں کی زیب و زینت میں ناز و نزاکت کے ساتھ پرورش پائے۔[3]

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ زیور سے تزین دلیل نقصان ہے تو مردوں کو اس سے اجتناب چاہیے، پرہیزگاری سے اپنی زینت کریں۔ اب آگے آیت میں لڑکی کی ایک اور کمزوری کا اظہار فرمایا جاتا ہے۔ (اور بحث میں صاف بات نہ کرے لب، یعنی اپنے ضعف حال

---

1 معارف القرآن: 7/724۔ 2 قرآن مجید، مطبوعہ 1323ھ۔ 3 ترجمہ کنزالایمان۔

اور قلت عقل کی وجہ سے۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عورت جب گفتگو کرتی ہے اور اپنی تائید میں کوئی دلیل پیش کرنا چاہتی ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے خلاف دلیل پیش کر دیتی ہے۔"[1]

ترجمہ مولانا احمد علی لاہوری، شیخ التفسیر

"کیا اس کے لیے وہ ہے جو زیور میں پلتی ہے اور جھگڑے میں بات نہیں کر سکتی۔"[2]

ترجمہ وتفسیر مولانا ثناء اللہ امرتسری

کیا وہ بیٹی جو زیور میں نشو ونما پاتی ہے (اور مقابلے کی گفتگو میں بوجہ خلقی کمزوری کے اچھی طرح بیان نہیں کر سکتی، وہ تو خدا کے لیے اور بیٹے تمھارے لیے......۔[3]

مولانا عبدالحق حقانی دہلوی

(کیا اس کے لیے وہ ہے کہ جو زیور میں پلتی ہے اور جھگڑے میں بات بھی نہ کر سکے)

تفسیر: عرب بیٹیوں کا پیدا ہونا اپنی عزت کے خلاف جانتے تھے، اس لیے قتل کر ڈالتے تھے اور خبر سن کر بڑا رنج ہوتا تھا، پھر ایسی چیز تو آپ لے اور بیٹے تم کو دے۔ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اس کے علاوہ اولاد سے جو فائدہ تصور ہوتا ہے کہ وہ میدانِ کارزار میں کام دے اور مجالس میں سیف لسانی سے کام لے، یہ بھی ان سے حاصل نہیں۔ اس بات کو اس جملے میں بیان فرماتا ہے ﴿اَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا﴾ کہ کیا جو زیور میں اور آرائش میں پرورش پاتی ہیں (لڑکیاں) اور جھگڑوں میں گویائی سے عاجز ہیں، کیونکہ عورت کی تربیت میں زیور و آرائش ہے جو مردانگی کے خلاف ہے اور شرم ولحاظ کی وجہ سے خوب بات نہیں کر سکتیں، وہ اس نے

---

1 تفسیر مولانا نعیم الدین مرادآبادی (قرآن مجید، ص:780، طبع تاج کمپنی)۔ 2 قرآن مجید، ص:801۔

3 قرآن مجید مترجم، ص:587، مطبوعہ لاہور۔

اپنے لیے پسند کی ہیں، ہرگز نہیں۔ یہاں سے ثابت ہوا کہ زنانہ تجمل و آرائش مذموم ہے۔"[1]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

(کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث و حجت میں اپنا مدعا پوری طرح واضح بھی نہیں کر سکتی) بالفاظ دیگر جو نرم و نازک اور ضعیف و کمزور اولاد ہے وہ تم نے اللہ کے حصے میں ڈالی اور خم ٹھونک کر میدان میں اترنے والی اولاد خود لے اڑے۔ اس آیت سے عورتوں کے لیے زیور کے جواز کا پہلو نکلتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے زیور کو ایک فطری چیز قرار دیا ہے۔[2]

مولانا امیر علی ملیح آبادی

"اور کیا اس نے ایسی زنانیوں کو لے لیا جو زیور میں پلتی ہیں۔" ف: اور زینت کو اپنے نفس کے واسطے کمال سمجھتی ہیں، نہ ان میں عقل کامل ہے اور نہ دین کامل ہے اور نہ ان کے واسطے حجت و امامت ہے۔

"اور مخاصمہ کرنے میں یہ مخلوق صفائی سے بیان نہیں کر سکتی۔" ف: نہ اس کی عبادت ٹھیک ہے اور نہ اپنے دعوے کے موافق بیان کر سکتی ہے اور نہ دعوے پر حجت و برہان لا سکتی ہے اور نہ تلوار سے اپنا جھگڑا فیصل کر سکتی ہے۔ قتادہ نے کہا کہ عورت کو یہ لیاقت نہیں ہوتی کہ اپنے دعوے پر حجت بیان کرے اور اگر کچھ بیان لا دے تو اکثر یہی ہوتا ہے کہ الٹے اپنے اوپر حجت قائم کرتی ہے اور اس کو خبر نہیں ہوتی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ عورتوں کا حال ہے کہ ان کے لباس میں اور مردوں کے لباس میں فرق ہے اور ان کی میراث کم ہے اور ان کی گواہی ضعیف ہے اور ان کو گھر بیٹھنے کا حکم ہے۔"[3]

---

1 تفسير حقاني: 32/4، طبع كراچى 2 تفهيم القرآن: 531/4. 3 تفسير مواهب الرحمٰن، پاره: 25، ص: 103.

مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی اپنے حاشیۂ قرآن میں یہی وضاحت کی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی

”تو کیا جو زیورات میں پرورش پائے اور مباحثہ میں بھی ژولیدہ بیان ہو (وہ اللہ کی اولاد بننے کے قابل ہے؟)“

حاشیہ: آیت سے فطرت نسوانی کے متعلق دو حقیقتیں ثابت ہوئیں۔ایک یہ کہ زیور، آرائش ونمائش کا شوق عورت کی سرشت میں داخل ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی قوت استدلال بھی ضعیف ہے۔ان دونوں کے لیے ملاحظہ ہوں انگریزی تفسیر القرآن کے حاشیے۔آج دیکھ لیا جائے کہ یورپ اور امریکہ کی زن جدید اپنی آرائش وزیبائش کے سامان پر، اپنی تزئین جمال اور اپنے بناؤ سنگھار پر کتنی دولت ہر سال بے دریغ خرچ کرتی رہتی ہے۔[1]

مولانا احمد سعید دہلوی

”کیا وہ جو زیور کی زیبائش اور آرائش میں پرورش پائے اور پروان چڑھے اور وہ جھگڑے اور مباحثے میں صاف طور پر اظہار مدعا نہ کر سکے، یہ لوگ اس کو رحمان کی اولاد ٹھہراتے ہیں، یعنی عادتاً لڑکی کی پرورش آرائش اور زیبائش میں ہوتی ہے، ماں باپ زیور پہناتے ہیں، اس کا بناؤ سنگھار کیا جاتا ہے، پھر ضعف رائے اور قوت فکر کی کمزوری کا یہ عالم کہ بحث مباحثے اور جھگڑے کے وقت اپنے مدعا کو صاف طور پر بیان بھی نہ کر سکے۔ ایسی کمزور چیز کو خدا کی اولاد قرار دیتے ہو۔“[2]

عربی تفاسیر

یہاں تک اُردو تراجم و تفاسیر کا ذکر ہوا ہے، اب عربی تفاسیر کے اقتباسات پیش

1 تفسیر ماجدی: 980/2، تاج کمپنی۔ 2 کشف الرحمٰن: 782/2، طبع کراچی۔

خدمت ہیں۔

التفسير الكبير (امام رازی)

﴿اَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ﴾ التَّـنْبِيهُ عَلٰى نُقْصَانِهَا، وَهُوَ أَنَّ الَّذِي يُرَبَّي فِي الْحِلْيَةِ يَكُونُ نَاقِصَ الذَّاتِ، لأَنَّهُ لَوْلَا نُقْصَانٌ فِي ذَاتِهَا لَمَا احْتَاجَتْ إِلَى تَزْيِينِ نَفْسِهَا بِالْحِلْيَةِ، ثُمَّ بَيَّنَ نُقْصَانَ حَالِهَا بِطَرِيقٍ آخَرَ، وَهُوَ قَوْلُهُ ﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ يَعْنِي أَنَّهَا إِذَا احْتَاجَتْ إِلَى الْمُخَاصَمَةِ وَالْمُنَازَعَةِ عَجِزَتْ وَكَانَتْ غَيْرَ مُبِينٍ، وَذٰلِكَ لِضُعْفِ لِسَانِهَا وَقِلَّةِ عَقْلِهَا وَبَلَادَةِ طَبْعِهَا، وَيُقَالُ قَلَّمَا تَكَلَّمَتِ امْرَأَةٌ فَأَرَادَتْ أَنْ تَتَـكَلَّمَ بِحُجَّتِهَا إِلَّا تَكَلَّمَتْ بِمَا كَانَ حُجَّةٌ عَلَيْهَا، فَهٰذِهِ الْوُجُوهُ دَالَّةٌ عَلٰى كَمَالِ نَقْصِهَا، فَكَيْفَ يَجُوزُ إِضَافَتُهُنَّ بِالْوَلَدِيَّـةِ إِلَيهِ»

یہ اقتباسات صرف ان تفاسیر سے نقل کیے گئے ہیں جن کی عبارتوں اور تشریحات میں قدرے اختلاف ہے اور کئی تفاسیر ایسی ہیں، جن میں لفظ بہ لفظ دوسری تفاسیر کی عبارت نقل کر دی گئی ہے۔ تکرار سے بچتے ہوئے راقم نے ان کی عبارتیں نقل کرنے سے گریز کیا ہے، البتہ ان تفاسیر کے حوالے ذیل میں درج ہیں جن میں مذکورہ بالا تفسیر ہی کی گئی ہے۔

جامع البيان عن تأويل آي القرآن (تفسیر ابن جریر طبری)[1]

«أَوَمَنْ يَّنْبُتُ فِي الْحِلْيَةِ وَيُزَيَّنُ بِهَا ﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ﴾

1 73/13 ۔

يَقُولُ: وَهُوَ فِي مُخَاصَمَةِ مَنْ خَاصَمَهُ عِنْدَ الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ، وَمَنْ خَصَمَهُ، بِبُرْهَانٍ وَحُجَّةٍ، لَعَجَزَهُ وَضَعَّفَهُ، جَعَلْتُمُوهُ جُزْءَ اللهِ مِنْ خَلْقِهِ وَزَعَمْتُمْ أَنَّهُ نَصِيبُهُ مِنْهُمْ»

تَفْسِيرُ أَبِي السَّعُودِ (امام ابوسعود محمد بن العمادی)[1]

﴿وَهُوَ﴾ مَعَ مَا ذُكِرَ مِنَ الْقُصُورِ ﴿فِي الْخِصَامِ﴾ أَيِ الْجِدَالَ الَّذِي لَا يَكَادُ يَخْلُو عَنْهُ الْإِنْسَانُ فِي الْعَادَةِ ﴿غَيْرُ مُبِينٍ﴾ غَيْرُ قَادِرٍ عَلٰى تَقْرِيرِ دَعْوَاهُ وَإِقَامَةِ حُجَّتِهِ لِنُقْصَانِ عَقْلِهِ وَضُعْفِ رَأْيِهِ»

تفسیرغرائب القرآن و رغائب الفرقان (نظام الدین الحسن بن محمد النیسابوری)[2]

«وَهِيَ أَنَّهُ يُرَبَّى أَو يَتَرَبَّى فِي الزِّينَةِ وَالنُّعُومَةِ وَهُوَ إِذَا احْتَاجَ إِلَى الْمُخَاصَمَةِ لَا يُبَيِّنُ وَلَا يُعَرِّبُ عَمَّا فِي ضَمِيرِهِ لِعِجْزِهِ عَنِ الْبَيَانِ وَلِقِلَّةِ عَقْلِهِ، قَالَتِ الْعُقَلَاءُ فَلَمَّا تَكَلَّمَتِ امْرَأَةٌ فَأَرَادَتْ اَنْ تُعَرِّبَ عَنْ حُجَّتِهَا إِلَّا نَطَقَتْ بِمَا هُوَ حُجَّةٌ عَلَيْهَا»

تفسير المراغي (احمد مصطفیٰ المراغی)[3]

﴿أَوَمَنْ ...﴾ أَيْ أَوَقَدْ جَعَلُوا لِلّٰهِ الْأُنْثٰى الَّتِي تَتَرَبَّى فِي الزِّينَةِ، وَإِذَا خُوصِمَتْ لَا تَقْدِرُ عَلٰى إِقَامَةِ حُجَّةٍ وَلَا تَقْرِيرِ دَعْوَى، لِنُقْصَانِ عَقْلِهَا وَضُعْفِ رَأْيِهَا؟ وَمَا كَانَ يَنْبَغِي لَهُمْ

1 42/8، طبع بيروت لبنان. 2 پاره: 25، ص:45، طبع مصر. 3 پاره 25، ص: 77، طبع مصر.

أَنْ يَـفْعَلُوا ذٰلِكَ، وَفِي قَولِهِ ﴿ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ ﴾ إِيمَاءٌ إِلٰى مَا فِيهِنَّ مِنَ الدَّعَةِ وَرَخَاوَةِ الْخَلْقِ بِضُعْفِ الْمُقَاوَمَةِ الْجِسْمِيَّةِ وَاللِّسَانِيَّـةِ، كَمَا أَنَّ فِيهِ دَلَالَةً عَلٰى أَنَّ النُّشُوءَ فِي الزِّينَةِ وَنُعُومَةِ الْعَيْشِ مِنَ الْمَعَايِبِ وَالْمَذَامِّ لِلرِّجَالِ»

فتح البيان في مقاصد القرآن (سید نواب صدیق حسن خان)[1]

﴿غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ أَيْ عَاجِزٌ عَنْ أَنْ يَقُومَ بِأَمْرِ نَفْسِهِ وَإِذَا خُوصِمَ لَا يَقْدِرُ عَلٰى إِقَامَةِ حُجَّتِهِ وَتَقْرِيرِ دَعْوَاهُ، وَدَفْعِ مَا يُجَادِلُهُ بِهِ خَصْمُهُ لِنُقْصَانِ عَقْلِهِ، وَضُعْفِ رَأْيِهِ. . . »

تفسير البحر المحيط (ابو حیان الاندلسی)[2]

«وَهُوَ إِنْ خَاصَمَ لَا يُبَيِّنُ لِضُعْفِ الْعَقْلِ وَنَقْصِ التَّدَبُّرِ وَالتَّأَمُّلِ. . .وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَمُجَاهِدٌ وَقَتَادَةُ وَالسُّدِّيُّ وَيَدُلُّ عَلَيهِ قَولُهُ ﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ . . . أَيْ لَا يُظْهِرُ حُجَّةً وَلَا يُقِيمُ دَلِيلًا وَلَا يَكْشِفُ عَمَّا فِي نَفْسِهِ كَشْفًا وَاضِحًا وَيُقَالُ قَلَّمَا تَجِدُ امْرَأَةً لَا تُفْسِدُ الْكَلَامَ وَتَخْلِطُ الْمَعَانِيَ»

تفسير الكشاف (علامہ جار اللہ زمخشری)[3]

«أَيْ يَتَرَبَّى فِي الزِّينَةِ وَالنِّعْمَةِ، وَهُوَ إِذَا احْتَاجَ إِلٰى مَجَاثَاةِ الْخُصُومِ وَمَجَارَاةِ الرِّجَالِ كَانَ غَيرَ مُبِينٍ، لَيسَ عِنْدَهُ بَيَانٌ،

---

1 224/6 . 2 8/8، طبع رياض، سعودي عرب . 3 243/4 .

وَلَا يَأْتِي بِبُرْهَانٍ يَحْتَجُّ بِهِ مَنْ يُخَاصِمُهُ وَذٰلِكَ لِضُعْفِ عُقُولِ النِّسَاءِ وَنُقْصَانِهِنَّ عَنْ فِطْرَةِ الرِّجَالِ»

تفسیر المظھري (قاضی ثناء اللہ پانی پتی)[1]

«أَيْ يَنْبُتُ وَيَكْبُرُ فِي الْحِلْيَةِ يَعْنِي النِّسَاءَ فَإِنَّ حُسْنَهُنَّ مُنْحَصِرٌ فِي الصُّورَةِ فَيَتَزَيَّنُ بِالْحِلْيَةِ لِيَزْدَادَ حُسْنُهُنَّ بِخِلَافِ الرِّجَالِ فَإِنَّ حُسْنَهُمْ غَالِبًا بِالْمَعَانِي وَالْأَوْصَافِ وَذٰلِكَ غَيرُ مُحْتَاجٍ إِلَى الْحِلْيَةِ وَفِيهِ إِشْمَامٌ بِأَنَّ النَّشْأَ فِي الزِّينَةِ مِنَ الْمَعَايِبِ فَعَلَى الرِّجَالِ اَنْ يَّجْتَنِبُوا وَيَتَزَيَّنُوا بِلِبَاسِ التَّقْوٰى ﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ﴾ أَيْ فِي الْمَحَاجَّةِ بِاللِّسَانِ وَبِالسِّنَانِ ﴿غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ أَيْ غَيرُ مُظْهِرٍ حُجَّتَهُنَّ لِنُقْصَانِ عَقْلِهِنَّ وَضُعْفِ أَبْدَانِهِنَّ وَقُلُوبِهِنَّ، قَالَ قَتَادَةُ: وَالْمَعْنٰى: أَمِ اتَّخَذَ مِنْ مَخْلُوقَاتِهِ بَنَاتٍ مَبْغُوضَاتٍ مَكْرُوهَاتٍ مُوجِبَاتٍ لِسَوَادِ الْوَجْهِ نَاشِيَاتٍ فِي الْحِلْيَةِ ضَعِيفَاتٍ قَلْبًا وَقَالِبًا وَعَقْلاً»

أنوار التنزيل و أسرار التأويل (ناصر الدین ابوالخیر عبداللہ بن عمر البیضاوی)[2]

«أَيْ أَوَ جَعَلُوا لَهُ، اَوِ اتَّخَذَ مَنْ يَّتَرَبّٰى فِي الزِّينَةِ، يَعْنِي الْبَنَاتِ ﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ﴾ فِي الْمُجَادَلَةِ ﴿غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ مُقَرِّرٍ لِمَا يَدَّعِيهِ مِنْ نُقْصَانِ الْعَقْلِ وَضُعْفِ الرَّأْيِ»

تفسير جلالين (للسيوطي والمحلي)[3]

1 342/8، طبع دھلی۔ 2 88/5 . 3 حوالہ مذکور بأسفلها .

﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ﴾ مُظْهِرُ الْحُجَّةِ لِضُعْفِهَا عَنْهَا بِالْأُنُوثَةِ»

تفسیر ابن کثیر (عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن کثیر الدمشقی)[1]

«أَيِ الْمَرْأَةُ نَاقِصَةٌ يَكْمُلُ نَقْصُهَا بِلُبْسِ الْحُلِيِّ مُنْذُ تَكُونُ طِفْلَةً وَإِذَا خَاصَمَتْ فَلَا عِبَارَةَ لَهَا بَلْ هِيَ عَاجِزَةٌ عِيِيَّةٌ، أَوَ مَنْ يَّكُونُ هٰكَذَا يُنْسَبُ إِلٰى جَنَابِ اللهِ الْعَظِيمِ، فَالْأُنْثٰى نَاقِصَةُ الظَّاهِرِ وَالْبَاطِنِ فِي الصُّورَةِ وَالْمَعْنٰى، فَيَكْمُلُ نَقْصُ ظَاهِرِهَا وَصُورَتِهَا بِلُبْسِ الْحُلِيِّ وَمَا فِي مَعْنَاهُ لِيُجْبَرَ مَا فِيهَا مِنْ نَّقْصٍ . . . وَأَمَّا نَقْصُ مَعْنَاهَا فَإِنَّهَا ضَعِيفَةٌ عَاجِزَةٌ عَنِ الْاِنْتِصَارِ عِنْدَ الْاِنْتِصَارِ لَا عِبَارَةَ لَهَا وَلَا هِمَّةَ . . .»

روح البیان (شیخ اسماعیل)[2]

«غَيْرُ قَادِرٍ عَلٰى تَقْرِيرِ دَعْوَاهُ وَمُقَامَةِ حُجَّتِهِ كَمَا يَقْدِرُ الرَّجُلُ عَلَيْهِ لِنُقْصَانِ عَقْلِهِ وَضُعْفِ رَأْيِهِ . .وَهٰذَا بِحَسْبِ الْغَالِبِ . .»

- روح المعاني: 108/14، علامه شهاب الدين محمود آلوسي.
- تفسير زاد المسير: 306/7، إمام ابن الجوزي.
- تفسير القاسمي: 330/8، جمال الدين القاسمي.
- تفسير الدر المنثور: 718/5، إمام سيوطي.
- تنوير المقباس، تفسير ابن عباس برحاشيه الدر المنثور: 124/5.

[1] 159/4. [2] 358/8.

- فتح القدير: 630/4 ، إمام شوكاني .
- معالم التنزيل:391/7 ، الشيخ أبو محمد البغوي ، صاحب المصابيح برحاشيه ابن كثير .
- لباب التأويل في معاني التنزيل ، المعروف تفسير الخازن: 108/4 .
- تفسير مدارك التنزيل للنسفي ، برحاشيه تفسير الخازن المذكور .
- تفسير الجواهر ، الشيخ الطنطاوي ، الجزء العشرون ، ص: 165 .

ایک تفسیری اختلاف اور اس کی حقیقت

اب تک ﴿ اَوَ مَنۡ يُّنَشَّؤُا فِي الۡحِلۡيَةِ ﴾ کی تفسیر یہ بیان کی گئی ہے کہ اس سے مراد لڑکیاں (عورتیں) ہیں اور ان کی صفات یہ بیان کی گئی ہیں کہ وہ زیورات کی دلدادہ اور اظہار مافی الضمیر (بحث وتکرار کے موقع) پر غیر قادر ہیں لیکن ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد بت ہیں، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ دونوں صفات گویا پتھر کی مورتیوں کی ہیں لیکن قرآن کریم کے سیاق سے اس قول کی تائید نہیں ہوتی۔ بلاشبہ بعض پجاری سونا چاندی کا نذرانہ بھی اپنے بتوں کے لیے پیش کرتے ہیں لیکن وہ بالعموم پتھر کی مورتیوں کو بطور زیور نہیں پہنایا جاتا ہے بلکہ وہ مہنتوں اور پنڈتوں کے ہتھے چڑھتا ہے اور وہ اس آمدنی سے گل چھڑے اڑاتے ہیں۔ اسی طرح اگر قرآن دوسری صفت یہ بیان کرتا کہ وہ جھگڑا کرنے پر قادر نہیں، تب تو یہ دوسری صفت ان پتھر کی مورتیوں پر صادق آ سکتی تھی لیکن قرآن نے یہ نہیں کہا کہ وہ جھگڑا کرنے پر قادر نہیں بلکہ یہ کہا ہے کہ جھگڑے کے وقت وہ اظہار بیان پر قادر نہیں۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مورتیاں اس سے مراد نہیں بلکہ طبقۂ اناث ہی مراد ہے اور اسی کی یہ دونوں صفتیں بیان کی گئی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر مفسرین نے اس دوسرے قول کا ذکر سرے سے کیا ہی نہیں ہے۔

جیسا کہ اردو تفاسیر میں کسی میں بھی یہ دوسرا قول منقول نہیں ہے۔ صرف چند عربی تفاسیر میں یہ قول نقل کیا گیا ہے، جیسے تفسیر روح المعانی، تفسیر طبری، تفسیر البحر المحیط، تفسیر مواہب الرحمٰن (اردو) تفسیر فتح البیان اور تفسیر فتح القدیر۔ لیکن اول الذکر چاروں مفسرین نے اس کی تردید کی ہے کہ قرآن مجید کا سیاق کلام اس کی تائید نہیں کرتا اور انھوں نے قولِ اوّل ہی کو ترجیح دی ہے اور آخر الذکر دونوں مفسرین نے بھی تفسیر تو جمہور مفسرین کی رائے کے مطابق ہی کی ہے لیکن بعد میں بطور اختلاف کے دوسرا قول بھی نقل کر دیا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ ان کے نزدیک بھی قول وہی راجح اور صحیح ہے جس کے مطابق انھوں نے تفسیر کی ہے۔ اس اعتبار سے ﴿اَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا﴾ سے لڑکیاں مراد لینے میں تقریباً تمام مفسرین امت کا اتفاق ہے ایک اختلافی اور مرجوح قول کے ذکر کر دینے سے اس اتفاق پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ اس کی تائید کسی مفسر نے نہیں کی ہے۔

ضعف حافظہ، نسیان اور ذہول

جہاں تک مردوں کے مقابلے میں عورت کی دماغی و ذہنی صلاحیتوں کی کمزوری کا تعلق ہے، جس کی وجہ سے ضعف حافظہ، نسیان اور ذہول کا وہ زیادہ شکار ہوتی ہے۔ تو مفسرین نے عورت کی نصف شہادت کی حکمت اور علت پر بحث کرتے ہوئے بھی اس نکتے کی وضاحت کی ہے، چنانچہ علامہ رشید رضا مصری اور علامہ مراغی دونوں ہی لکھتے ہیں۔ ان دونوں کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے:

﴿اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى﴾

اسی مذکورہ آیت میں جس میں ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کو ضروری قرار دیا گیا ہے، اس حکم کی علت بھی موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ان دونوں میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے کیونکہ عادتاً عورت کا اشتغال مالیات اور اس قسم کے

دیگر معاوضات سے نہیں ہوتا، اس لیے ایسے معاملات میں اس کی یادداشت کمزور ہوتی ہے، بخلاف گھریلو امور کے کہ ان میں عورت کی یادداشت مرد سے زیادہ قوی ہوتی ہے کیونکہ انسان کی جبلت میں یہ ہے کہ جس چیز کا فکر اور اہتمام اس کے ذمے ہو، اس میں اس کی یادداشت زیادہ ہوتی ہے۔ اس زمانے میں بہت سی عورتوں کا مالیات میں اشتغال، اس حکم کی تبدیلی کا باعث نہیں ہو سکتا کیونکہ احکام کی بنیاد اکثریت پر ہوتی ہے اور ایسی عورتوں کی تعداد ہر امت اور ہر نسل میں بہت قلیل ہوتی ہے۔

امام رازی لکھتے ہیں:

﴿أَنْ تَضِلَّ﴾ وَالْمَعْنٰى أَنَّ النِّسْيَانَ غَالِبٌ (عَلٰى) طِبَاعِ النِّسَاءِ لِكَثْرَةِ الْبَرْدِ وَالرُّطُوبَةِ فِي أَمْزِجَتِهِنَّ، وَاجْتِمَاعُ الْمَرْأَتَيْنِ عَلَى النِّسْيَانِ أَبْعَدُ فِي الْعَقْلِ مِنْ صُدُورِ النِّسْيَانِ عَلَى الْمَرْأَةِ الْوَاحِدَةِ فَأُقِيمَتِ الْمَرْأَتَانِ مَقَامَ الرَّجُلِ الْوَاحِدِ حَتَّى أَنَّ إِحْدَاهُمَا لَوْ نَسِيَتْ ذَكَّرَتْهَا الْأُخْرٰى فَهٰذَا هُوَ الْمَقْصُودُ مِنَ الْآيَةِ»

"مطلب یہ ہے کہ نسیان عورتوں کی طبیعتوں پر غالب ہے، ان کے مزاج میں ٹھنڈک اور رطوبت کی کثرت کی وجہ سے اور دو عورتوں کا نسیان پر جمع ہونا عقلاً ایک عورت سے نسیان کے صدور سے زیادہ بعید ہے، اس لیے دو عورتوں کو ایک مرد کے قائم مقام کیا گیا ہے تاکہ ایک عورت اگر بھول جائے تو دوسری اسے یاد کرا دے۔ آیت کا مقصود یہی ہے۔"[1]

علامہ ابوحیان اندلسی کی عبارت بھی تقریباً یہی ہے۔[2]

[1] تفسير المنار: 125,124/3، وتفسير المراغي: 434/1، تفسير سورة البقرة، آيت: 282. [2] البحير المحيط: 350/2.

نواب صدیق حسن خان اور امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہما لکھتے ہیں:[1]

«قَالَ أَبُوعُبَيْدٍ مَعْنٰى تَضِلُّ: تَنْسٰى أَيْ لِنَقْصِ عَقْلِهِنَّ وَضَبْطِهِنَّ، وَهٰذِهِ الْاٰيَةُ تَعْلِيلٌ لِاعْتِبَارِ الْعَدَدِ فِي النِّسَاءِ ... وَإِنَّمَا اعْتُبِرَ فِيهِمَا هٰذَا التَّذْكِيرُ لِمَا يَلْحَقُهُمَا مِنْ ضُعْفِ النِّسَاءِ بِخِلَافِ الرِّجَالِ»

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

﴿اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى﴾ بَيَانٌ لِحِكْمَةِ مَشْرُوعِيَّـةِ الْحُكْمِ وَاشْتِرَاطِ الْعَدَدِ فِي النِّسَاءِ أَيْ شُرِعَ ذٰلِكَ إِرَادَةً أَنْ تُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرٰى إِنْ ضَلَّتْ إِحْدَاهُمَا، لِمَا أَنَّ النِّسْيَانَ غَالِبٌ عَلٰى طَبْعِ النِّسَاءِ لِكَثْرَةِ الرُّطُوبَةِ فِي أَمْزِجَتِهِنَّ»

''اس میں بھی مشروعیت حکم اور ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کے اشتراط کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ چونکہ عورتوں کے مزاج میں کثرت رطوبت کی وجہ سے عورتوں کی طبیعتوں پر نسیان کا غلبہ رہتا ہے، اس لیے یہ مشروع کر دیا گیا کہ ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتیں ہوں تا کہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد کرا دے۔''[2]

علامہ جمال الدین قاسمی لکھتے ہیں:

«وَلَمَّا شُرِطَ فِي الْقِيَامِ مَقَامَ الْوَاحِدِ مِنَ الرِّجَالِ، الْعَدَدُ مِنَ النِّسَاءِ عَلَّلَهُ بِمَا يُشِيرُ إِلَى نَقْصِ الضَّبْطِ فِيهِنَّ فَقَالَ ﴿ اَنْ

---

[1] فتح البيان: 1/343و344، وفتح القدير للشوكاني: 1/272. [2] روح المعاني: 95/3، سورة البقرة: 282.

تَضِلَّ اِحۡدٰىهُمَا ﴾»

''جب ایک مرد کے مقابلے میں دوعورتوں کی گواہی کوضروری قرار دے دیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی علت یہ بیان فرمائی کہ ان عورتوں میں ضبط کی کمی ہے۔ (اورعورت کے بھولنے کا امکان ہے)، اس لیے فرمایا کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد کرا دے۔''[1]

ملا جیون لکھتے ہیں:

«إِنَّمَا جُعِلَتِ الْمَرْأَتَانِ مَقَامَ رَجُلٍ وَاحِدٍ وَلَمْ يَكْتَفِ بِوَاحِدَةٍ مِنْهُمَا لِأَجَلِ أَنْ نَسِيَتْ إِحْدَاهُمَا الشَّهَادَةَ فَتُذَكِّرَ صَاحِبَتُهَا الْأُخْرٰى لِأَنَّ النِّسْيَانَ فِي الْمَرْأَةِ غَالِبٌ»

''دوعورتوں کو ایک مرد کے قائم مقام، اس لیے کیا گیا ہے اور ایک عورت پر کفایت نہیں کی کہ اگر ایک شہادت بھول جائے تو دوسری اس کو یاد کرا دیا کرے کیونکہ نسیان عورت پر غالب ہے۔''[2]

گواہی میں عورت پر مرد کی فطری برتری

ان حوالہ جات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ بیرونی معاملات میں عدم اشتغال کی وجہ سے بیرون خانہ کی ذمے داریوں سے بوجوہ مذکورہ عورت مرد کی طرح عہدہ برآ نہیں ہوسکتی، اس لیے شہادت کا مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ایک ہے جن میں شریعت اسلامیہ نے مرد وعورت کے درمیان (ان کے دائرۂ عمل کے اختلاف اور فطری صلاحیتوں کے تفاوت کی وجہ سے) فرق کیا ہے اور اس معاملے میں بھی مرد کو عورت پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے کیونکہ ایسے گواہ کے مقابلے میں جس میں عقل وضبط کی کمی

1 تفسير القاسمي، پاره: 3، ص: 382. 2 التفسيرات الأحمدية، ص: 180.

ہو، کامل العقل اور کامل الضبط گواہ کو ترجیح دینا، ایک فطری امر ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ حدیث [أَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ] [1] کے ذیل میں امام مہلب کا قول نقل کرتے ہیں: [2]

«يُسْتَنْبَطُ مِنْهُ التَّفَاضُلُ بَيْنَ الشُّهُودِ بِقَدَرِ عَقْلِهِمْ وَضَبْطِهِمْ، فَتُقَدَّمُ شَهَادَةُ الْفَطِنِ الْيَقِظِ عَلَى الصَّالِحِ الْبَلِيدِ»

یعنی گزشتہ بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہادت کے معاملے میں مرد کو عورت پر فضیلت بخشی ہے، چنانچہ قاضی ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے چھ باتوں میں مرد کو عورت پر فضیلت دی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ نقصان عقل کی وجہ سے عورت کی گواہی کو مرد کی گواہی سے نصف قرار دیا گیا ہے۔'' [3]

اور یہی بات امام رازی [4] اور امام ابوحیان اندلسی رحمہما اللہ [5] نے بھی بیان کی ہے۔

اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اس نکتے کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں:

«وَهُوَ سُبْحَانَهُ أَمَرَ بِإِشْهَادِ امْرَأَتَيْنِ لِتَوْكِيدِ الْحِفْظِ، لأَنَّ عَقْلَ الْمَرْأَتَيْنِ وَحِفْظَهُمَا يَقُومُ مَقَامَ عَقْلِ رَجُلٍ وَحِفْظِهِ، وَلِهٰذَا جُعِلَتْ عَلَى النِّصْفِ مِنَ الرَّجُلِ فِي الْمِيرَاثِ وَالدِّيَةِ وَالْعَقِيقَةِ وَالْعِتْقِ، فَعِتْقُ امْرَأَتَيْنِ يَقُومُ مَقَامَ عِتْقِ رَجُلٍ، كَمَا صَحَّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ»

1 صحيح البخاري، الشهادات، باب شهادة النسآء......، حديث: 2658. 2 فتح الباري، الشهادات، باب شهادة النسآء: 329/5. 3 أحكام القرآن: 253/1.
4 تفسير الكبير: 122/7. 5 تفسير البحر المحيط: 350/2.

"اللہ تعالیٰ نے ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی گواہی کا حکم اس لیے دیا ہے تاکہ عورت کی یادداشت میں کوتاہی کا ازالہ ہو جائے کیونکہ دو عورتوں کی عقل اور ان کی یادداشت ایک مرد کی عقل اور اس کی یادداشت کے برابر ہوتی ہے، اس لیے عورت کا مرد کے مقابلے میں میراث، دیت (قتل خطا کی صورت میں) اور عقیقے میں آدھا حصہ ہے اور عتق میں بھی نصف حصہ ہے، یعنی ایک مرد کا آزاد کرنا (اجر وثواب میں) دو عورتوں کی آزادی کے برابر ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے۔"[1]

اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

ان حقائق کے ساتھ یہ حقیقت بھی محتاج بیان نہیں کہ اسلام نے اس امر پر بڑا زور دیا ہے کہ عورت گھر کی چار دیواری کے اندر صرف وہ گھریلو امور سرانجام دے جس کے لیے خالق کائنات نے اس کو پیدا کیا ہے اور معاشی جدوجہد اور دیگر بیرونی سرگرمیوں سے دامن کش رہے اور اگر کسی وقت گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو پردے کا اہتمام کر کے نکلے۔ شریعت اسلامیہ نے عورت کی عفت وعصمت کی حفاظت کو اتنی اہمیت دی ہے کہ بغیر محرم کے سفر کرنے سے بھی اسے روک دیا ہے تاکہ عورت کی عزت خطرے میں نہ پڑے حتیٰ کہ بعض موقعوں پر اپنی بیوی کی حفاظت کو جہاد فی سبیل اللہ سے بھی زیادہ اہمیت دی گئی ہے، چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ نے جب یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ کوئی عورت ذی محرم کے بغیر سفر نہ کرے، اسی طرح کوئی شخص کسی عورت کے پاس اس کے ذی محرم کی غیر موجودگی میں نہ جائے تو ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں تو فلاں فلاں لشکر کے ساتھ (جہاد کے لیے) جانا چاہتا ہوں، میرا نام بھی درج کیا جا چکا ہے

[1] إعلام الموقعين: 102/1، والطرق الحكمية، ص: 131.

جبکہ میری بیوی حج کے لیے پابہ رکاب ہے۔ میں کیا کروں؟ آپ نے فرمایا: [فَحُجَّ مَعَ اِمْرأَتِكَ] ''تم اپنی بیوی کے ساتھ جا کر حج کرو۔''[1]

مردوں سے مخفی رہنے والے معاملات میں تنہا عورت کی گواہی قبول ہے

ان تفصیلات سے واضح ہے کہ اسلام عورت کا گھر سے زیادہ باہر نکلنا پسند نہیں کرتا، اس لیے اسے عدالتی شہادتوں کی مشکلات میں الجھانا اس کی ہدایات وتعلیمات سے میل نہیں کھاتا۔ بنابریں اسلام میں عورت کی شہادت کو صرف ضرورتاً ہی تسلیم کیا گیا ہے، یعنی جہاں اس کی شہادت ناگزیر ہو، وہاں اس کی شہادت قبول کی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے معاملات میں جن پر صرف عورتیں ہی مطلع ہوسکتی ہیں، عورتوں کی گواہی بالاتفاق مقبول ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«وَاتَّفَقُوا عَلٰى قُبُولِ شَهَادَتِهِنَّ مُفْرَدَاتٍ فِيمَا لَا يَطَّلِعُ عَلَيْهِ الرِّجَالُ، كَالْحَيْضِ وَالْوِلَادَةِ وَالْاِسْتِهْلَالِ وَعُيُوبِ النِّسَاءِ»

''ایسے معاملات میں جن پر مرد مطلع نہیں ہو پاتے، تنہا عورتوں کی گواہی قبول کرنے پر سب کا اتفاق ہے جس طرح حیض، ولادت، استہلال اور عورتوں کے عیوب ہیں۔''[2]

تقریباً تمام ائمہ، فقہاء اور مفسرین نے اس اصول کا ذکر کیا ہے، اختصار پیش نظر ان کے تذکرے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے، ویسے بھی یہ اتفاقی مسئلہ ہے، اس لیے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ بنابریں حوالوں پر کفایت کی جاتی ہے۔

1 صحيح البخاري، جزاء الصيد، باب حج النساء، حديث: 1862، والجهاد، باب كتابة الإمام الناس، حديث: 3061. 2 فتح الباري، الشهادات، باب شهادة النساء: 328/5.

- المغنى مع الشرح الكبير، ابن قدامه مقدسي (فقہ حنبلی): 189/10 طبع قدیم.
- الهداية مع فتح القدير: 372/7 ، طبع مصر (فقہ حنفی).
- بدائع الصنائع، كاساني: 277/6، (فقہ حنفی).
- المهذب: 333/2، (فقہ شافعی).
- المدونة الكبرٰى: 81/4، (فقہ مالکی).
- بداية المجتهد: 465/2، (فقہ مالکی).
- فقه الإمام سعيد بن المسيب: 193/4 .
- تفسير غرائب القرآن و رغائب الفرقان: 91/3 .
- تفسير الجامع لأحكام القرآن للقرطبي: 391/3 .
- تفسير الدر المنثور للسيوطي: 371/1 .
- تفسير فتح القدير للشوكاني: 272/1 .
- تفسير روح المعاني، علامه آلوسي: 58/3 .
- تفسير المظهرى، قاضي ثناء الله پاني پتي: 426/1 ، (عربی) .
- تفسير البحر المحيط لأبي حيان: 347/2 .
- التفسيرات الأحمديه: 179، ملاجيون .
- المحلىٰ، لابن حزم: جلد 10 ، مسئله : 1790 ، كتاب الشهادات .
- الطرق الحكمية في السياسة الشرعية، لابن القيم: 134-138 .
- إعلام الموقعين عن رب العالمين، لابن القيم: 104/1 ، به تحقيق عبدالرحمن الوكيل .
- کنز الایمان: 77، ترجمہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی، حاشیہ مولانا نعیم الدین مراد آبادی۔

صرف عورتوں کی موجودگی میں پیش آنے والے واقعات میں عورت کی گواہی بھی قبول ہے

چونکہ مخصوص نسوانی مسائل میں عورت کی گواہی تسلیم کرنے کی علت یہ ہے کہ ایسے مسائل میں اگر عورتوں کی شہادت کو قبول نہیں کیا جائے گا تو بہت سے حقوق ضائع ہو جائیں گے، چنانچہ اسی اصول اور علت کی بنیاد پر شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم رحمہما اللہ نے لکھا ہے کہ اسی کے ذیل میں وہ واقعات و معاملات بھی آ جاتے ہیں کہ جن پر مردوں کو اطلاع نہ ہو سکے، صرف عورتوں کے علم میں آئے ہوں، یعنی ایک مسائل کی قسم وہ ہے جو لَا یَطَّلِعُ عَلَیْهِ الرِّجَالُ یا لَا یَطَّلِعُ عَلَیْهِ غَیرُھُنَّ سے تعبیر کیے گئے ہیں، یعنی ایسے نسوانی مسائل کہ جن پر بالعموم مرد آگاہ ہی نہیں ہوتے اور دوسری قسم معاملات کی وہ ہے کہ جسے لَمْ یَطَّلِعْ عَلَیْهِ الرِّجَالُ یا لَمْ یَطَّلِعْ عَلَیْهِ غَیْرُھُنَّ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، یعنی ایسے واقعات و حادثات جو صرف عورتوں کے سامنے ہوئے ہوں، وہاں مرد کوئی نہ ہو، اس لیے عورتوں کے سوا گواہ ہی کوئی نہ ہو، مثلاً: شادی بیاہ کے مواقع پر ایسی جگہ جہاں صرف عورتیں ہی عورتیں ہوں۔ زنانہ کالج، جہاں عورتیں ہی عورتیں ہوں۔ لیڈیز کلب یا خواتین کا کوئی بھی اجتماع، جہاں مرد نہ ہوں۔ وہاں کوئی واقعہ پیش آ جائے، کوئی حادثہ ہو جائے تو یہاں بھی تنہا عورتوں کی گواہی فیصلے کے لیے کافی ہوگی کیونکہ اس مقام پر عورت کی واقعاتی شہادت کو نظر انداز کرنے سے بہت سے حقوق ضائع ہو جائیں گے۔

یہ اسی نظریۂ ضرورت کے تحت ہے کہ بعض موقعوں پر ایسے افراد کی گواہی بھی قبول کر لی جاتی ہے جن کی گواہی عام معاملات میں نامقبول ہے، جیسے ذمی اور غیر مسلم کی گواہی نامقبول ہے لیکن اگر دوران سفر میں کسی مسلمان کو (کسی حادثے یا شدید بیماری کی وجہ سے) اپنی موت کا یقین ہو جائے اور وہاں اس وقت ذمیوں کے علاوہ ایسے مسلمان افراد نہ مل سکیں جن کے سامنے وہ وصیت کر سکے تو ایسے موقع پر بالاتفاق قرآن و

حدیث کے نصوص کی رو سے ذمی غیر مسلموں کی گواہی قسم کے ساتھ جائز ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

«وَهٰذَا مَبْنِيٌّ عَلٰى أَصْلٍ، وَهُوَ أَنَّ الشَّهَادَةَ عِنْدَ الْحَاجَةِ، يَجُوزُ فِيهَا مِثْلُ شَهَادَةِ النِّسَآءِ فِيمَا لَا يَطَّلِعُ عَلَيْهِ الرِّجَالُ»

''غیر مسلم کی یہ گواہی نظریۂ ضرورت کی بنا پر ہے جس کے تحت عورتوں کی گواہی کو ایسے معاملات میں جائز کیا گیا ہے جس پر مرد مطلع نہیں ہو سکتے۔''[1]

اس نظریۂ ضرورت کا ذکر جس کے تحت عورت کی گواہی قابل قبول ہے، امام مالک نے بھی کیا ہے، چنانچہ المدونة الکبریٰ میں امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«لَا يَجُوزُ إِلَّا حَيْثُ ذَكَرَهَا اللهُ فِي الدَّيْنِ أَوْ مَا لَا يَطَّلِعُ عَلَيْهِ أَحَدٌ إِلَّا هُنَّ لِلضَّرُورَةِ إِلَى ذٰلِكَ»

''عورت کی گواہی صرف دَین (ادھار) کے معاملے میں جائز ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یا پھر ایسے معاملات میں ان کی گواہی جائز ہے جن پر عورتوں کے سوا کوئی اور مطلع نہ ہو سکے کیونکہ ضرورت اس کی متقاضی ہے۔''[2]

امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے:

إِلَّا فِيمَا لَا يَطَّلِعُ عَلَيْهِ غَيْرُ هُنَّ لِلضَّرُورَةِ.[3]

امام قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:[4]

«وَأَجَازَ الْعُلَمَاءُ شَهَادَتَهُنَّ مُنْفَرِدَاتٍ فِيمَا لَا يَطَّلِعُ عَلَيْهِ غَيْرُهُنَّ لِلضَّرُورَةِ وَعَلٰى مِثْلِ ذٰلِكَ أُجِيزَتْ شَهَادَةُ الصِّبْيَانِ

1 مختصر الفتاوی المصرية، ص: 604۔ 2 المدونة الکبریٰ: 84/4۔ 3 فتح القدير: 282/1۔ 4 تفسير القرطبي: 391/3۔

فِي الْجَرْحِ فِيمَا بَيْنَهُمْ»

چونکہ عورت کی گواہی اسی نظریۂ ضرورت پر مبنی ہے، اس لیے امام مالک یہ بھی کہتے ہیں کہ دو مرد گواہوں کے مقابلے میں چار عورتیں ضروری نہیں ہیں۔ (جیسا کہ امام شافعی کی رائے ہے) بلکہ فیصلے کے لیے دو عورتوں کی گواہی بھی کافی ہے کیونکہ جب ضرورتاً مرد کی گواہی یہاں ساقط ہے تو پھر وہی نصابِ شہادت کافی ہے جو مردوں کے لیے ہے، چنانچہ بدائع الصنائع میں امام کاسانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:[1]

«وَجْهُ قَوْلِ مَالِكٍ أَنَّ شَهَادَةَ الرِّجَالِ لَمَّا سَقَطَ اعْتِبَارُهَا فِي هٰذَا الْبَابِ لِمَكَانِ الضَّرُورَةِ وَجَبَ الْاِكْتِفَاءُ بِعَدَدِهِمْ مِنَ النِّسَآءِ»

بہر حال اسی نظریۂ ضرورت کے تحت دوسری قسم کے معاملات میں بھی عورت کی گواہی مقبول ہے، چنانچہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«كَمَا تُقْبَلُ شَهَادَةُ النِّسَآءِ فِي الْحُدُودِ إِذَا اجْتَمَعْنَ فِي الْعُرْسِ وَالْحَمَّامِ، وَنَصَّ عَلَيْهِ أَحْمَدُ فِي رِوَايَةِ بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ أَبِيهِ وَنَقَلَ ابْنُ صَدَقَةَ فِي الرَّجُلِ يُوصِي بِأَشْيَاءَ لِأَقَارِبِهِ وَيُعْتِقُ، وَلَا يَحْضُرُهُ إِلَّا النِّسَآءُ، هَلْ يَجُوزُ شَهَادَتُهُنَّ فِي الْحُقُوقِ وَالصَّحِيحُ قُبُولُ شَهَادَةِ النِّسَآءِ فِي الرَّجْعَةِ»

''یعنی کفار کی شہادت عندالضرورت اسی طرح جائز ہے جس طرح حدود میں عورتوں کی شہادت مقبول ہے جبکہ وہ شادی یا حمام وغیرہ میں جمع ہوں (اور وہاں

---

1 278/6.

مرد کوئی نہ ہو) امام احمد سے بھی اس بارے میں صراحت منقول ہے اور ابن صدقہ نے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی اگر اپنے رشتے داروں کے لیے وصیت کرتا ہے اور غلام آزاد کرتا ہے لیکن اس وقت (گواہ) عورتوں کے سوا اور کوئی نہ ہو تو کیا حقوق میں عورتوں کی گواہی قبول ہوگی؟ اور صحیح بات یہ ہے کہ رجوع میں عورتوں کی شہادت قبول ہے۔"[1]

یہاں عبارت میں کچھ ابہام ہے۔ اس کی وضاحت ابن قیم کی عبارت سے ہو جاتی ہے:[2]

«قَالَ الْإِمَامُ أَحْمَدُ فِي الرَّجُلِ: يُوصِي وَلَا يَحْضُرُهُ إِلَّا النِّسَآءُ، قَالَ: أُجِيزُ شَهَادَةَ النِّسَآءِ، فَظَاهِرُ هٰذَا أَنَّهُ أَثْبَتَ الْوَصِيَّةَ بِشَهَادَةِ النِّسَآءِ عَلَى الْاِنْفِرَادِ إِذَا لَمْ يَحْضُرْهُ الرِّجَالُ، وَذَكَرَ الْخَلَّالُ عَنْ أَحْمَدَ أَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الرَّجُلِ يُوصِي بِأَشْيَاءَ لِأَقَارِبِهِ وَيُعْتِقُ، وَلَا يَحْضُرُهُ إِلَّا النِّسَآءُ، هَلْ يَجُوزُ شَهَادَتُهُنَّ؟ قَالَ: نَعَمْ، تَجُوزُ شَهَادَتُهُنَّ فِي الْحُقُوقِ»

امام ابن قیم اس دوسری قسم کے معاملات میں عورت کی گواہی پر علماء کا اتفاق بتلاتے ہیں:

«وَقَدِ اتَّفَقَ الْعُلَمَآءُ عَلٰى أَنَّ مَوَاضِعَ الْحَاجَاتِ يُقْبَلُ فِيهَا مِنَ الشَّهَادَاتِ مَا لَا يُقْبَلُ فِي غَيْرِهَا مِنْ حَيْثُ الْجُمْلَةِ، وَإِنْ تَنَازَعُوا فِي بَعْضِ التَّفَاصِيلِ، وَقَدْ أَمَرَ اللهُ سُبْحَانَهُ بِالْعَمَلِ بِشَهَادَةِ شَاهِدَيْنِ مِنْ غَيْرِ الْمُسْلِمِينَ عِنْدَ الْحَاجَةِ فِي الْوَصِيَّةِ فِي السَّفَرِ، مُنَبِّهًا بِذٰلِكَ عَلٰى نَظِيرِهِ وَمَا هُوَ أَوْلٰى مِنْهُ كَقُبُولِ شَهَادَةِ النِّسَآءِ مُنْفَرِدَاتٍ فِي الْأَعْرَاسِ

---

1 الاختيارات العلمية مع الفتاوىٰ: 213/4، طبع 1329ھ۔ 2 الطرق الحكمية، ص: 142 .

وَالْحَمَّامَاتِ وَالْمَوَاضِعِ الَّتِي تَنْفَرِدُ النِّسَآءُ بِالْحُضُورِ فِيهَا، وَلَا رَيْبَ أَنَّ قُبُولَ شَهَادَتِهِنَّ هُنَا أَوْلٰى مِنْ قُبُولِ شَهَادَةِ الْكُفَّارِ عَلَى الْوَصِيَّةِ فِي السَّفَرِ، وَكَذٰلِكَ عَمَلُ الصَّحَابَةِ وَفُقَهَاءِ الْمَدِينَةِ بِشَهَادَةِ الصِّبْيَانِ عَلٰى تَجَارُحِ بَعْضِهِمْ بَعْضًا، فَإِنَّ الرِّجَالَ لَا يَحْضُرُونَ مَعَهُمْ فِي لَعِبِهِمْ، وَلَوْ لَمْ تُقْبَلْ شَهَادَتُهُمْ وَشَهَادَةُ النِّسَآءِ مُنْفَرِدَاتٍ لَضَاعَتِ الْحُقُوقُ وَتَعَطَّلَتْ وَأُهْمِلَتْ مَعَ غَلَبَةِ الظَّنِّ أَوِ الْقَطْعِ بِصِدْقِهِمْ، وَلَاسِيَّمَا إِذَا جَاءُوا مُجْتَمِعِينَ قَبْلَ تَفَرُّقِهِمْ وَرُجُوعِهِمْ إِلٰى بُيُوتِهِمْ وَتَوَاطَؤُوا عَلٰى خَبَرٍ وَاحِدٍ، وَفُرِّقُوا وَقْتَ الْأَدَاءِ وَاتَّفَقَتْ كَلِمَتُهُمْ، فَإِنَّ الظَّنَّ الْحَاصِلَ حِينَئِذٍ مِنْ شَهَادَتِهِمْ أَقْوٰى بِكَثِيرٍ مِنَ الظَّنِّ الْحَاصِلِ مِنْ شَهَادَةِ رَجُلَيْنِ، وَهٰذَا مِمَّا لَا يُمْكِنُ دَفْعُهُ وَجَحْدُهُ، فَلَا نَظُنُّ بِالشَّرِيعَةِ الْكَامِلَةِ الْفَاضِلَةِ الْمُنْتَظِمَةِ لِمَصَالِحِ الْعِبَادِ فِي الْمَعَاشِ وَالْمَعَادِ أَنَّهَا تُهْمِلُ مِثْلَ هٰذَا الْحَقِّ وَتُضَيِّعُهُ مَعَ ظُهُورِ أَدِلَّتِهِ وَقُوَّتِهَا، وَتَقْبَلُهُ مَعَ الدَّلِيلِ الَّذِي هُوَ دُونَ ذٰلِكَ»

’’علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ضرورت کے مواقع پر ایسی شہادات بھی قبول ہوں گی جو عام حالات میں ناقابل قبول ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان کی بعض تفصیلات میں علماء کے مابین اختلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سفر میں وصیت کے موقع پر ضرورت کے تحت دو غیر مسلم گواہوں کی گواہی پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ جس سے مقصود اس قسم کے معاملات یا اس سے بھی اولیٰ قضایا میں تنبیہ کرنا ہے

(نشاندہی کرنا ہے) جیسے تنہا عورتوں کی گواہی کا قبول کرنا ہے شادی کے مواقع، حمامات اور ایسی جگہوں میں جہاں صرف عورتیں ہی موقع پر حاضر ہوں۔ بلاشبہ ایسے مواقع پر عورتوں کی گواہی کا قبول کرنا، دوران سفر وصیت میں کفار کی شہادت قبول کرنے کی نسبت زیادہ اولیٰ ہے۔

اسی طرح صحابۂ کرام اور فقہائے مدینہ نے بچوں کی شہادت کے معاملے میں طرزِ عمل اختیار کیا ہے جبکہ ان بچوں کے مابین آپس میں کوئی حادثہ رونما ہو جائے (عند الضرورت یہاں بچوں کی گواہی بھی قبول ہوگی) اس لیے کہ مرد بچوں کے ساتھ ان کے کھیلوں میں شریک نہیں ہوتے۔ اگر ان بچوں کی اور تنہا عورتوں کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی تو بہت سے حقوق غلبۂ ظن یا گواہوں کی قطعی صداقت کے باوجود ضائع، معطل اور مہمل ہو جائیں گے۔ بالخصوص جبکہ موقع کے گواہ متفرق ہونے اور اپنے گھر میں جانے سے قبل مجتمع ہو کر گواہی دیں اور کسی ایک خبر پر متفق ہوں اور ادائیگیٔ شہادت کے وقت کلمات میں فرق ہونے کے باوجود نفس موضوع پر اتفاق ہو تو ایسی گواہی سے اس وقت جو ظن حاصل ہو گا۔ وہ اس ظن سے زیادہ قوی ہو گا جو دو آدمیوں کی گواہی سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ ایسی بات ہے جس کا رد اور انکار ممکن نہیں، پس ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جو شریعت کامل ہو اور دنیا و آخرت کے معاملے میں بندوں کے مصالح کو محیط و منتظم ہو، وہ اس قسم کے حق کو مہمل چھوڑ دے گی اور دلائل کے ظہور اور قوت کے باوجود اسے ضائع کر دے گی جبکہ اس سے بھی کم تر دلیل کے ساتھ اس نے فیصلے کو قبول کیا ہے۔''[1]

1 إعلام الموقعين: 102/1.

دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے نظائر

دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی بعض مثالیں ہمیں ملتی ہیں جن میں صحابہ نے تنہا عورتوں کی گواہی پر فیصلے کیے ہیں۔ یہ مثالیں انھی حالات کی ہیں کہ جب مرد موقع پر نہیں تھے، مثلاً: ایک شخص نے نشے میں اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دیں، جس پر چار عورتوں نے گواہی دی۔ یہ معاملہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے عورتوں کی گواہی کو جائز قرار دیا اور طلاق کو نافذ کر کے میاں بیوی کے درمیان تفریق کرا دی۔

اسی طرح ایک عورت نے چند عورتوں کی موجودگی میں ایک بچے کو اپنے پیروں سے روند کر ہلاک کر دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صرف چار عورتوں کی گواہی پر فیصلہ کیا اور دیت دلوائی۔

حضرت شریح سے بھی گھریلو سامان کے جھگڑے میں ایسا فیصلہ منقول ہے جو انھوں نے صرف چار عورتوں کی گواہی پر دیا۔[1]

بہرحال جب عورتوں کی گواہی ان معاملات میں بالاتفاق جائز ہے جو تحت الثیاب ہوں جن پر عادتاً صرف عورتیں ہی مطلع ہو سکتی ہوں، جیسے ولادت، بکارت، استہلال، حیض اور حمل وغیرہ اور اس کی بنیاد اس نظریۂ ضرورت پر ہے کہ اگر یہاں عورتوں کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی تو بہت سے حقوق ضائع ہو جائیں گے تو اسی طرح اس اصول کے تحت وہاں بھی عورتوں کی گواہی قابل قبول ہونی چاہیے، جہاں وقوعہ کے وقت عورتوں کے سوا اور کوئی گواہ نہ ہو۔ عورت کی یہ واقعاتی شہادت بھی عقل و قیاس کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

عورت کا نصابِ شہادت

البتہ فقہاء کے مابین اس امر میں اختلاف ہے کہ جن نسوانی مسائل میں عورت کی شہادت

1 ملاحظہ ہو: الطرق الحكمية، ص: 135، والمحلى، الشهادات: 573,572/10.

قبول ہے،اس کا نصابِ شہادت کیا ہو۔ امام شافعی اور جمہور نے قرآن کے نصابِ شہادت کا اعتبار کرتے ہوئے چار عورتوں کو ضروری قرار دیا ہے اور امام مالک کے نزدیک دو عورتیں بھی کافی ہیں جبکہ احناف کے نزدیک ایک عورت بھی کافی ہے۔ اگر ایک سے زیادہ ہوں [1] تو زیادہ بہتر ہے۔

ایک ضروری وضاحت

یہ خیال رہے کہ عورت کا یہ نصاب شہادت صرف ان نسوانی مسائل کے ضمن میں فقہاء نے بیان کیا ہے جن پر مرد مطلع نہیں ہو پاتے، اس لیے یہ نصابِ شہادت قسم اول کا ہے۔ قسم دوم میں ،یعنی ایسے معاملات میں کہ جن میں موقع کی گواہ صرف عورتیں ہی ہوں، وہاں ان کا نصاب شہادت کیا ہوگا؟ راقم کو اس سلسلے میں فقہی کتابوں میں کچھ نہیں ملا، اس لیے راقم کے خیال میں یہاں ابن حزم کا نقطۂ نظر اپنانا چاہیے کہ عورت کا نصاب مرد سے دگنا ہو، یعنی زنا کے کیس میں آٹھ عورتوں کی گواہی اور باقی کیسوں میں 4 چار عورتیں ضروری ہوں تاکہ نصوص قرآن و حدیث سے تصادم نہ ہو۔ بہرحال یہ مسئلہ اہل علم کے غور وفکر کے قابل ہے۔

اموال وڈُیون میں عورت کی گواہی

جہاں تک اموال و دیون کا تعلق ہے تو نص قرآنی کی وجہ سے اس میں علماء کے مابین زیادہ اختلاف نہیں۔ سب کے نزدیک ان معاملات میں دو مرد گواہ ہوں یا ایک مرد اور دو

1 اس کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو:الهداية مع فتح القدير: 7/372، وبدائع الصنائع: 6/277، 278، والمدونة الكبرٰى: 4/79,80، وبداية المجتهد: 2/465، وتفسير غرائب القرآن، پارہ:3، ص:91، والمهذب: 2/333، 334، والطرق الحكمية: 137، والمحلٰى، الشهادات، وإعلام الموقعين: 1/102، وفتح الباري: 5/266.

عورتیں دونوں طرح صحیح ہے۔ امام ابن قیم لکھتے ہیں:[1]

«وَقَدِ اتَّفَقَ الْمُسْلِمُونَ عَلٰى أَنَّهُ يُقْبَلُ فِي الْأَمْوَالِ رَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ، وَكَذٰلِكَ تَوَابِعُهَا مِنَ الْبَيْعِ، وَالْأَجَلِ فِيهِ، وَالْخِيَارِ فِيهِ، وَالرَّهْنِ، وَالْوَصِيَّةِ لِلْمُعَيَّنِ، وَهِبَتِهِ وَالْوَقْفِ عَلَيْهِ، وَضَمَانِ الْمَالِ، وَإِتْلَافِهِ، وَدَعْوٰى رِقِّ مَجْهُولِ النَّسَبِ، وَتَسْمِيَةِ الْمَهْرِ، وَتَسْمِيَةِ عِوَضِ الْخُلْعِ، يُقْبَلُ فِي ذٰلِكَ رَجُلٌ وَّامْرَأَتَانِ»

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:[2]

«أَمَّا اتِّفَاقُهُمْ عَلٰى جَوَازِ شَهَادَتِهِنَّ فِي الْأَمْوَالِ فَلِلْآيَةِ الْمَذْكُورَةِ . . . وَأَمَّا اخْتِلَافُهُمْ فِي النِّكَاحِ وَنَحْوِهِ فَمَنْ أَلْحَقَهَا بِالْأَمْوَالِ فَذٰلِكَ لِمَا فِيهَا مِنَ الْمُهُورِ وَالنَّفَقَاتِ وَنَحْوِ ذٰلِكَ، وَمَنْ أَلْحَقَهَا بِالْحُدُودِ فَلِأَنَّهَا تَكُونُ اسْتِحْلَالًا لِلْفُرُوجِ وَتَحْرِيمَهَا بِهَا، قَالَ: وَهٰذَا هُوَ الْمُخْتَارُ، وَيُؤَيِّدُ ذٰلِكَ قَوْلُهُ تَعَالٰى ﴿وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ ثُمَّ سَمَّاهَا حُدُودًا فَقَالَ ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾ وَالنِّسَاءُ لَا يُقْبَلْنَ فِي الْحُدُودِ»

الشیخ اسماعیل حقی لکھتے ہیں:[3]

«شَهَادَةُ النِّسَآءِ مَعَ الرِّجَالِ فِي الْأَمْوَالِ جَائِزَةٌ مَعَ الْإِجْمَاعِ دُونَ الْحُدُودِ وَالْقِصَاصِ»

مزید اس کے لیے دیکھیے: تفسیر غرائب القرآن: 91، پارہ 3، وتفسیر الخازن:

---

1 أعلام الموقعين: 97/1 . 2 فتح الباري، الشهادات: 329,328/5 . 3 تفسير روح البيان، پاره: 3، ص: 441 .

1/215، پارہ: 3، وتفسیر القرطبي:391، پارہ: 3، أحکام القرآن للجصاص: 598، پارہ: 3 اور دیگر تفاسیر و کتب فقہ۔ اس مسئلہ پر چونکہ اتفاق ہے، اس لیے اس پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں۔

ایک قابل غور نکتہ

تاہم ایک نکتہ ضرور قابل غور ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی اس وقت قابل قبول ہے جبکہ دو مرد گواہ میسر نہ ہوں یا مطلقاً ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی کی اجازت ہے۔ جمہور مفسرین کی رائے میں تو یہ اجازت مطلقاً ہے، یعنی گواہ بنانے والے کی رائے پر موقوف ہے کہ وہ دیون و اموال میں دو مردوں کو گواہ بنا لے یا ایک مرد اور دو عورتوں کو، دونوں طرح جائز ہے لیکن بعض لوگوں کے نزدیک مالیات کے معاملے میں بھی ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی اس صورت میں جائز ہوگی جب دو مردوں کا بطور گواہ ملنا مشکل ہو۔ جس طرح پانی کے ہوتے ہوئے تیمّم کی اجازت نہیں، اسی طرح مرد گواہ میسر ہونے کی صورت میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ بنانا صحیح نہیں۔

ان میں سے کون سی رائے صحیح ہے، اس پر اہل علم غور کر سکتے ہیں، تاہم سیاق کلام سے دوسری رائے کی تائید ہوتی ہے۔

فقہاء کے درمیان ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ اموال کے علاوہ دیگر حقوق میں عورت کی گواہی قبول ہے یا نہیں، فقہائے احناف حدود و قصاص کے علاوہ دیگر تمام حقوق و معاملات میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی جائز مانتے ہیں جبکہ دوسرے فقہاء اسے اموال و دیون تک محدود رکھتے ہیں، بہرحال یہ اختلاف اس وقت ہمارے دائرۂ بحث سے باہر ہے۔

حدود وقصاص میں عورت کی گواہی

حدود وقصاص میں عورت کی گواہی قبول ہے یا نہیں؟ فقہاء ان معاملات میں اس کی گواہی قبول کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ بعض متجد دین نے اس مسئلے کو بڑی شدت بلکہ تحدی کے ساتھ اٹھایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فقہاء کی یہ رائے کہ حدود و قصاص میں عورت کی گواہی قبول نہیں، قرآن کے خلاف ہے، قرآن نے یہ تفریق نہیں کی جبکہ تمام فقہاء کے درمیان اس امر پر اتفاق ہے کہ حدود و قصاص میں عورت کی گواہی نامقبول ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے اتفاق بین جمیع الفقہاء کے سلسلے میں اقتباسات پیش خدمت ہیں:

«وَاتَّفَقُوا عَلٰى أَنَّ شَهَادَةَ النِّسَآءِ غَيْرُ جَائِزَةٍ، وَلَا مَقْبُولَةٍ فِي الْعُقُوبَاتِ، وَالْحُدُودِ»[1]

«أَمَّا اتِّفَاقُهُمْ عَلٰى مَنْعِهَا فِي الْحُدُودِ وَالْقِصَاصِ، فَلِقَوْلِهِ تَعَالٰى: ﴿ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ﴾ »[2]

«أَنَّ فِي الزِّنَا يَجِبُ شَهَادَةُ أَرْبَعَةٍ مِنَ الرِّجَالِ بِالْاِتِّفَاقِ، لِقَولِهِ تَعَالٰى ﴿ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ﴾ وَفِي غَيْرِ الزِّنَا مِنَ الْحُدُودِ وَالْقِصَاصِ، تُقْبَلُ فِيهَا شَهَادَةُ رَجُلَيْنِ، فَحَسْبُ بِالْاِتِّفَاقِ»[3]

«وَاشْتِرَاطُ عَدَم تَيَسُّرِ رَجُلَيْنِ لِلاِسْتِشْهَادِ بِالْمَرْأَتَيْنِ مَعَ الرَّجُلِ يُشْعِرُ كَونَهُمَا بَدَلًا مِنَ الرَّجُلِ، وَأَنَّ الْأَصْلَ عَدَمُ الْاِسْتِشْهَادِ بِهِنَّ لِلشُّبْهَةِ الْبَدَلِيَّةِ، لَا يَجُوزُ شَهَادَةُ النِّسَآءِ فِيمَا

1 الخازن: 215/1 . 2 فتح الباري، الشهادات، باب شهادة النسآء: 329,328/5 .
3 التفسيرات الأحمدية: 179 .

يَنْدَرِيءُ بِالشُّبُهَاتِ مِنَ الْحُدُودِ وَالْقِصَاصِ إِجْمَاعًا»[1]

اسی طرح تمام فقہی کتابوں میں صراحت کی گئی ہے کہ زنا وغیرہ جیسے جرم کے ثبوت کے لیے مرد گواہ ضروری ہیں۔[2]

فقہائے کرام کے استدلال کی بنیادیں

اس طرح تمام فقہاء کے درمیان اس امر پر اتفاق ہے کہ حدود و قصاص میں عورت کی گواہی قبول نہیں اور ان سب کا استدلال اس بات پر ہے کہ قرآن کریم نے ان معاملات میں گواہوں کا ذکر جن الفاظ (صیغوں) میں کیا ہے۔ وہ سب مذکر کے صیغے ہیں، مثلاً: زنا اور قذف کے بارے میں حکم دیا کہ چار گواہ مرد ہوں، فرمایا:

﴿وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ﴾[3]

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً﴾[4]

طلاق اور رجوع کے بارے میں دو عادل مرد گواہ بنانے کا حکم دیا، فرمایا:

﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾[5]

ان کے علاوہ چند اور مقامات ہیں جہاں قرآن کریم میں گواہ بنانے کا ذکر ہے، مثلاً:

1 تفسير المظهري: 422/1 . 2 دیکھیے: المغني: 175/10، والمدونة الكبرٰى: 4/83و84، وبداية المجتهد: 465/2، وبدائع الصنائع: 277/6، والتشريع الجنائي الإسلامي: 410/2، وفقه السنة: 355/2، والمهذب: 332/2 . 3 النسآء 15:4 . 4 النور 4:24 .
5 الطلاق 2:65 .

یتیموں کے اموال کی واپسی کے سلسلے میں فرمایا:

﴿ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ﴾[1]

وصیت کے سلسلے میں فرمایا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُم مُّصِيبَةُ الْمَوْتِ ۚ تَحْبِسُونَهُمَا مِن بَعْدِ الصَّلَاةِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِي بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللَّهِ إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الْآثِمِينَ ○ ﴾[2]

قرآن کریم نے ان تمام مقامات میں گواہوں کا ذکر مذکر کے صیغوں میں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم عورت کو عدالتی شہادت کے چکر میں پھنسانا پسند نہیں کرتا۔ ورنہ وہ آیت مداینت کی طرح عورت کی گواہی کا ذکر بھی کر دیتا کیونکہ عدالتی شہادت عورت کے مزاج، فطرت اور اس کے دائرۂ کار کے فرائض سے مناسبت نہیں رکھتی۔ اس کا تحمل صرف مرد ہی کر سکتے ہیں جن کے قوائے عملی و ذہنی بھی مضبوط تر ہیں اور وہ بیرونی معاملات کے ذمے دار بھی ہیں اور اموال و دیون میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی کی اجازت کی وجہ یہ ہے کہ معاشرے میں اس کی عام ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ جو عام پیش آنے والی چیز ہو، اس میں شریعت کی طرف سے سہولت کا اہتمام بھی ہوتا ہے، چنانچہ امام قرطبی لکھتے ہیں:

«فَجَعَلَ تَعَالٰی شَهَادَةَ الْمَرْأَتَيْنِ مَعَ الرَّجُلِ جَائِزَةً مَعَ وُجُودِ الرَّجُلَيْنِ فِي هٰذِهِ الْآيَةِ، وَلَمْ يَذْكُرْهَا فِي غَيْرِهَا، فَأُجِيزَتْ

1 النسآء 6:4 . 2 المآئدة 106:5 .

فِي الْأَمْوَالِ خَاصَّةً فِي قَوْلِ الْجُمْهُورِ، بِشَرْطِ أَنْ يَّكُونَ مَعَهُمَا رَجُلٌ وَإِنَّمَا كَانَ ذٰلِكَ فِي الْأَمْوَالِ دُونَ غَيْرِهَا، لِأَنَّ الْأَمْوَالَ كَثَّرَ اللهُ أَسْبَابَ تَوْثِيقِهَا لِكَثْرَةِ جِهَاتِ تَحْصِيلِهَا وَعُمُومِ الْبَلْوٰى بِهَا وَتَكَرُّرِهَا، فَجَعَلَ فِيهَا التَّوَثُّقَ تَارَةً بِالْكَتْبَةِ وَتَارَةً بِالْإِشْهَادِ وَتَارَةً بِالرَّهْنِ وَتَارَةً بِالضَّمَانِ، وَأَدْخَلَ فِي جَمِيعِ ذٰلِكَ شَهَادَةَ النِّسَآءِ مَعَ الرِّجَالِ»

''اللہ تعالیٰ نے اس آیت ﴿فَإِنْ لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتٰنِ﴾ [1] میں دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کے ساتھ جائز رکھا ہے۔ اس آیت کے علاوہ کہیں اور عورت کی گواہی کا اللہ نے ذکر نہیں کیا، اس لیے جمہور نے اموال میں عورت کی شہادت کو اس شرط کے ساتھ جائز رکھا ہے کہ اس کے ساتھ ایک مرد بھی ہو اور یہ جواز صرف اموال میں ہے، کسی اور میں نہیں کیونکہ اموال میں عموم بلویٰ کی صورت پائی جاتی ہے اور بار بار اس کی ضرورت پیش آتی ہے، بنابریں شریعت نے اس کی توثیق کے اسباب بھی متعدد بیان کیے ہیں۔ کبھی یہ توثیق ضبط تحریر و کتابت کی صورت میں ہوتی ہے، کبھی گواہ بنا لینے کی صورت میں، کبھی گروی اور کبھی ضمانت کے ذریعے سے اور ان تمام صورتوں میں ایک عورت کی شہادت کو مردوں کے ساتھ جائز رکھا ہے۔'' [2]

حدود و قصاص کے معاملات اسلامی معاشرے میں اتنی کثرت اور تکرار کے ساتھ پیش نہیں آتے کہ وہاں مردوں کی گواہی ناکافی ہو اور عورتوں کی دخل اندازی بھی اس میں ضروری ہو، اس لیے اسلوب قرآن اسی بات کا متقاضی ہے کہ حدود و قصاص میں عورت کو

1 البقرة 2:282. 2 تفسير القرطبي: 391/3.

گواہی سے مستثنیٰ ہی رکھا جائے۔

② آیاتِ مذکورہ سے فقہاء و محدثین کے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ عربی زبان کے قواعد کی رو سے ایک اور دو افراد کی تعداد کے لیے جو اسم عدد استعمال ہوتا ہے وہ معدود کی تذکیر و تانیث کے مطابق ہوتا ہے مگر تین سے دس تک معدود افراد کے لیے جو عدد استعمال کیا جاتا ہے وہ مذکر معدود کے لیے مؤنث اور مؤنث معدود کے لیے مذکر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ﴿بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ﴾ کی ترکیب میں عدد [أَرْبَعَةِ] مؤنث ہے جو معدود [شهَدَآء] کی تذکیر پر دلالت کرتا ہے۔ اس طرح مؤنث عدد [أَربَعَة] کے ساتھ مذکر معدود [شهَدَآء] نے مل کر اس آیت کو مردوں کے لیے خاص کر دیا ہے، چنانچہ امام ابن قدامہ مقدسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

(الشرط الثاني) أَنْ يَّكُونُوا رِجَالًا كُلُّهُمْ وَلَا تُقْبَلُ فِيهِ شَهَادَةُ النِّسَآءِ بِحَالٍ، وَلَا نَعْلَمُ فِيهِ خِلَافًا إِلَّا شَيْئًا يُرْوٰى عَنْ عَطَاءٍ وَحَمَّادٍ أَنَّهُ يُقْبَلُ فِيهِ ثَلَاثَةُ رِجَالٍ وَامْرَأَتَانِ، وَهُوَ شُذُوذٌ لَا يُعَوَّلُ عَلَيْهِ، لِأَنَّ لَفْظَ الْأَرْبَعَةِ اِسْمٌ لِعَدَدِ الْمَذْكُورِينَ وَيَقْتَضِي أَنْ يُّكْتَفٰى فِيهِ بِأَرْبَعَةٍ، وَلَا خِلَافَ فِي أَنَّ الْأَرْبَعَةَ إِذَا كَانَ بَعْضُهُمْ نِسَاءً لَا يُكْتَفٰى بِهِمْ، وَإِنَّ أَقَلَّ مَا يُجْزِىءُ خَمْسَةٌ وَهٰذَا خِلَافُ النَّصِّ، وَلِأَنَّ فِي شَهَادَتِهِنَّ شُبْهَةً لِتَطَرُّقِ الضَّلَالِ إِلَيْهِنَّ، قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى ﴿اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى﴾ وَالْحُدُودُ تُدْرَأُ بِالشُّبُهَاتِ»

''دوسری شرط یہ ہے کہ چاروں گواہ مرد ہوں، اس میں عورت کی گواہی کسی حال میں قبول نہیں۔ اس میں سوائے حماد اور عطاء کے کسی کا اختلاف نہیں۔ ان کے

خیال میں تین مرد اور دو عورتیں بھی قبول ہیں لیکن یہ شاذ مسلک ہے جو قابل اعتبار نہیں کیونکہ "أَرْبَعَة" کا لفظ عددِ مذکورین کا اسم ہے جو اس بات کا مقتضی ہے کہ وہ چار ہی ہوں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ چار گواہوں میں اگر کوئی عورت بھی گواہ ہوگی (تو ایک مرد کے مقابلے میں دو ہونے کی وجہ سے) گواہوں کی تعداد چار سے متجاوز اور کم از کم بھی پانچ ہو جائے گی اور یہ چیز نص کے خلاف ہوگی۔ علاوہ ازیں عورت کی گواہی میں ﴿اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا﴾ کے پیش نظر شبہ کے امکانات ہیں اور حدود شبہات سے ساقط ہو جاتے ہیں، اس لیے بھی حدود میں عورت کی گواہی قابل قبول نہیں۔"[1]

امام ابن ہمام لکھتے ہیں (بسلسلہ شہودِ زنا):

(لِأَنَّ النَّصَّ أَوْجَبَ أَرْبَعَةَ رِجَالٍ بِقَوْلِهِ تَعَالىٰ ﴿اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ﴾ فَقُبُولُ امْرَأَتَيْنِ مَعَ ثَلَاثَةٍ مُخَالِفٌ لِمَا نَصَّ عَلَيْهِ مِنَ الْعَدَدِ وَالمَعْدُودِ......)

"یعنی زنا کے ثبوت کے لیے چار مرد گواہ ضروری ہیں کیونکہ ﴿فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ﴾ کی نص قرآنی نے مردوں کو متعین کر دیا ہے، اس لیے تین مردوں کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی کو قبول کرنا یہ اس نص کے خلاف ہے جو قرآن میں عدد معدود کے بارے میں وارد ہے۔"[2]

③ تیسرا استدلال فقہاء نے یہ کیا ہے کہ چونکہ عورت عدالتی شہادت میں فطری طور پر کمزور ہے اس کی اس فطری کمزوری سے کیس میں شبہ پیدا ہو سکتا ہے اور نبی ﷺ نے تاکید کی ہے کہ حدود میں شبہات کا لحاظ کرو اور شبہ کی وجہ سے حد کا نفاذ معطل کر دو، اس

1 المغني والشرح الكبير: 171،170/10. 2 فتح القدير: 370/7.

لیے اگر حدود وقصاص میں عورت کی گواہی کو جائز رکھا جائے گا تو ان خطرناک کیسوں میں شبہات پیدا ہونے کا زیادہ امکان رہے گا جس کا فائدہ معاشرے کے خطرناک مجرموں کو ملے گا۔

ابن قدامہ مقدسی کی مذکورہ عبارت میں بھی یہ استدلال موجود ہے۔ ان کے علاوہ امام کاسانی فرماتے ہیں: ''حدود وقصاص شبہات سے ساقط ہو جاتے ہیں...... یہی وجہ ہے کہ ان میں عورتوں کی شہادت قبول نہیں کیونکہ سہو اور غفلت کی وجہ سے عورتوں کی شہادت میں شبہات راہ پا لیتے ہیں۔''[1]

اسی طرح ہدایہ میں ہے کہ حدود وقصاص کے علاوہ دیگر معاملات وحقوق شبہات کے ساتھ بھی ثابت ہو جاتے ہیں، اس لیے ان میں ان کی گواہی سے زیادہ اندیشہ نہیں۔[2]

④ چوتھا استدلال امام زہری کی مرسل روایت سے ہے:

«مَضَتِ السُّنَّةُ مِنْ رَّسُولِ اللهِ ﷺ وَالْخَلِيفَتَيْنِ مِنْ بَعْدِهِ أَنَّهُ لَا تَجُوزُ شَهَادَةُ النِّسَآءِ فِي النِّكَاحِ وَلَا فِي الطَّلَاقِ وَلَا فِي الْحُدُودِ»

ایک روایت میں یہ الفاظ اس طرح ہیں:

«قَالَ ابْنُ شِهَابٍ مَضَتِ السُّنَّةُ بِذٰلِكَ، بِأَنْ لَّا تَجُوزَ شَهَادَةُ امْرَأَتَيْنِ مَعَ الرَّجُلِ فِي الْقَتْلِ وَالنِّكَاحِ وَالطَّلَاقِ وَالْحُدُودِ»

''یعنی ابن شہاب زہری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد دونوں خلیفوں (ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) سے یہ سنت چلی آ رہی ہے کہ عورتوں کی گواہی حدود وقصاص اور نکاح وطلاق میں جائز نہیں۔''[3]

⑤ بعض فقہاء نے ایک وجہ استدلال یہ بھی لکھی ہے کہ عورت کو شہادت سے مستثنیٰ رکھنے

---

1 بدائع الصنائع: 281/2 . 2 الهداية مع فتح القدير: 371/7 . 3 المدونة الكبرىٰ: 84/4 .

کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا اصل دائرۂ کار...... گھریلو امور اور ذمے داریاں...... متأثر نہ ہوں اور گھر سے اس کو زیادہ نہ نکلنا پڑے۔[1]

بعض علماء نے اس پر تنقید کی ہے کہ یہ بڑی کمزور وجہ ہے لیکن اسلام نے عورت کے زیادہ باہر نکلنے کو جس طرح ناپسند کیا ہے اور گھر میں رہنے کی تاکید اور پردے کا حکم دیا ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ وجہ بھی بڑی معقول نظر آتی ہے۔ اسے کمزور نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال فقہائے اسلام کے متفقہ مسلک کی یہ پانچ بنیادیں ہیں۔

مرجوح اور شاذ مسلک

اس متفقہ مسلک کے مقابلے میں ایک رائے یہ ہے کہ عورت کی گواہی ہر معاملے میں قابل قبول ہے، اموال وحقوق میں بھی اور حدود وقصاص میں بھی، البتہ اس کی گواہی مرد کی گواہی سے نصف ہے، اس لیے اس کا نصاب شہادت مرد سے دگنا ہوگا، مثلاً: زنا کے جرم کے ثبوت میں 4 مردوں کی جگہ آٹھ عورتیں یا تین مرد اور دو عورتیں یا دو مرد اور چار عورتیں یا ایک مرد اور چھ عورتیں گواہ ہوں گی وغیرہ۔

یہ رائے عطاء، حماد اور امام ابن حزم رحمہم اللہ کی ہے۔ لیکن یہ مسلک شاذ ہے۔ اس کی بنیاد اس حدیث پر ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«أَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ؟»

''کیا عورت کی گواہی مرد کی گواہی سے نصف نہیں ہے؟......''[2]

اس حدیث کو ان حضرات نے عام رکھا ہے جبکہ جمہور فقہاء کے نزدیک یہ حدیث آیت مداینت کی تفسیر ہے کہ اموال میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی قبول ہو

1 الهداية مع فتح القدير: 372/7. 2 صحيح البخاري، الشهادات، باب شهادة النساء، حديث: 2658.

گی، تاہم ابن حزم رحمہ اللہ کا یہ مرجوح مسلک بھی مغربی نظریۂ مساواتِ مرد و زن کے حامیوں کے لیے چنداں مفید نہیں کہ اس میں بھی مرد کے مقابلے میں عورت کی نصف گواہی ہی کا اثبات ہے، جو ان کو کسی صورت قبول نہیں۔

مرد وزن کی مساوات کے قائلین کے دلائل کا جائزہ

اب ان دلائل کا جائزہ لیا جاتا ہے جو جمہور امت کے مسلک کے خلاف پیش کیے جاتے ہیں۔

① ان کی بڑی دلیل یہ ہے کہ ''قرآن میں شہادت کے سلسلے میں مذکر کے صیغوں سے جن لوگوں کو خطاب کیا گیا ہے، اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں کیونکہ قرآن کریم میں عموماً مذکر ہی کے صیغوں سے مردوں اور عورتوں دونوں کو خطاب کیا گیا ہے ورنہ عورتوں کو تمام مسائل سے سبکدوش ہونا پڑے گا۔

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾

مذکر ہی کے صیغے ہیں تو کیا صرف یہ کہہ دیا جائے کہ نماز اور زکاۃ صرف مردوں پر فرض ہے اور عورتیں اس خطاب میں داخل نہیں ہیں۔''

جواب: یہ بظاہر بہت وزنی دلیل ہے لیکن حقیقت میں پائے چوبیں کی طرح سخت بے تمکین ہے۔ اس میں مغالطہ انگیزی یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے مرد اور عورت دونوں کے جو الگ الگ دائرۂ کار متعین کیے ہیں، انھیں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اگر یہ تسلیم ہے کہ فی الواقع اسلام کی رو سے عورت کا دائرۂ کار گھریلو امور، خانہ داری، حمل و رضاعت اور بچوں کی نگرانی و حفاظت تک محدود ہے اور مرد کا دائرۂ کار معاشی جدوجہد اور تمام بیرونی معاملات تک وسیع ہے تو پھر یہ ماننے میں بھی تأمل نہیں ہونا چاہیے کہ شریعت اسلامیہ نے مرد و عورت دونوں کو ان کی الگ الگ ذمے داریوں اور طبعی اوصاف کا لحاظ کرتے

ہوئے ایک دوسرے سے مختلف احکام بھی دیے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض خصوصیات اور صلاحیتیں ایسی بھی ہیں جو مرد اور عورت دونوں میں مشترک ہیں۔ قرآن جب مذکر کے صیغوں سے دونوں کو خطاب کرتا ہے تو وہ اسی مشترک دائرۂ عمل سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے آپ یوں سمجھ سکتے ہیں کہ مرد و عورت کی فطری خصوصیات اور اعمال و وظائف کے اعتبار سے تین میدان عمل ہیں۔

① مرد کا دائرۂ عمل: جس میں مرد کی منفرد خصوصیات کے مطابق اس کے خاص فرائض و واجبات ہیں۔

② عورت کا دائرۂ عمل: جس میں اسے اس کی صنفی خصوصیات کے لحاظ سے مرد سے مختلف امور و فرائض سونپے گئے ہیں۔

③ مشترک دائرۂ عمل: جس میں دونوں کی فطری صلاحیتیں بھی یکساں ہیں اور تعلیمات و ہدایات میں بھی خاص اختلاف نہیں۔ ایمان و اعتقاد، عبادات اور اخلاقیات کی جملہ تعلیمات اسی مشترک دائرۂ عمل سے متعلق ہیں۔

اس بنیادی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ مذکر کے صیغوں میں عورتیں صرف اسی وقت مردوں کے ساتھ شامل ہوں گی جب ان صیغوں میں دیا جانے والا حکم، مرد اور عورت کے مشترک دائرۂ عمل سے تعلق رکھتا ہوگا ورنہ جہاں حکم کا تعلق صرف مرد کے دائرۂ عمل سے ہوگا، وہاں عورتیں یقیناً اس حکم سے خارج ہوں گی، مثلاً: قرآن مجید ان حاجیوں سے کہتا ہے جو کسی وجہ سے حرم کعبہ تک نہ پہنچ سکیں اور انھیں راستے ہی میں رک جانا پڑے۔

﴿فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۖ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ﴾

''اگر تم کہیں گھِر جاؤ تو جو قربانی میسر آئے (وہ اللہ کی جناب میں پیش کردو) اور اپنے سر نہ مونڈو یہاں تک کہ قربانی اپنی جگہ پہنچ جائے۔''[1]

اپنی جگہ پہنچنے سے کیا مراد ہے؟ فقہائے حنفیہ کے نزدیک اس سے مراد حرم ہے، یعنی اگر آدمی راستے میں رک جانے پر مجبور ہو تو اپنی قربانی کا جانور یا اس کی قیمت بھیج دے تاکہ اس کی طرف سے حدودِ حرم میں قربانی کی جائے اور امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک جہاں آدمی گھر گیا ہو، وہیں قربانی کر دینا مراد ہے۔

اس آیت میں یہ کہا جا رہا ہے کہ قربانی کے بعد اپنے سر جائے محاصرہ پر منڈوا لو۔ آیت میں اگرچہ صیغہ مذکر ہی استعمال کیا گیا ہے لیکن مراد مرد اور عورت دونوں نہیں ہوں گے بلکہ صرف مرد ہوں گے کیونکہ سر منڈوانے کا تعلق مردوں ہی سے ہے، عورتوں سے نہیں۔ کیا یہاں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ عبادات سے متعلق تمام احکام کی طرح سر منڈوانے کے اس حکم میں مردوں کی طرح عورتیں بھی شامل ہوں گی۔

اسی طرح قرآن مجید نے اہل ایمان کو خطاب کر کے جگہ جگہ جمع مذکر کے صیغے میں کفار و مشرکین سے قتال کا حکم دیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ میدانِ کارزار میں سیف و سنان کے جوہر دکھانا مردوں کے دائرۂ عمل سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے ہر دور میں مسلمان مجاہدین ہی کفار سے برسرِ پیکار رہے ہیں۔ مسلمان خواتین کو اس کا مخاطب نہیں سمجھا گیا۔ کیا:

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾

سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ امت مسلمہ نے چودہ سو سال سے اب تک قرآن کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔ اس میں تو مرد و عورت دونوں ہی شامل ہیں۔ عورتوں کو میدان جہاد و قتال سے الگ رکھ کر ان کی توہین کی گئی ہے۔ اگر جہاد ان پر فرض نہیں تو

[1] البقرة 2:196۔

نماز وزکاۃ ان پر کیوں فرض ہے؟

﴿ يَآيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾

اسی طرح آیت جمعہ میں اہل ایمان کو کہا گیا ہے کہ نماز جمعہ کے لیے اذان ہو جائے تو اسی وقت سب کچھ چھوڑ کر اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔[1] مذکورہ استدلال کی رو سے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی اس حکم کا مخاطب سمجھنا چاہیے لیکن نبی ﷺ سے لے کر آج تک کسی نے یہ مطلب نہیں سمجھا اور مردوں کی طرح عورتوں پر جمعہ کو فرض و واجب قرار نہیں دیا جبکہ آیت سے اہل ایمان کے لیے وجوب ثابت ہو رہا ہے۔ قرآن کریم سے اس طرح کی اور بھی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ایک مثال حدیث رسول ﷺ سے بھی سن لیجیے! حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

«أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ بِسَبْعٍ وَنَهَانَا عَنْ سَبْعٍ أَمَرَنَا بِاتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ، وَعِيَادَةِ الْمَرِيضِ، وَإِجَابَةِ الدَّاعِي، وَنَصْرِ الْمَظْلُومِ، وَإِبْرَارِ الْقَسَمِ، وَرَدِّ السَّلَامِ، وَتَشْمِيتِ الْعَاطِسِ، وَنَهَانَا عَنْ آنِيَةِ الْفِضَّةِ، وَخَاتَمِ الذَّهَبِ، وَالْحَرِيرِ، وَالدِّيبَاجِ، وَالْقَسِّيِّ، وَالْإِسْتَبْرَقِ»

''رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سات چیزوں کا حکم دیا اور سات چیزوں سے منع فرمایا: آپ نے ہمیں جنازے میں شریک ہونے، مریض کی عیادت کرنے، دعوت دینے والے کی دعوت قبول کرنے، مظلوم کی مدد کرنے، قسم پوری کرنے، سلام کا جواب دینے اور چھینک (مارنے والے) کا جواب دینے کا حکم دیا اور

1 الجمعة 9:62 .

ہمیں چاندی کے برتنوں، سونے کی انگوٹھی، ریشم (اور اس کی جمیع اقسام) دیباج، قسی اور استبرق سے منع کیا۔"[1]

''ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا'' میں ''ہمیں'' سے مراد تمام مسلمان مرد اور عورتیں ہیں لیکن یہاں اگر ہمارے بیان کردہ اصول کو ملحوظ نہیں رکھا جائے گا تو بہت گڑ بڑ ہوگی۔ اس حدیث میں بیک وقت تینوں قسم کی چیزیں موجود ہیں۔

① کئی چیزیں اس میں مشترک ہیں۔ مرد و عورت دونوں اس کے مخاطب سمجھے جائیں گے۔

② بعض حکم صرف مردوں کے لیے ضروری ہیں، عورتیں اس کی مکلّف نہیں، جیسے جنازوں میں شرکت۔

③ اسی طرح بعض ممنوع چیزوں کا تعلق صرف مردوں سے ہے، عورتوں سے نہیں۔ عورت کے لیے ان کا استعمال جائز ہے، جیسے سونے اور ریشم کا استعمال۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ مذکر کے صیغوں میں دیے جانے والے حکم میں عورتیں صرف اسی وقت شامل ہوں گی جبکہ وہ حکم مرد اور عورت کے مشترکہ دائرۂ عمل سے متعلق ہو یا دیگر دلائل شرعیہ سے کسی ایک صنف کا استثنا ثابت نہ ہو۔ اسی ﴿ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ﴾ کے حکم پر ذرا غور کیجیے (جس کی مثال دی گئی ہے) اس کا تعلق عبادت سے ہے جس میں مرد و عورت دونوں بلاشبہ شامل ہیں کیونکہ یہ مشترکہ دائرۂ عمل ہے۔ اس کے باوجود دیگر دلائل شرعیہ کی رو سے عورتوں کو ایک استثنا حاصل ہے کہ حیض و نفاس کے ایام میں نماز ان کے لیے معاف ہے جبکہ مرد کے لیے نماز کسی حالت میں بھی معاف نہیں۔

بنابریں عدالتی شہادت کا تعلق بھی مرد کے بیرونی معاملات سے ہے جو عورت کے دائرۂ عمل سے خارج ہے۔ شریعت نے اس کی صنفی خصوصیات، طبعی عوارض اور مخصوص گھریلو

[1] صحيح البخاري، الجنائز، باب الأمر باتباع الجنائز، حديث: 1239 .

ذمے داریوں کی وجہ سے اس کو ہر معاملے میں گواہ بنانا پسند نہیں کیا، اس لیے ناگزیر مواقع کے سوا، اس کو ہر معاملے میں مردوں کی طرح گواہ بنانے پر اس بنیاد پر اصرار کرنا کہ مذکر کے صیغوں کی وجہ سے مرد و عورت کے درمیان تفریق کرنا صحیح نہیں، اپنے اندر کوئی معقولیت نہیں رکھتا۔

حامیان مساوات سے ایک بنیادی سوال

علاوہ ازیں جمع مذکر کے صیغے سے استدلال کرتے ہوئے ہر معاملے میں مرد و عورت کی گواہی کو یکساں قرار دینا اس نص قرآنی کے بھی خلاف ہے جس میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کے برابر کہا گیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ وہاں تو اس کی وجہ، یعنی نسیان و ذہول ہے، اس لیے ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں ضروری ہیں تو سوال یہ ہے کہ اس فرق کی بنیاد کیا ہے کہ مالی معاملات میں تو نص قرآنی تنہا عورت کی گواہی قبول نہیں، البتہ ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں مل کر ایک مرد کے قائمقام بن سکتی ہیں لیکن حدود و قصاص اور دیگر تمام معاملات میں عورت کی گواہی کو مرد کے مساوی قرار دیا جائے۔ کیا نسیان والی صورت حال مالی معاملات ہی میں عورت کو لاحق ہوتی ہے، حدود و قصاص کے معاملات میں لاحق نہیں ہوسکتی؟ دلائل کی رو سے تو وہ علت، جس کی بنیاد پر دو عورتوں کو ضروری قرار دیا گیا ہے، عورت کی فطری کمزوری پر مبنی ہے جو ہر جگہ اور ہر کیس میں اس کے ساتھ رہے گی اور اس کے ہوتے ہوئے اسے عام حالات میں مرد کے مساوی تسلیم نہیں کیا جا سکتا، پھر آخر مالی معاملات میں اور غیر مالی معاملات میں عورت کی شہادت میں فرق کیوں؟ یہ ایک ایسا بنیادی سوال ہے کہ جس کو حل کیے بغیر عورت کو عدالتی شہادت میں مرد کے برابر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مرد کی ذہنی برتری کا تصور اور اس کا مفہوم

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ مرد کی ذہنی برتری کا تصور غلط ہے، بالخصوص موجودہ دور میں عورت نے اس پر خط تنسیخ پھیر دیا ہے، اس لیے مرد و عورت کے درمیان فرق کرنے

کا کوئی جواز نہیں۔

① لیکن عرض ہے کہ ذہنی برتری کا یہ تصور کسی انسان کا تراشیدہ نہیں ہے بلکہ شہادت میں دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر خالق کائنات نے قرار دیا ہے، حالانکہ نسیان، ذہول اور گھبراہٹ کا شکار مرد بھی ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس کی گواہی کو تو مستقل حیثیت دی ہے لیکن عورت کی گواہی کو ایک تو مستقل قرار نہیں دیا (محض عورتوں کی گواہی پر فیصلے کا حکم نہیں دیا) دوسرے، ایک مرد کے مقابلے میں اس کا نصاب دگنا رکھا۔ آخر یہ ذہنی برتری نہیں ہے تو کیا ہے۔

② اس حقیقت کو قرآن مجید میں ثبت فرما کر یہ واضح کر دیا کہ مرد وعورت کے درمیان یہ فطری فرق جو ہے، یہ عارضی نہیں، جب تک یہ سلسلۂ جہان رنگ و بو قائم ہے، یہ فرق بھی موجود رہے گا۔ عورت کتنی بھی ترقی کر لے، مرد کے مقام کو وہ کبھی نہیں پہنچ سکتی کیونکہ یہ فرق جبلی اور پیدائشی ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی۔

③ یہ مذکورہ دعویٰ پروپیگنڈے کی پوری قوت کے باوجود تشنۂ ثبوت ہے۔ ہم کسی اسلامی ملک کی مثال نہیں دیتے، امریکہ اور یورپ کو بطور مثال پیش کرتے ہیں، جہاں عورت زیادہ نہیں تو کم از کم ایک صدی سے ضرور ہر محاذ پر مردوں کے دوش بدوش سرگرم عمل ہے۔ اس کے نتیجے میں وہاں ہر جگہ مرد کے ساتھ عورت تو ضرور نظر آئے گی لیکن اس کے باوجود ہر شعبۂ کمال میں، چاہے سیاست و قیادت کا شعبہ ہو یا صنعت وحرفت کا، سائنسی علوم کا ہو یا بادیہ پیمائی و خلا نوردی کا، نہ صرف مردوں کا تناسب ہی زیادہ ملے گا بلکہ عالمی سطح پر صرف مرد ہی نظر آئیں گے۔ آج بھی یورپ میں وزراء کی اکثریت بلکہ بہت بڑی اکثریت مردوں ہی کی ہے۔ عورتیں بالکل قلیل بلکہ اقل قلیل وزارت کے منصب پر فائز ہیں۔ مغرب میں عورتیں بلاشبہ بڑے افسروں کی سٹینو یا سیکرٹری تو ہیں لیکن ہر محکمے میں

بڑے افسروں کی تعداد زیادہ تر مردوں ہی پر مشتمل ہے، حالانکہ تعلیمی لحاظ سے مرد وعورت کے تناسب میں زیادہ فرق نہیں ہوگا، اس کے باوجود ایسے کلیدی مناصب پر، جن کا تعلق ولایت، یعنی ملک چلانے سے ہے، زیادہ تر مرد ہی فائز ہیں اور عورتوں کو چند کھلونے دے کر بہلا دیا گیا ہے بلکہ اس کی مٹی پلید کی گئی ہے۔ اس کے لیے چند مخصوص شعبے مختص کر دیے گئے ہیں۔ نرسنگ کا پیشہ، ائیر ہوسٹس کا پیشہ یا پھر سیلز مینی اور ماڈلنگ کا پیشہ۔ کیا یہ پیشے واقعی ایسے ہیں کہ ان سے عورت کی عزت و احترام میں اضافہ ہوا ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مغرب چاہے زبان سے عورت کی فطری طور پر ذہنی فروتری کا اقرار نہ کرے لیکن اس کا عمل آج بھی بہ بانگ دہل اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے۔ سچ ہے قدرت کے فطری نظام کو کوئی تبدیل کرنے پر قادر نہیں۔

④ خود وہ حضرات بھی جو عدالتی شہادت میں مرد و عورت کے درمیان فرق کو عورت کی (نعوذ باللہ) توہین قرار دیتے ہیں۔ بیرونی معاملات میں مرد وعورت کے ذہنی تفاوت کو تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ اس ضمن میں دو کتابوں کے اقتباسات پیش خدمت ہیں۔ ایک مولانا عمر احمد عثمانی مصنف ''فقہ القرآن'' اور دوسرے ان کے پیش رو جناب غلام احمد پرویز۔

مولانا عثمانی صاحب آیت:

﴿فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتٰنِ﴾

کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس آیت کریمہ میں واقعی دو عورتوں کو ایک مرد کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے اور ایک عورت کی گواہی ایک مرد کے نصف کے برابر قرار دی گئی ہے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اسلام نے مردوں اور عورتوں کے دائرۂ کار کا تعین کر دیا ہے۔ مردوں کا کام بیرون خانہ اکتساب رزق کی تگ و دَو اور جدوجہد قرار دیا گیا ہے اور

عورتوں کا کام اندرون خانہ افزائش نسل، اولاد کی پرورش، غور و پرداخت، ان کی تربیت اور امور خانہ داری کی دیکھ بھال قرار دیا گیا ہے۔ اس کے ذمے نہ کسی کا نان ونفقہ ہے اور نہ اخراجاتِ زندگی کا حصول ہے۔ یہ کام مردوں کا ہے۔ قرض کا لین دین ظاہر ہے وہی کرے گا جسے نقد رقم کی ضرورت ہوگی۔ عورتوں کو اس کی ضرورت عموماً لاحق نہیں ہوتی، انھیں تو بیٹھے بٹھائے گھر میں اس کا باپ یا شوہر رقم مہیا کر کے دے دیتا ہے اور وہ اس رقم سے گھر کا سارا نظام چلاتی ہے۔ اس کا باپ یا شوہر خود کما کر لائے یا کسی سے قرض، ادھار لے کر لائے۔ بہرحال قرض کا لین دین عموماً عورت کے دائرۂ کار میں آتا ہی نہیں۔

یہ اصول بالکل فطری ہے کہ آدمی کو اپنے دائرۂ کار ہی میں دلچسپی ہوتی ہے اور اسی میں اس کا ذہن چلتا ہے۔ ایک آرٹس کے طالب علم سے جو بی-اے کی کلاس میں پڑھ رہا ہے۔ آپ یہ توقع قائم نہیں کر سکتے کہ وہ بی-ایس-سی کے فزکس یا کیمسٹری کا کوئی فارمولا آپ کو سمجھا سکے گا یا ایک بی-ایس-سی کے سٹوڈنٹ سے آپ دیوانِ غالب سبقاً سبقاً سمجھنا چاہیں تو یہ توقع محض بے جا ہوگی۔ ایک لاء گریجویٹ سے آپ کسی عمارت کا نقشہ نہیں بنوا سکتے اور ایک کوالیفائیڈ انجینئر سے آپ قانونی موشگافیوں کی توقع نہیں کر سکتے۔ ہر آدمی کا ذہن اپنے دائرۂ کار ہی میں چلتا ہے اس سے باہر وہ اور ایک جاہل اجڈ برابر ہی ہوتے ہیں، لہٰذا عورتوں کا ذہن مالی لین دین اور قرض وادھار کے معاملات میں ظاہر ہے مردوں کی طرح نہیں چل سکتا۔ جیسا کہ آپ مردوں سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ گھریلو معاملات کو بہتر طور پر حل کر سکیں گے۔ اسی طرح عورتوں سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ بیرون خانہ اقتصادی معاملات کو بھی بہتر طور پر سمجھ سکتی، سمجھا سکتی اور حل کر سکتی ہیں۔

عدالتوں کے چکر میں پھنسنا جہاں بال کی کھال اتاری جاتی ہے اور وکیل صاحبان اپنی جرح قدح سے اچھے اچھوں کے اوسان خطا کر دیتے ہیں۔ قرض لین دین کے سلسلہ میں

جو عورتوں کے دائرۂ کار سے تعلق بھی نہیں رکھتا ایک عورت کے لیے دردِ سر ہے۔ وہ تفصیلات کے بیان میں الجھ سکتی ہے جس سے پورا مقدمہ ہی خراب ہو سکتا ہے۔ اسی الجھاؤ اور اضطراب (Confusion) کو قرآن کریم نے

﴿أَن تَضِلَّ إِحْدَىٰهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَىٰهُمَا ٱلْأُخْرَىٰ﴾

سے تعبیر فرمایا ہے کہ اگر ایک عورت اپنے بیان میں الجھ جائے تو دوسری عورت اسے یاد دلا دے۔ [تَضِلَّ] کے معنی بھول جانے کے نہیں ہیں جو ہمارے عام مترجمین نے بیان کر دیے ہیں بلکہ اس کے معنی الجھاؤ اور اضطراب کے ہوتے ہیں۔ (اَلضَّلَّةُ) کے بنیادی معنی، تحیر، حیرانی، سرگردانی، اضطراب (Perplexed - Confused) کسی چیز کا پوشیدہ اور غائب ہو جانا، مختلف چیزوں کا باہم خلط ملط ہو جانا کہ پھر انھیں جدا نہ کیا جا سکے، ہوتے ہیں (تاج العروس)۔ لہٰذا اس کے معنی یہ ہیں کہ واقعہ کے مختلف پہلو خلط ملط ہو جانے کی وجہ سے عورتیں الجھ سکتی ہیں اور بات کو واضح نہیں کر پاتیں اور واقعہ کے بیان میں الجھاؤ سے پورا مقدمہ خراب ہو سکتا ہے، لہٰذا دو عورتیں ہونی چاہئیں کہ ایک عورت کو کوئی الجھاؤ ہو تو دوسری اس کے لیے اسے واضح کر دے۔ یہ عورتوں کا کوئی نقص نہیں ہے بلکہ ان کے طبعی اور خلقی ساخت کا لازمی نتیجہ ہے۔'[1]

جناب غلام احمد پرویز بھی مرد و عورت کے درمیان اس فرق کو تسلیم کرتے ہیں جو زیر بحث ہے، چنانچہ وہ بھی مذکورہ آیت مداینت کی تفسیر و توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اب سوال دوسرا باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن نے بالخصوص عورتوں کے متعلق کیوں کہا ہے کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ اشتباہ لاحق ہو جائے، کچھ گھبراہٹ سی ہو جائے تو دوسری عورت بات واضح کر دے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس تقسیم فرائض کی رو سے (جس کا ذکر میں

[1] فقه القرآن: 3/95-97.

نے اپنے خط میں کیا ہے، یعنی عورتوں کے لیے اولاد کی پرورش وتربیت کا فریضہ اور مردوں کے ذمے اکتساب رزق کی ذمے داری) ضروری تھا کہ مردوں اور عورتوں کی طبعی ساخت (Biological Constitution) میں فرق ہوتا۔ ان دونوں میں یہ فرق بدیہی ہے۔

مرد اور عورت میں نفسیاتی فرق

پھر چونکہ انسان کی طبعی ساخت کا اثر انسان کی نفسیات (sychology) پر بھی پڑتا ہے، اس لیے مردوں اور عورتوں میں اس حد تک نفسیاتی اثر بھی ضروری تھا، اسی نفسیاتی فرق کا ایک نتیجہ تو بالکل واضح ہے کہ مرد اکتساب رزق کے بعد مطمئن ہو جاتا ہے کہ وہ اولاد کی پرورش سے متعلق اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گیا ہے لیکن عورت اولاد کی پرورش کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے اور اس پر مطمئن نہیں ہوتی، اس کا جی چاہتا ہے کہ اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بچے کے اندر انڈیل دے یا اگر اس کا بس ہو تو اپنا سینہ چیر کر بچے کو دل کے اندر سمو لے۔ وہ بچے کو چھاتی سے لگا کر جس زور سے بھینچتی ہے وہ لاشعوری طور پر اسی جذبہ کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ دنیا کی ہر عورت بچے کو بائیں طرف گود میں اٹھاتی ہے۔ یہ بھلا کیوں؟ وہ اسے اپنے دل کے ساتھ چپکائے رکھنا چاہتی ہے جو بائیں طرف ہوتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کی اس طبعی ساخت اور نفسیاتی اختلاف کے اثرات یا نتائج کیا ہوتے ہیں، اس کے متعلق مغرب کے علمائے نفسیات بہت کچھ تحقیق کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ہارڈنگ (M.Esther Harddins) نے ایک دلچسپ کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (The Way of All Women) جہاں تک اس نکتہ کا تعلق ہے جو اس وقت ہمارے زیر نظر ہے۔ وہ اس میں لکھتا ہے کہ اگر مردوں کو انسان کے باہمی تعلقات (Human Relation Ship) کے مسائل سے متعلق کام پر لگایا جائے تو یہ کام ان کے لیے کبھی خوش آئند نہیں ہوتا لیکن

عورتیں ایسے کام بہت پسند کرتی ہیں۔

عورتوں کے لیے مشکل مقام وہ ہوتا ہے جہاں ان سے کہا جائے کہ وہ کسی مسئلہ کی جزئیات کو پوری پوری صحت کے ساتھ (Accurately) بیان (Define) کریں۔[1]

یہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کے متعلق تو شاید ابھی حتمی طور پر کچھ نہ کہا جا سکے لیکن ڈاکٹر ہارڈنگ کا بیان ہے کہ یہ وہ خصوصیت ہے جسے اس نے متعدد عملی مثالوں کے بعد عام طور پر عورتوں میں مشترک پایا ہے۔

اگر یہ تحقیق صحیح ہے تو آپ دیکھیے کہ قرآن نے اس کی کس قدر رعایت رکھی ہے۔ مقدمات میں ہمیشہ جزئیات پر بحث وتنقید اور جرح وتنقیح ہوتی ہے مقدمہ کی جزئیات کو پوری پوری صحت کے ساتھ بیان (Accurately Define) نہ کرنے ہی سے شہادت خراب ہوتی ہے اور شہادت کی توثیق کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس قسم کے باریک اختلافات کی صحت ہو جائے۔ عورتوں میں ایک تو وہ نفسیاتی کمی ہوگی جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان فرائض کی سرانجام دہی میں مصروفیت کے باعث جو عورتوں سے مخصوص ہیں ان کے لیے مردوں کے مقابلے میں معاملات میں حصہ لینے کے مواقع بھی کم ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ متنازعہ فیہ معاملات (مقدمات وغیرہ) میں جہاں بال کی کھال اتاری جائے گی، عورت بالعموم جزئیات کی صراحت میں غیر واضح رہ جائے گی۔ اسی چیز کو قرآن نے دوسرے مقام پر ایک اور انداز سے بیان کیا ہے۔ سورۂ زخرف میں بات یوں چلی آتی ہے کہ عرب کے مشرکین یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ خدا کی بیٹیاں ہوتی ہیں۔ (وہ اپنی دیویوں کو اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا کرتے تھے۔) اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ (علاوہ اس کے کہ یہ عقیدہ کس قدر باطل ہے کہ خدا اولاد بھی رکھتا

---

1 ص:31۔

ہے) ان کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اولاد میں سے بھی بیٹوں کو تو یہ اپنے لیے مخصوص کرتے ہیں اور خدا کے لیے بیٹیاں مقرر کرتے ہیں جن کی ان کے اپنے دل میں اتنی وقعت ہے کہ اگر کسی کو بیٹی کی پیدائش کی ''خوش خبری'' دی جائے تو اس کے چہرے کی رنگت سیاہ پڑ جاتی ہے۔اس کے بعد ہے کہ یہ اسے خدا کی اولاد قرار دیتے ہیں۔

﴿اَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ○﴾

''جو زیورات میں پرورش پاتی ہے اور جھگڑے کے وقت اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی میں غیر مبین (غیر واضح) رہتی ہے۔''[1]

متنازعہ فیہ امور مقدمات وغیرہ میں ''غیر مبین'' رہنا وہی چیز ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے اور جسے سورۂ بقرہ میں ﴿تَضِلَّ﴾ (ذہنی گھبراہٹ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔''[2]

الفاظ اور تعبیرات کا کچھ فرق ضرور ہے لیکن ذرا غور فرمایئے کہ مولانا عثمانی اور جناب پرویز نے جو کچھ عورت کی نفسیات، اس کی طبعی ساخت کے بارے میں کہا ہے اور عدالتی شہادت اور بیرونی معاملات میں مرد کے مقابلے میں اس کی کمزوری کا اعتراف کیا ہے۔کیا فقہائے اسلام کے اس موقف سے مختلف ہے یا عین اس کے موافق جس کی توضیح پچھلے صفحات میں کی گئی ہے۔

جب لین دین اور ادھار کے معاملات میں (بقول مولانا عثمانی صاحب) عورت کی شہادت مرد کی شہادت کے نصف ہے اور پرویز صاحب کے بقول عورت متنازعہ امور مقدمات وغیرہ میں غیر مبین یا گھبراہٹ کا شکار ہو جانے والی ہے تو پھر حدود وقصاص کے معاملات میں اس بنیاد پر اگر عدالتی شہادت سے عورت کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے تو اس میں آخر عورت کی توہین کیوں؟ اور علماء، حدیث کے حوالے سے عورت کے نقصان عقل کا اعتراف

---

1 الزخرف 43:18 ۔ 2 طاہرہ کے نام خطوط،ص:63-66.

کریں تو توہین لیکن یہی بات پرویز صاحب ڈاکٹر ہارڈنگ کے حوالے سے تسلیم کریں تو ایک حقیقت واقعہ اور سر آنکھوں پر۔ کیا خوب ہے ۔

تمھاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو مرے نامۂ سیاہ میں ہے
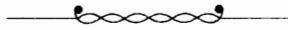
عورت اور قتل خطا کی دیت

قتل خطا کی دیت میں بھی مرد اور عورت کے درمیان فرق ہے لیکن اس پر بحث کرنے سے قبل قتل خطا سے متعلقہ ضروری مسائل ملاحظہ فرمالیں۔ اس کے بعد اصل مسئلے پر گفتگو ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝﴾

''کسی مومن کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے مگر غلطی سے اور جو قتل کرے کسی مومن کو غلطی سے وہ آزاد کرے ایک مسلمان کی گردن اور دیت (خون بہا) ادا کرے اس کے گھر والوں کو مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں، پھر اگر (مقتول) ایسی قوم میں سے ہو کہ وہ تمھارے دشمن ہوں (کافر ہوں) لیکن مقتول خود مسلمان ہو تو (صرف) ایک مومن گردن آزاد کرنا ہے اور اگر وہ ایسی قوم میں سے ہو کہ تمھارے اور ان کے درمیان عہد ہو تو دیت ادا کرنا ہے اس کے گھر والوں کو اور

آزاد کرنا ہے ایک مسلمان گردن کو اور جس کو (غلام) میسر نہ ہو تو وہ متواتر (بلا ناغہ) دو مہینے کے روزے رکھے۔ اللہ سے اپنے گناہ بخشوانے کے لیے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا، حکمت والا ہے۔''[1]

اس آیت میں قتل خطا کے بارے میں دو باتوں کا حکم دیا گیا ہے۔

① ایک مسلمان غلام (مرد یا عورت) آزاد کرنا۔ اس کی طاقت نہ ہو تو دو مہینے کے متواتر روزے رکھنا۔

② مقتول کے وارثوں کو دیت (خون بہا) ادا کرنا۔ دیت مقتول کے وارث اگر معاف کر دیں تو معاف ہو سکتی ہے لیکن پہلی سزا جو ہے وہ معاف نہیں ہو سکتی۔ اس کی پہلی شکل پر تو عمل اب ممکن نہیں (فی الحال) کہ غلامی کا رواج ختم ہو گیا ہے، البتہ دوسری شکل دو مہینے کے روزے رکھنا باقی ہے۔

بعض لوگ ﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ﴾ ''پس جو نہ پائے'' سے یہ مراد لے رہے ہیں کہ قتل خطا کے مرتکب کے پاس اگر دیت کی ادائیگی کے لیے رقم نہیں ہے تو وہ صرف دو مہینے کے روزے رکھ لے۔ اس صورت میں ان کے نزدیک قاتل دیت کی ادائیگی کا مکلّف ہی نہیں ہے لیکن یہ مفہوم و مراد غلط ہے۔ ﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ﴾ کا تعلق صرف غلام کے آزاد کرنے سے ہے اور اس کی متبادل سزا دو مہینے کے روزے ہیں نہ کہ یہ روزے دیت کے متبادل ہیں۔

علاوہ ازیں آیت مبارکہ میں مقتول کی تین حیثیتیں بیان کی گئی ہیں کہ جس مسلمان کو قتل کیا گیا، اس کے وارث مسلمان ہوں گے یا کافر۔ اگر کافر ہیں تو وہ معاہَد (ذمی) ہے یا غیر معاہَد (حربی)

---

1 النسآء 92:4 .

① وارث مسلمان ہوں تب بھی غلام آزاد کرنے کے ساتھ دیت کی ادائیگی ضروری ہے۔

② وارث ایسے کافر ہوں جن سے مسلمانوں کی مصالحت ہے اور ان سے معاہدہ ہے تب بھی دیت کی ادائیگی ضروری ہے۔

③ وارث ایسے کافر ہوں کہ جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہیں ہے اور یہ مقتول مسلمان انھی حربی کافروں میں رہائش پذیر ہو تو اس صورت میں صرف غلام آزاد کرنا ضروری ہے۔ دیت کی ادائیگی نہیں کی جائے گی۔

اس کی کئی وجہیں علماء نے بیان کی ہیں:

- ایک یہ کہ اس کے وارث سب کافر ہیں اور کافر مسلمان کے وارث نہیں ہو سکتے۔
- دوسرے یہ کہ مسلمانوں سے برسرِ پیکار کافروں کو رقم دینا ان کی تقویت کا باعث ہوگا۔
- تیسرے مقتول مسلمان کی بھی یہ غلطی تھی کہ مسلمان ہو جانے کے باوجود اس نے دارالحرب سے ہجرت نہیں کی جبکہ ایسے مسلمانوں کو ہجرت کا عام حکم دے دیا گیا تھا۔

قرآن کریم نے ایک اور مقام پر ایسے مسلمانوں کو بایں الفاظ تنبیہ وتہدید کی۔

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا﴾

''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت نہیں کی، تم کو ان کی رفاقت سے کچھ کام نہیں جب تک ہجرت نہ کریں۔''[1]

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہو جانے کے باجود جو مسلمان ہجرت نہ کرے اور دارالحرب ہی میں مسلمانوں کے دشمنوں کے درمیان رہے تو اللہ تعالیٰ کو یہ رویہ پسند نہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس صورت میں اس کے قتل خطا کو وہ اہمیت نہیں دی

1 الأنفال 72:8.

جو دوسرے مقتول مسلمانوں کو دی۔ احادیث میں بھی بعض واقعات ملتے ہیں جن سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ دارالحرب میں مقیم مسلمانوں کو غلطی سے قتل کر دیے جانے کی صورت میں دیت نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے واقعات میں قصاص کا حکم دیا نہ دیت کا۔[1]

ایک ضروری وضاحت

بعض قدیم و جدید مفسرین نے مذکورہ ہماری بیان کردہ دوسری صورت کے مقتول کو کافر قرار دیا ہے اور یوں وہ کافر اور مسلمان کی دیت میں (قتل خطا میں) برابری تسلیم کرتے ہیں لیکن ہمارے خیال میں یہ رائے صحیح نہیں۔ قرآن کے سیاق سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ تینوں صورتیں مسلمان مقتول کی بیان کی جا رہی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر مذکورہ صورت میں مقتول کافر مراد ہوتا، پھر تو مسلمان اور کافر کی دیت میں مساوات کے لیے یہ نص قطعی ہوتی اور اس میں فقہاء و ائمہ کے درمیان اختلاف ہی نہ ہوتا جبکہ واقعہ یہ ہے کہ کافر کی دیت میں اختلاف ہے اور اس کی بابت تین آراء ہیں۔

① مسلمان اور کافر کی دیت برابر ہے۔

② کافر کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہے۔

③ کافر کی دیت مسلمان کی دیت سے تہائی (1/3) ہے۔

بہر حال زیادہ صحیح اور راجح بات یہی ہے کہ آیت مذکورہ میں قتل خطا کی جو تین صورتیں بیان ہوئی ہیں وہ تینوں مسلمان مقتول کی ہیں۔[2]

اور یہ آیت چونکہ اس موقعے پر نازل ہوئی تھی جبکہ مسلمانوں کو ہجرت کا عام حکم مل چکا

---

1 تفسير القرطبي: 324/5. 2 تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، أحكام القرآن لابن العربي: 477-478/1.

تھا۔ علاوہ ازیں مرحلہ بہ مرحلہ کفر و اسلام کے درمیان معرکے جاری تھے اور ان معرکوں میں بعض واقعات ایسے بھی پیش آئے کہ مسلمان کافروں سے لڑنے کے لیے گئے تو وہاں مقیم بعض مسلمان بھی کفار کے دھوکے میں غلطی سے مارے گئے، چنانچہ آیت زیر بحث میں ان تمام صورتوں کو بیان کر دیا گیا جو اس وقت پیش آ رہی تھیں۔ یہ صورتیں اب بھی بعض ان علاقوں میں پیش آ سکتی ہیں جہاں ابتدائے اسلام کے سے حالات ہوں۔

قتل کی قسمیں

قتل کی دو صورتیں ہیں، عمدًا (جان بوجھ کر) اور خَطَأً (غلطی سے)، قتل عمد میں قصاص (جان کے بدلے جان) ہے۔ اِلا یہ کہ اولیائے مقتول دیت لے کر یا بغیر دیت لیے قاتل کو معاف کر دیں اور قتل خطا میں قصاص نہیں ہے صرف دیت ہے۔ قتل خطا کا مطلب ہے کہ ایک شخص نے ہرن یا کسی اور پرندے کا شکار کرنا چاہا لیکن گولی پرندے یا جانور کی بجائے کسی انسان کو لگ گئی اور وہ مر گیا یا کسی کو حربی کافر سمجھ کر گولی ماری اور وہ مر گیا۔ درآں حالیکہ وہ مسلمان تھا۔

ایک تیسری صورت قتل شبہ عمد کی بھی ہے لیکن بعض ائمہ کے نزدیک یہ بھی قتل خطا ہی ہے، اس لیے وہ صرف دو ہی صورتیں مانتے ہیں۔

قتل خطا کی دیت بھی قتل عمد کی دیت کی طرح سو اونٹ ہیں جو پانچ قسم کے ہوں گے یا پھر بارہ ہزار درہم (چاندی) کی قیمت۔ اب اونٹ کی تعداد تو اتنی گھٹ گئی ہے کہ اس کے دینے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا اب صرف چاندی کی وہ قیمت ہی ہے جو اس کے متبادل بعض احادیث میں بتلائی گئی ہے اور جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اونٹ کے مہنگے ہونے کی وجہ سے بڑھا کر 12 ہزار درہم کر دی تھی۔[1]

---

1. سنن أبي داود، الديات، باب الدية كم هي، حديث: 4542.

جو آرڈی ننس پاکستان میں ضیاء الحق کے دور میں نافذ کیا گیا ہے اس میں دیت کی قیمت غالباً 10 ہزار درہم کے حساب سے دی گئی ہے، حالانکہ زیادہ صحیح 12 ہزار درہم کے مساوی چاندی کی قیمت کے برابر دیت ہے بلکہ اس میں اونٹوں کی قیمت کے اعتبار سے مزید اضافے کی شرعاً گنجائش معلوم ہوتی ہے کیونکہ اصل دیت سو اونٹ ہیں۔ علمائے اہل حدیث کو اس پر مزید غور و فکر کرنا چاہیے۔

مذکورہ آرڈی ننس کی رو سے دیت کی رقم ایک لاکھ ستر ہزار چھ سو دس روپے ہیں جو تیس ہزار چھ سو تیس گرام چاندی کی مالیت ہے، حالانکہ اونٹوں کی قیمت کی لحاظ سے یہ رقم تقریباً دگنی ہونی چاہیے۔

قتل خطا میں چونکہ قاتل کی نیت قتل کرنے کی نہیں ہوتی، اس لیے شریعت نے اس کے ساتھ خاص رعایت برتی ہے اور کہا ہے کہ کفارہ تو وہ خود ادا کرے (غلام آزاد کرنا یا دو مہینے کے متواتر روزے رکھنا) اور دیت کی ادائیگی میں عاقلہ، اس کی مدد کرے۔

«قَضٰی رَسُولُ اللهِ ﷺ بِالدِّيَةِ عَلَى الْعَاقِلَةِ»[1]

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ دو عورتیں لڑ پڑیں۔ ایک نے دوسری عورت کو پتھر مارا جس سے وہ مر گئی، نیز اس کے پیٹ کا بچہ بھی مر گیا۔ (یہ بھی چونکہ قتل خطا تھا، اس لیے) رسول اللہ ﷺ نے اس مقتول عورت کی دیت کا ذمہ دار اس کی عاقلہ (برادری) کو قرار دیا۔[2]

''عاقلہ'' کا مطلب

''عاقلہ'' عقل سے ہے جس کے لغوی معنی ''روکنے'' کے ہیں۔ دیت مزید خونریزی

1 سنن ابن ماجه، الديات، باب الدية على العاقلة فإن لم يكن......، حديث: 2633.

2 صحيح البخاري، الديات، باب جنين المرأة......، حديث: 2910، وصحيح مسلم، القسامة، باب دية الجنين...... حديث: 1681.

سے روکتی ہے، اس لیے دیت کو بھی ''عقل'' کہتے ہیں اور ''عقل'' (دیت) کی ادائیگی کرنے والے قبیلے کو ''عاقلہ'' کہا جاتا ہے۔ ''عقل'' کو بھی اس لیے ''عقل'' کہا جاتا ہے کہ عقل انسان کو برے کاموں سے روکتی ہے۔ اونٹ کو جس رسی سے باندھا جاتا ہے اس کو بھی ''عقال'' کہا جاتا ہے کیونکہ رسی بھی اونٹ کو باندھے اور روکے رکھتی ہے۔

بہر حال ''عاقلہ'' کا اصل مفہوم وہ قبیلہ ہے جو قاتل کی طرف سے بطور تعاون دیت کی ادائیگی کا ذمہ دار ہے۔ جتنی ادائیگی قاتل کر سکتا ہو وہ کرے باقی ادائیگی اس کے اہل قبیلہ مل کر کریں۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہی طریقہ رائج رہا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں دفتری نظام قائم کیا اور الگ الگ محکمے قائم کیے۔ ایک محکمہ میں کام کرنے والوں کے نام ایک رجسٹر میں درج ہوتے جس کو دیوان کہا جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے ساتھ یہ تبدیلی بھی کی کہ عاقلہ اہل قبیلہ کی بجائے اہل دیوان کو قرار دے دیا۔[1]

یوں نسبی تعلق کی بجائے ایک دیوان سے تعلق باہمی تعاون و تناصر کی بنیاد بن گیا اور ایک دیوان سے تعلق رکھنے والے آپس میں ایک دوسرے کے عاقلہ قرار پائے۔

عاقلہ کی جدید تعبیر

آج کل بھی خاندانی و نسبی تعلقات شکست و ریخت کا شکار ہو چکے ہیں، اس لیے ایک پیشے سے تعلق رکھنے والے اپنی اپنی یونینیں اور فیڈریشنیں اس انداز سے بنا سکتے ہیں کہ وہ بوقت ضرورت ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ بالخصوص ڈرائیوروں کے لیے یہ تنظیمیں عاقلہ کا کردار ادا کر سکتی ہیں کیونکہ یہی طبقہ عام طور پر غریب ہے اور ان کے اہل خاندان اور برادری کے افراد بھی بالعموم غریب ہی ہیں۔ اس پس منظر میں عاقلہ کے مفہوم میں جو

1 فقه السنة : 471,470/2 .

وسعت اسلامی نظریاتی کونسل نے پیدا کی ہے۔ اس کی شرعاً گنجائش معلوم ہوتی ہے۔
اسلامی نظریاتی کونسل کے مسودے کے اصل الفاظ حسب ذیل ہیں:

''29 عاقلہ: اس آرڈی ننس میں عاقلہ سے مراد کسی گروہ، افراد کی جماعت، انجمن، ادارہ، تنظیم، کمیٹی، کارپوریشن، اسٹیبلشمنٹ، محکمے، ٹریڈ یونین، منظّم قبیلے یا برادری کے تمام مرد بالغ اور عاقل ارکان ہیں۔ جن سے مجرم یا سزا یافتہ شخص مدد اور حمایت حاصل کرتا ہو یا حاصل کرنے کی امید رکھتا ہو۔

تشریح: عاقلہ کا تعین، عدالت ہر مقدمے کے حقائق اور حالات کا لحاظ رکھتے ہوئے کرے گی۔ اور اس سے پہلے سزا کے بیان میں درج ہے۔

''24۔ جلد باز یا لاپروائی سے گاڑی چلا کر ارتکاب قتل خطا کی سزا۔

جو کوئی جلد بازی یا لاپروائی سے گاڑی چلا کر قتل خطا کا مرتکب ہوگا، اسے قید محض یا قید بامشقت جس کی میعاد دس سال تک ہوسکتی ہے یا جرمانے کی سزا دی جائے گی یا دونوں سزائیں دی جائیں گی اور وہ دیت کا مستوجب بھی ہوگا جو اس کی عاقلہ ادا کرے گی۔''

اس کے برعکس موجودہ آرڈی ننس میں قتل خطا کی سزا کے ضمن میں صرف اتنا کہا گیا ہے۔ ''جو کوئی قتل خطا کا ارتکاب کرے، دیت کا مستوجب ہوگا۔''

اور ڈرائیوروں کے لیے بالخصوص یہ کہا گیا ہے: ''جو کوئی تیز یا غفلت سے گاڑی چلانے کے باعث قتل خطا کا مرتکب ہوا، اسے مقدمہ کے حقائق اور حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے دیت کے علاوہ کسی بھی قسم کی سزائے قید اتنی مدت کے لیے دی جائے گی جو دس سال تک ہوسکتی ہے۔''

جن اہل ثروت نے پرائیویٹ گاڑیاں اور کاریں وغیرہ رکھی ہوئی ہیں، ان کے اور ان کے خاندان کی طرف سے قتل خطا کی صورت میں دیت کی ادائیگی کوئی مشکل مسئلہ نہیں

ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک کی طرح عاقلہ کے اصل مفہوم پر عمل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، اس لیے ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ اس کے مطابق عمل کریں۔ بصورت دیگر وہ بھی مذکورہ انداز کی تنظیم قائم کر سکتے ہیں جو بوقت ضرورت ان کے لیے عاقلہ کا کام انجام دے۔

اسی طرح جس قاتل کا کوئی عاقلہ نہ ہو، نہ خاندان نہ کوئی یونین و تنظیم وغیرہ، اس کی عاقلہ حکومت ہوگی اور حکومت کی طرف سے مقتول کے ورثاء کو دیت کی ادائیگی کا اہتمام کرنا چاہیے۔ غرض مقتول کے خاندان کی دادرسی کا اہتمام بہرصورت ہونا چاہیے، اس میں تغافل وتساہل قطعاً نہیں ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں بعض صورتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں کہ حادثے میں ڈرائیور کا قطعاً کوئی قصور ہی نہ ہو اور اسے قتل خطا کا مجرم قرار دینا بھی مشکل ہو تو ایسی صورت میں بھی مقتول یا مقتولین کی دیت حکومت ہی کو ادا کرنی چاہیے۔

دیت کی ادائیگی، انشورنس کمپنیوں کی ذمہ داری نہیں

بعض اخباری بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت شاید دیت کی ادائیگی کا انشورنس کمپنیوں کو ذمہ دار بنانا چاہتی ہے۔ لیکن یہ سوچ صحیح نہیں۔

① انشورنس کا سارا نظام سود پر مبنی ہے، اس لیے سودی کمپنیوں کے اسے سپرد کر دینا بالکل غلط ہوگا اور یہ مخمل میں ٹاٹ کی پیوند کاری کے مترادف ہے۔

② اس طرح عاقلہ کا تصور بھی ختم ہو جائے گا۔ عاقلہ کے قدیم مفہوم کی رو سے تو قاتل سمیت پورا خاندان ذمہ دار ہے اور اس میں حکمت یہی ہے کہ پورا خاندان اور قبیلہ مجرم کو جرائم سے باز رکھنے کی کوشش کرے تاکہ وہ ناگہانی آفت کی زد سے محفوظ رہے اور عاقلہ کے جدید مفہوم (یونین وغیرہ) کی رو سے بھی قاتل خود بھی اس تنظیم کا ممبر ہے جو اس کی عاقلہ ہے اور اس لحاظ سے وہ بھی اس بوجھ میں شریک ہوگا جو اس کی پوری یونین پر (بطور

عاقلہ) پڑے گا۔ یوں عاقلہ کے قدیم اور جدید دونوں مفہوموں میں ڈرائیور کو عاقلہ سے خارج نہیں کیا گیا بلکہ وہ اس میں شامل رہتا ہے اور شامل رہنا چاہیے۔ جبکہ انشورنس کی صورت میں شاید ڈرائیور ہر طرح سے ہر قسم کے بوجھ سے فارغ ہوگا اور پریمیم کی ادائیگی بس مالکان کے ذمے ہوگی اور جب ڈرائیور کسی لحاظ سے بھی اس بوجھ میں شریک نہیں ہو گا تو وہ تیز رفتاری اور اوورٹیکنگ (Over Taking) سے کب باز آئے گا جو حادثات کا سب سے زیادہ باعث ہے۔

دیت کی ادائیگی فی الفور کی جائے

فقہاء نے قتل خطا میں دیت کی ادائیگی کے لیے تین سال کی مہلت دی ہے بلکہ فقہائے احناف نے تو قتل عمد تک میں بھی دیت پر مصالحت ہو جانے کی صورت میں تین سال کی مہلت دی ہے، تاہم رسول اللہ ﷺ کے عمل سے اس مہلت کی تائید نہیں ملتی۔ نبی ﷺ نے فوراً ادائیگی کا اہتمام کرایا ہے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ دیت کی ادائیگی میں بلاوجہ تاخیر نہ کی جائے اور اس کی فوری ادائیگی ہونی چاہیے۔ بعض استثنائی صورتوں میں اس کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے لیکن عام اصول فوری ادائیگی ہی کا ہونا چاہیے۔

عورت کی دیت کا مسئلہ

اب ہم اصل مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ دیت کے احکام و مسائل میں عورت کی دیت کا مسئلہ، جو شرعی دلائل کی رو سے قتل خطا میں مرد کی دیت سے نصف ہے، اس پر بھی شکوک وشبہات پیدا کیے جاتے ہیں، اس لیے ان کے ازالے کے لیے قدرے تفصیل ضروری ہے۔ چند سال قبل ایک محترم بزرگ نے بھی اس پر خامہ فرسائی کی تھی اور عورت کی نصف دیت پر اپنے شبہات کا اظہار فرمایا تھا۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کا جائزہ لیں، اس

ضمن میں نصف دیت کے دلائل اور اس کی حکمت و مصلحت کا بیان از خود آ جائے گا۔

محولہ مضمون 13 اکتوبر 1984ء کے ''نوائے وقت'' لاہور میں شائع ہوا تھا۔ تاہم قبل اس کے کہ مرحوم کے بیان پر کچھ عرض کیا جائے مسئلے کی نوعیت بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مسئلے کی نوعیت

مختصراً مسئلے کی نوعیت یہ ہے کہ بطور غلطی اگر کوئی عورت قتل ہو جائے تو اس کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہو گی۔ قتل عمد کا حکم اس سے مختلف ہے اور اس میں مرد و عورت کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے، یعنی صرف ایک صورت (قتل خطا) میں عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہو گی۔

شرعی دلائل

قتل خطا کی دیت میں مرد و عورت کے درمیان یہ تفریق کیوں ہے؟ اس کی وجہ حسب ذیل ہے:

① اس سلسلے میں سب سے بڑی دلیل تو سنن نسائی کی وہ حدیث ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ثلث تک مرد و عورت کی دیت برابر ہے اور اس کے بعد عورت کی دیت نصف ہے۔ سنداً یہ روایت اکثر محدثین کے نزدیک بالکل صحیح ہے۔[1]

شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، تاہم دوسرے آثار صحابہ کی وجہ سے، جو صحیح سند سے ثابت ہیں، عورت کی نصف دیت کا اثبات کیا ہے۔[2]

② سنن کبریٰ بیہقی کی دوسری روایت ہے جس میں آتا ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہے۔[3]

---

1 سنن النسائي' القسامة ' باب عقل المرأة، حديث: 4809 . 2 ملاحظہ ہو إرواء الغليل: 307/7 . 3 السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب الديات، باب دية المرأة: 95/8 .

یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن بطور شاہد پیش کی جا سکتی ہے۔

③ تیسرے، آثارِ صحابہ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے فیصلے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

④ چوتھے، اس مسئلے پر امت مسلمہ کے علماء وفقہاء کا اجماع چلا آ رہا ہے اور اجماع امت بھی دین میں حجت ہے۔ صرف دو افراد (ابوبکر الاصم اور ابن علیہ) کا اختلاف منقول ہے جسے فقہاء نے شاذ قرار دیا ہے۔[1]

یہ دو شخص کون ہیں۔ ایک ابوبکر الاصم معتزلی شیخ ہے اور اس کا نام عبدالرحمٰن بن کیسان ہے اور یہ ایک عجیب وغریب تفسیر کا مصنف ہے۔[2]

دوسرا ابن علیہ ہے۔ اس نام سے دو شخص معروف ہیں۔ اسماعیل بن علیہ اور ابراہیم بن علیہ۔ بالترتیب یہ دونوں باپ بیٹے ہیں، تاہم باپ (اول الذکر) کا شمار محدثین میں ہوتا ہے، البتہ ان کے بیٹے ابراہیم بن علیہ کا اصحابِ تراجم نے اچھے انداز میں ذکر نہیں کیا ہے۔ علاوہ ازیں اسے ابوبکر الاصم کے غلمان (غلام اور شاگرد) میں سے قرار دیا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں یہاں تک کہا ہے کہ [ضَالٌّ يُضِلُّ النَّاسَ] ''خود بھی گمراہ اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والا ہے۔''[3]

ایسے دو شخصوں کی رائے سے جن کی امت میں کوئی علمی اہمیت نہیں۔ اجماع کا دعویٰ کیوں کر مجروح ہو سکتا ہے؟

نصف دیت کی حکمت ومصلحت

جہاں تک انسانی شرف وتکریم کا معاملہ ہے۔ اسلام میں مرد وعورت کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے۔ اسلام ہی وہ پہلا مذہب ہے جس نے انسانی معاشرے میں عورت

1 ملاحظہ ہو: المغني لابن قدامة: 9/532. 2 سیر أعلام النبلاء: 9/402، ولسان الميزان: 3/427. 3 ملاحظہ ہو: تاريخ بغداد: 6/20-22.

کی عزت اور اس کے مقام و منصب کا تحفظ اور اس کی قدر و منزلت کا اعتراف کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ واقعہ بھی ہے کہ اسلام اس مساوات مرد و زن کا قائل نہیں ہے جو اس وقت مغرب میں عام ہے، اسی لیے تکریم نسوانیت کا مفہوم دونوں جگہ یکساں نہیں ہے۔ مغرب کے نزدیک جو چیز بھی عین تکریمِ نسوانیت ہے اسلام کے نزدیک وہ عین تذلیل نسوانیت ہے۔ اسی طرح اسلام میں تکریم نسوانیت کے لیے جو حدود و ضوابط تجویز کیے گئے ہیں، ہوسکتا ہے وہ مغرب کے نزدیک استخفاف نسوانیت کا باعث ہوں۔

اسلام میں عورت کے لیے پردہ انتہائی ضروری ہے۔ مرد و زن کے بے محابا اختلاط کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ مغربی ذہن اسلام کی اس ہدایت پر ناک بھوں چڑھاتا ہے اور اسے (نعوذ باللہ) عورت کی تذلیل قرار دیتا ہے لیکن اسلام کی نظر میں یہ عورت کی تذلیل نہیں، اس کی عین عزت ہے اور بے پردگی میں جسے مغربی ذہن عورت کی عزت قرار دیتا ہے، عورت کی تذلیل و تحقیر ہے۔

اسی طرح اسلام نے مرد و عورت کی مختلف فطری صلاحیتوں کی بنا پر دونوں کا دائرۂ کار بھی مختلف رکھا ہے۔ مرد کو معاشی ذمّے داریوں کا کفیل بنایا ہے اور عورت کو اس معاشی کفالت سے آزاد رکھا ہے۔ یہ صرف مرد کی ذمے داری ہے کہ وہ گھر سے باہر محنت مزدوری کرے، کارخانوں اور دفتروں میں ملازمت کرے اور معاشی تگ و دو میں حصہ لے اور عورت گھر کی چار دیواری کے اندر امور خانہ داری کے فرائض انجام دے۔ یہ الگ الگ دائرۂ کار ان فطری صلاحیتوں کے مطابق ہے جن کی وجہ سے مرد و عورت کی تخلیق ہوئی ہے اور اسی میں ان کی عزت و تکریم ہے۔

اسی بنیاد پر میراث میں عورت کا حصہ مرد کے مقابلے میں نصف ہے کیونکہ معاشی کفالت کے لیے مرد کو مال و دولت کی جتنی ضرورت ہے عورت کو نہیں۔ اسلام کا یہ اصول

قیامت تک کے لیے ہے۔ اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اب چاہے معاملہ کتنا ہی برعکس ہو جائے اور عورتیں مردوں کے دوش بدوش دوڑ میں، خواہ کتنی ہی سرگرمی سے حصہ لیں اور کارخانے اور دفاتر چاہے عورتوں کے دم قدم سے کتنے ہی پر رونق ہو جائیں لیکن میراث میں عورت کا حصہ پھر بھی مرد کے حصے سے نصف ہی رہے گا کیونکہ معاشی سرگرمیوں میں عورتوں کی شرکت ہی اصولی طور پر سرے سے غلط ہے اور اسلام کے خلاف ہے (بعض انفرادی صورتوں میں بطور مجبوری عورتوں کی ملازمت الگ بات ہے جس کی گنجائش محدود دائرے میں موجود ہے۔)

عورت کی نصف دیت میں بھی وہی علت ہے جو میراث کے نصف حصے میں ہے، یعنی چونکہ مرد کے قتل کیے جانے کی صورت میں ایک پورا خاندان اپنے کفیل سے محروم ہو جاتا ہے، اس لیے خاندان کی کفالت کے نقطۂ نظر سے اس کی پوری دیت ضروری ہے جبکہ عورت کے قتل کیے جانے کی صورت میں ایسی مالی مشکل پیش نہیں آتی، اس لیے اس کی نصف دیت قطعاً غیر معقول نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں نصف دیت کے پیچھے قطعاً یہ جذبہ کارفرما نہیں ہے کہ نعوذ باللہ عورت حقیر ہے یا وہ نصف انسان ہے، اس لیے اس کی دیت بھی نصف ہے بلکہ اس میں وہی علت یا حکمت و مصلحت مضمر ہے جو میراث میں پائی جاتی ہے جس میں عورت کی تحقیر کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

حامیانِ کامل دیت کے دلائل کا تجزیہ

''نوائے وقت'' کے محولہ مضمون میں ایک دلیل یہ دی گئی ہے جو اور بھی لوگوں کی طرف سے دی جاتی ہے کہ عورت بھی پورا انسان ہے، اس لیے اس کی دیت بھی پوری ہونی چاہیے، نصف نہیں ہو سکتی۔ لیکن مسئلہ پورے انسان یا نصف انسان کا سرے سے ہے ہی نہیں کیونکہ یہ ''جان'' کا بدلہ تو ہے نہیں بلکہ اس معاوضے کا مسئلہ ہے جو عاقلہ

(قاتل کی طرف سے دیت ادا کرنے میں اس کی مددگار برادری) نے ورثاء کو ادا کرنا ہے۔ نصف دیت کے ڈانڈے عورت کی انسانیت سے ملانا ایک تو خلط مبحث ہے۔ دوسرے، تمام جذباتی انداز فکر ہے جس سے مقصود عورتوں کی حمایت حاصل کرنا ہے اور تیسرے، اگر ''پورے انسان'' والی دلیل دیت کے مسئلے میں کوئی معقولیت رکھتی ہے تو اس ''دلیل'' کی رُو سے تو عورت کا حصۂ میراث بھی مرد کے برابر ہی ہونا چاہیے نہ کہ نصف۔ کیا اس ''دلیل'' کو صحیح تسلیم کر لینے کے بعد عورت کی نصف میراث کا کوئی جواز باقی رہ سکتا ہے؟ جبکہ عورت کی نصف میراث قرآن کریم کا بیان کردہ مُسلّمہ اصول اور قانون ہے۔

② دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ عمرو بن حزم کی وساطت سے محدثین تک پہنچنے والی حدیث صحیح نہیں ہے۔ یہ بھی محل نظر ہے، علماء محققین نے اس سند کی تحقیق کر کے اسے صحیح قرار دیا ہے۔[1]

تاہم یہ بات ضرور ہے کہ بعض شافعی اور حنبلی فقہاء نے عمرو بن حزم کی روایت کے حوالے سے جو یہ لکھا ہے کہ ''عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے'' کے الفاظ حدیث کی متداول کتب میں حضرت عمرو بن حزم کی روایت کی کسی سند میں موجود نہیں ہیں لیکن نصف دیت کے قائلین کی بنائے استدلال یہ ٹکڑا نہیں بلکہ سنن نسائی کی وہ صحیح روایت ہے جو مضمون کے آغاز میں نقل کی جا چکی ہے۔ دوسری دلیل سنن کبریٰ بیہقی میں' حضرت معاذ بن جبل سے مروی حدیث ہے۔ تیسرے نمبر پر خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے فیصلے اور آثارِ صحابہ اور چوتھے نمبر پر فقہائے امت کا اجماع ہے، اس لیے عمرو بن حزم کی روایت میں نصف دیت والا ٹکڑا اگر موجودہ کتب حدیث میں نہیں ملتا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

③ تیسری بات یہ فرمائی جاتی ہے کہ حدیث رسول سے قرآن کے عموم میں تخصیص اس

1 ملاحظہ ہو مصری فاضل احمد شاکر کی تحقیق برحاشیہ "المحلی: 1/82، 5/214، 6/36،62 .

وقت جائز ہے جبکہ خاص حکم میں اس عام آیت سے بڑھ کر زیادہ حکمت، زیادہ مصلحت اور زیادہ دانائی پائی جائے۔

جواب: اس سلسلے میں پہلا سوال تو یہ ہے کہ یہ اصول کس نے بیان کیا ہے۔ اور اس کی بنیاد کیا ہے دوسرا سوال یہ ہے کہ خود ساختہ حکمت و مصلحت کی بنیاد پر اگر عموماتِ قرآن میں تخصیص کو جائز تسلیم کر لیا گیا تو اس سے احکام قرآن میں تبدیلی کا لامتناہی سلسلہ شروع نہیں ہو جائے گا؟ اس لیے ہمارے خیال میں عمومِ قرآن کی تخصیص کے لیے جو اصول بیان فرمایا گیا ہے وہ صحیح نہیں۔ عمومِ قرآن کی تخصیص کے لیے شرعی دلائل ضروری ہیں۔ اگر شرعی دلائل سے قرآن کے کسی عموم کی تخصیص، کسی اجمال کی تفصیل اور کسی اطلاق کی تقیید ہوتی ہو تو وہ قابل تسلیم ہے اور وہاں حکمت و مصلحت کی کمی بیشی کا موازنہ تو کجا، سرے سے حکمت و مصلحت ہی سمجھ میں نہ آئے، تب بھی دلائل شرعیہ پر مبنی تخصیص کے انکار کی گنجائش نہیں ہے اور دلائل شرعیہ میں سب سے اہم دلیل شرعی حدیث نبوی ﷺ ہے۔ حدیث نبوی سے بالخصوص جبکہ اس کے ساتھ آثار صحابہ اور اجماع امت بھی ہو، عموم قرآن کی تخصیص بالکل صحیح ہے۔

دراصل عموم قرآن کی تخصیص کا مسئلہ صدیوں سے قدموں کے ڈگمگانے (مزلّۃ الاقدام) کا باعث چلا آ رہا ہے اور ہمیشہ لوگوں نے اسے اپنے ذہنی مفروضات یا فقہی تعصّبات کی روشنی میں دیکھا ہے اور اس سارے اصول کو ہمیشہ نظر انداز کیا ہے جو فکر محدثین پر مبنی ہے۔ جس کی وضاحت ابھی کی گئی ہے۔ کسی نے اپنے فقہی جمود کو برقرار رکھنے کے لیے کہا کہ خبر واحد سے عمومِ قرآن کی تخصیص جائز نہیں لیکن کہیں اپنی ہی فقہی ضرورت پیش آئی تو ضعیف حدیث تک سے قرآنی عموم کی تخصیص کر ڈالی۔ کسی نے اپنے ذہنی مفروضات کے جوش اثبات میں خبر متواتر کو بھی خبر واحد باور کرانا چاہا تا کہ خبر متواتر سے ثابت شدہ

اس تخصیص قرآنی کا انکار کیا جا سکے جو اس کے ذہنی مفروضے کے خلاف ہے۔ جیسا کہ حد رجم کے ضمن میں بعض ''تدبر پسند'' مفسرین نے کیا ہے۔ اسی طرح نصف دیت کی تخصیص سے جان چھڑانے کے لیے اب ایک نیا فلسفہ یہ تراشا گیا ہے کہ پہلے حکمت و مصلحت کی پیمائش کی جائے اور پھر دیکھا جائے کہ حکمت و مصلحت تخصیص میں زیادہ ہے یا تعمیم میں۔ اگر اس اصول کی صداقت تسلیم کر لی گئی تو پھر بات نصف دیت تک ہی محدود نہیں رہے گی بلکہ اس کی زد میں بہت سی نصوص قرآنی بھی آ جائیں گی۔

④ آخر میں مولانائے محترم نے علمائے کرام سے اپیل کی ہے کہ وہ عورتوں کے بارے میں ''حرفیت پسندی'' سے الگ ہو کر عورتوں کے حقوق و فرائض کے مسئلے کو وسیع تر انسانی بنیادوں پر حل کریں۔ ورنہ خطرہ ہے کہ ان کے طرز عمل سے عورتوں کے دلوں میں اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہو جائیں گے۔ مولانا کا یہ بیان غلطی ہائے مضامین کا آئینہ دار ہے۔ اس میں:

اولاً: علمائے کرام کو علم وفہم سے عاری اور حکمت و دانش سے بے بہرہ باور کرایا گیا ہے۔

ثانیاً: عورتوں کے حقوق وفرائض کو حل طلب بتلایا گیا ہے۔

ثالثاً: حرفیت پسندی سے الگ ہو کر سوچنے کی دعوت دے کر نصوص شریعت میں تبدیلی کی گنجائش نکالی گئی ہے۔

رابعاً: عورتوں کے اندر غلط جذبات کی آبیاری کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہمارے خیال میں یہ سب باتیں ان خوش فہم متجددین کے علمی مقام سے فروتر ہیں۔ کاش! وہ ایسی باتیں کرنے سے پہلے سوچ لیتے۔ چند علماء کے علم وفہم کو تو متہم کیا جا سکتا ہے، انھیں حکمت و دانش سے بے بہرہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے لیکن جہاں مسئلہ اجماع امت کا ہو، یعنی اقلیت و اکثریت سے قطع نظر پوری امت کے علماء وفقہاء کا ہو، وہاں یہ

بحث جچتی نہیں۔ یہاں پوری امت کے فقہاء کو بے دانش سمجھنے کی بجائے اگر آج کل کے چند متجددین کی دانش افرنگی ہی کو درخور اعتنا نہ سمجھا جائے تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ نبی ﷺ کی حدیث ہے:

«إِنَّ اللهَ لَا يَجْمَعُ أُمَّتِي عَلٰى ضَلَالَةٍ»

''میری امت کو اللہ تعالیٰ کسی گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔''[1]

عورتوں کے حقوق و فرائض بھی آج سے چودہ سو سال پہلے متعین کر دیے گئے ہیں اور آج بھی جب تک عورت کو ان حقوق و فرائض کا پابند نہیں بنایا جائے گا، اصلاحِ احوال کی کوئی صورت ممکن نہیں، اس لیے مسئلہ عورت کے حقوق و فرائض کا حل کرنا نہیں ہے بلکہ اسے اس کے فرائض کا پابند بنانا اور اس کے مطابق عمل درآمد کرانا ہے۔

③ حرفیت پسندی سے الگ ہو کر سوچنے کی دعوت دینا انتہائی گمراہی کا راستہ ہے۔ ایسے ہی لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ عورت کو نصف میراث کی بجائے مرد کے مساوی حصہ ملنا چاہیے۔ ایسے ''اجتہاد'' کے مقابلے میں وہ ''حرفیت پسندی'' قابل تعریف ہے جس میں نصوص شریعت سے انحراف نہ ہو۔

④ جہاں تک اس اندیشے کا تعلق ہے کہ عورت کی نصف دیت پر اصرار کرنے کی وجہ سے عورتوں کے اندر اسلام کے خلاف شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں گے تو یہ بات بھی غلط ہے کیونکہ چودہ سو سال سے اسلام میں عورت کا حصۂ میراث مرد کے حصۂ میراث سے نصف چلا آ رہا ہے۔ نصف دیت میں تو سرے سے عورت کی کوئی حق تلفی ہی نہیں ہے۔ عورت کے قتل کر دیے جانے کی صورت میں جو دیت ورثاء کو ملے گی، وہ اس کے والدین، بھائی یا خاوند وغیرہ ہی ہوں گے۔ عورت کا اس میں کیا نقصان ہے۔ یا اس کی بے حرمتی کا اس میں

1 جامع الترمذي، الفتن، باب ما جاء في لزوم الجماعة، حديث: 2167.

کیا پہلو ہے۔ اگر عورتوں کے اندر شکوک وشبہات پیدا ہو سکتے ہیں تو مسئلۂ میراث کی وجہ سے ہو سکتے ہیں۔ مسئلہ دیت کی وجہ سے نہیں۔ الحمد للہ! مسلمان عورت کے اندر مسئلۂ میراث کی وجہ سے آج تک اسلام کے خلاف شکوک وشبہات پیدا نہیں ہوئے کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ اس میں جو حکمت و مصلحت ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اب اگر کسی ''انگریزی خواں'' عورت کے اندر ایسے شبہات پیدا ہوتے ہیں تو جو جواب مسئلۂ میراث کے سلسلے میں دیا جائے گا، نصف دیت کے سلسلے میں پیدا ہونے والے شبہے کا جواب بھی وہی ہوگا۔

ایک اشکال کا حل

گزشتہ بحث سے یہ اشکال پیدا ہوسکتا ہے کہ ہم نے نصف دیت کی حکمت و مصلحت یہ بیان کی ہے کہ چونکہ معاشی کفالت مرد کی ذمے داری ہے، عورت کی نہیں، اس لیے عورت کے قتل کیے جانے کی صورت میں خاندان اپنے کفیل سے محروم نہیں ہوتا لیکن آج کل عورتیں بھی مردوں کی طرح معاشی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں، اس لیے نصف دیت والی حکمت میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا، لہٰذا اب عورت کی دیت بھی مرد کی دیت کے برابر ہونی چاہیے۔

اولاً: اس سلسلے میں پہلی گزارش تو یہ ہے کہ عورتوں کا مردوں کے دوش بدوش معاشی تگ و دو میں شریک ہونا صریحًا اسلام کے خلاف ہے۔ اسلام اس کو قطعًا پسند نہیں کرتا، اس لیے اس ایک خلاف اسلام اقدام کی وجہ سے اسلام اپنے ایک مسلمہ اصول میں تبدیلی کیونکر گوارا کرسکتا ہے؟

ثانیًا: عورتوں کی اکثریت ملازمت شوق کے طور پر کرتی ہے۔ وہ اپنی معاشی ذمے داریوں کی وجہ سے ملازمت کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملازمت پیشہ خواتین کی اکثریت اونچی سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے۔ جس کے پاس دولت کی پہلے ہی ریل پیل

ہے اور وسائل زندگی کی فراوانی ہے۔ ان عورتوں کی آمدنیاں خاندان کی کفالت نہیں کرتیں بلکہ ان کی آمدنی کا بیشتر حصہ ان کے نت نئے فیشنوں، بیش قیمت ملبوسات، سامانِ آرائش وزیبائش اور اسی قسم کے اللوں تللوں پر خرچ ہوتا ہے اور یہ ساری چیزیں معاشرے میں فساد اور بگاڑ کا باعث ہیں۔ اسلام اس کی حوصلہ افزائی کیونکر کرسکتا ہے؟

ثالثاً: عورتوں کا ایک حصہ ضرور ایسا ہے کہ فی الواقع وہ معاشی مجبوریوں کی وجہ سے ملازمت کرتا ہے اور وہ عورتیں اپنے خاندان کی کفیل ہیں۔ ایسی عورتوں کے بارے میں قاضی کو یہ اختیار دیا جاسکتا ہے کہ وہ نصف دیت کے علاوہ حالات وضروریات کے مطابق مزید رقم بطور جرمانہ قاتل سے وصول کرکے اس خاندان کی دادرسی کرے جو اپنے کفیل سے محروم ہوگیا ہے لیکن اسلام کا یہ اصول اپنی جگہ ناقابل تغیر ہے کہ چونکہ عورت معاشی ذمہ داریوں سے آزاد ہے، اس لیے میراث اور دیت میں وہ مرد کے مساوی نہیں اور اسلام کا یہ اصول عورت کی تحقیر پر مبنی نہیں بلکہ اس حکمت ومصلحت پر مبنی ہے جس کی وضاحت گزشتہ سطور میں کی گئی ہے۔

علمائے کرام کے بارے میں ایک غلط تأثر

علاوہ ازیں علمائے کرام کو عورتوں سے کوئی کد نہیں ہے کہ ان کے بارے میں یہ تأثر صحیح ہو کہ وہ عورتوں کے معاشرتی رتبے کو گھٹانا چاہتے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش لانا چاہتے ہیں اور کامل مساوات مرد وزن کے قائل ہیں۔ اس کی بابت علمائے کرام پورے اخلاص اور دردمندی سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ راستہ سراسر اسلام کے خلاف ہی نہیں بلکہ عورت کی اس عظمت وشرافت کے بھی منافی ہے جو اسلام کی رو سے اسے حاصل ہے۔ اسلام نے عورت کو گھر کی ملکہ بنایا ہے۔ مغربی ذہن نے اسے معاش کا کل پرزہ بنا دیا ہے۔ اسلام نے عورت کو چراغ خانہ بنایا ہے۔ مغرب نے اسے

شمع محفل بنا دیا ہے۔ اسلام نے عورت کو صرف خاوند کا خدمت گزار بنایا ہے لیکن مغرب نے اسے ''ائر ہوسٹس'' کی صورت میں ''ریسپشن گرل'' کی صورت میں ''ماڈل گرل'' کی صورت میں اور ''ایکٹرس'' کی صورت میں ہر ہوس ران کا خدمت گزار بنا دیا ہے ۔

بہ بیں تفاوتِ راہ از کجا است تابہ کجا

علماء کے نزدیک عورت کی عزت گھر کی ملکہ، چراغ خانہ اور صرف خاوند کی خدمت گزار ہونے کی صورت ہی میں ہے اور عورت معاشی دوڑ میں جس راہ پر چل نکلی ہے وہ قطعاً اس کی عزت کا راستہ نہیں بلکہ اس میں اس کی تحقیر ہی نہیں، اسلام سے ایک گونہ بغاوت بھی ہے۔ علمائے کرام عورتوں کے اس باغیانہ رجحان اور غیر فطری طرز عمل کی حمایت کیونکر کر سکتے ہیں؟
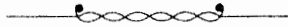
مرد کے مقابلے میں عورت کا نصف حصہ وراثت

حکمت اور تجدد پسندوں کی موشگافیوں کی حقیقت

مسلمان ممالک میں جب تک اسلام کی علمبرداری قائم رہی وہاں کبھی حقوق نسواں کا مسئلہ نہیں اٹھا کیونکہ مسلمان اسلام کی ابدی تعلیمات اوران کی حقانیت پر یقین کامل رکھتے تھے اور مملکت کا نظام اسلامی اصولوں پر استوار تھا جس میں مرد عورت کے الگ الگ دائرۂ کار کا تعین تھا جیسا کہ اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے، چنانچہ اسلامی مملکتوں میں عورتوں کا دائرۂ عمل گھر کی چار دیواری تھا، وہ اس دائرے میں رہ کر امور خانہ داری سرانجام دیتیں، بچوں کی دیکھ بھال اوران کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتیں اور خاوند کی خدمت و اطاعت بجا لاتیں۔ مرد، گھر کی ان ذمے داریوں سے سبکدوش ہوتا اور پوری یکسوئی اور فراغ خاطر کے ساتھ بیرونی سرگرمیوں میں مصروف عمل رہتا۔ کسب معاش، امور جہانبانی، جہاد، سفارت کاری وغیرہ تمام معاملات مرد کے سپرد تھے۔ یوں زندگی کی گاڑی ان دونوں پہیوں سے بحسن وخوبی چل رہی تھی کیونکہ دونوں کا وجود انسانی زندگی کے لیے، لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ دونوں کی مساعی اور تگ و تاز کا انسانیت کے ارتقا میں برابر کا حصہ ہے۔ اس معاملے میں کوئی بھی کسی سے کمتر نہیں ہے۔ نہ انسانی وشہری حقوق میں اور نہ مملکت کے ارتقا وعروج میں، تاہم دونوں کے مابین فطری صلاحیتوں میں جو فرق وتفاوت ہے، وہ ایک مسلّمہ امر ہے، اسی کے پیش نظر تقسیم کار تھی، جس کو دونوں نے قبول

کیا ہوا اور اپنایا ہوا تھا۔ یوں مرد و عورت ایک دوسرے کے حلیف تھے، حریف نہیں ایک دوسرے کے معاون تھے، رقیب نہیں، ایک دوسرے کے ہمدرد و غم گسار تھے، دشمن نہیں۔

یہ تقسیم کار چونکہ فطری اور امر الٰہی کے مطابق تھی، اس لیے اس کی وجہ سے اندرونی طور پر بھی امن و استحکام تھا اور معاشرہ معاشرتی بگاڑ سے بہت حد تک محفوظ بھی۔ علاوہ ازیں بیرونی طور پر بھی مسلمانوں کا رعب اور دبدبہ قائم تھا، دشمن کو مسلمانوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا حوصلہ اور یارانہ تھا گویا اس تقسیم کار، یعنی عورت کا اپنے دائرۂ کار گھر تک محدود رہنے سے ملک کی داخلی پالیسیوں میں کوئی خرابی پیدا ہوئی نہ بین الاقوامی سطح پر کسی کمزوری کا مظاہرہ ہوا جس سے عملی طور پر یہ واضح ہوگیا کہ انسانی معاشروں کے لیے یہی پالیسی مفید ہے جو خود خالق کائنات نے انسانوں کے لیے پسند فرمائی ہے اسی سے ہی امن و استحکام مل سکتا ہے اور قومیں عروج و ترقی سے بھی اسی طرح ہم کنار ہوسکتی ہیں نہ کہ اس سے انحراف کرکے اور اس کے برعکس پالیسی اختیار کرکے۔

چنانچہ دیکھ لیجیے، مغربی ملکوں نے اس فطری پالیسی سے انحراف کرکے عورت کو بھی گھر کی چار دیواری سے نکال کر دفتروں اور منڈیوں میں اور کارخانوں اور فیکٹریوں میں مردوں کے دوش بدوش لا کر کھڑا کر دیا، اس وجہ سے ان کی صنعتی ترقی میں یقیناً کچھ تیزی تو آگئی لیکن دو بڑے نقصانات سے انھیں دوچار ہونا پڑا۔ ایک معاشرہ قلب و نظر کی پاکیزگی سے محروم ہوگیا اور جنسی ہوس اور شہوت رانی عام ہوگئی۔ دوسرا ان کا خاندانی نظام تباہ ہو گیا اور یوں ان کی ساری ترقی و خوش حالی بے معنی ہو کر رہ گئی کیونکہ انسان ساری محنت اور تگ و دو صرف اس لیے کرتا ہے کہ اسے راحت و تسکین حاصل ہو اور یہ راحت اسے اس کی ماں کی آغوش فراہم کرتی ہے یا پھر جوان ہونے کے بعد وفا شعار اور اطاعت گزار بیوی کی محبت و الفت۔ صنعتی ترقی نے مغربی ملکوں میں آسائش و راحت کے اسباب و

اسباب و وسائل کی تو فراوانی کر دی لیکن گھروں سے تسکین و راحت ختم کر دی کیونکہ محض اسباب راحت سے تو راحت اور وسائل آسائش سے تو آسائش حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان مغربی ملکوں میں، جہاں وسائل آسائش کی فراوانی ہے، خودکشی کی وارداتیں بھی عام ہیں اور خواب آور گولیوں کا استعمال بھی روز افزوں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ محض دولت کی ریل پیل اور وسائل کی فراوانی ہی سب کچھ نہیں۔ نہ اس سے امن و راحت ہی نصیب ہو سکتا ہے۔ امن و راحت اس اسلامی نظام ہی میں ہے جو اللہ نے انسانوں کے لیے تجویز کیا ہے ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ''دلوں کو اطمینان اللہ کے ذکر ہی سے ملتا ہے۔''[1]

مغربی ملکوں نے چونکہ اپنے آپ کو اس نظام سے محروم کر لیا ہے تو ہر طرح کی مادی و سائنسی ترقی کے باوجود وہ گھریلو امن و سکون سے محروم ہیں۔ اس لیے کہ اس نے گھر کی ملکہ کو ہر ایرے غیرے کی کنیز اور خادمہ بنا دیا ہے، شمع حرم کو شمع انجمن بنا دیا ہے اور تقدیس و عظمت کی اس چادر کو تار تار کر دیا ہے جو اللہ نے اس کے قامت زیبا کے لیے تجویز کی تھی۔ اب وہ گھر میں صرف خاوند کی مہر و محبت کا مرکز نہیں بلکہ کلبوں میں، دفتروں میں اور بازاروں میں ہر بوالہوس کی ہوس ناک نگاہوں کا محور ہے۔ اب وہ صرف خاوند کے راحت کدے کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کی آغوش محبت ہر شہوت ران کے لیے کھلی ہوئی ہے۔ اب وہ صرف گھر کی زینت نہیں ہے بلکہ اس کے حسن کے جلووں سے ملک کے تمام بام و در روشن ہیں۔ یوں ایک نہایت بیش قیمت متاع کو، جسے پردے میں چھپا کر اور غیروں کی نظروں سے بچا کر رکھنے کی تاکید کی گئی تھی، مغرب نے اسے ایک شوپیس اور نیلام کا مال بنا کر رکھ دیا ہے۔ تقدیس و عصمت کے پیکر کو بے حیائی کا چلتا پھرتا اشتہار

---

1 الرعد 28:13.

اور وفا کے پتلے کو جفا کا خوگر اور ہرجائی بنا دیا گیا ہے۔ فَإِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُون .

بدقسمتی سے اسلامی ملکوں میں بھی، جب سے وہاں سے اسلام کی علمبرداری ختم ہوئی ہے، مغرب کی نقالی میں عورت کو گھروں سے باہر نکالنے کی اور مردوں کے دوش بدوش کھڑا کرنے کی مذموم مساعی کی جا رہی ہیں۔ ایک آدھ ملک کو چھوڑ کر تقریباً ہر اسلامی ملک میں مغرب زدگی کا یہ فتنہ عام ہے کیونکہ ان پر مسلط حکمران طبقہ اور ان کے اعوان و انصار کے قلب ونظر کا رگہ مغرب ہی کے ڈھلے ہوئے ہیں، اس لیے انھیں اسلامی تہذیب وتمدن کے مقابلے میں مغرب کی حیا باختہ تہذیب زیادہ اچھی لگتی ہے اور اسلام کے عادلانہ نظام وقوانین کے مقابلے میں مغرب کے خودساختہ قوانین زیادہ بھلے لگتے ہیں۔ سب سے پہلے اس شوخ چشمانہ جسارت کا ارتکاب ترکی کے آمر مطلق مصطفٰے کمال پاشا نے کیا۔ اس شخص نے 1924ء میں نہ صرف اسلامی خلافت کا خاتمہ کیا بلکہ اسلامی قوانین کی جگہ مغربی قوانین کو بہ زور نافذ کر دیا۔ تب سے وہاں آج تک اسی کافرانہ نظام کا غلبہ ہے اور اسے اس طرح تحفظ حاصل ہے کہ کسی حکومت کو اس سے انحراف کرنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ کوئی بھی ذمے دار فرد کسی اسلامی شعار کو اختیار نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ اس کی ایک مثال مروہ نامی عورت ہے۔ یہ خاتونِ محترمہ ترکی پارلیمنٹ کی ممبر تھی۔ یہ سر پر سکارف باندھ کر پارلیمنٹ میں گئی تو وہاں اس کے خلاف ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور اسے ترکی قانون سے غداری قرار دے کر اس خاتون کی نہ صرف رکنیت ختم کر دی گئی بلکہ اس کو وہاں کے شہری حقوق سے بھی محروم کر دیا گیا۔ مغرب کی نقالی میں یہ اس ترکی کا حال ہے جو کبھی اسلامی خلافت کا امین اور عالم اسلام کا محافظ اور پشتی بان تھا۔ آج وہ اپنے اس اسلامی اعزاز اور عالمی کردار سے محروم ہو کر اپنے ہی مسائل میں اس طرح الجھا ہوا ہے کہ کسی لحاظ سے بھی اسے اطمینان بخش نہیں کہا جا سکتا۔

اسلام سے انحراف، اجتہاد نہیں ارتداد ہے

بلندی اور عروج کے مقابلے میں یہ پستی اور زبوں حالی اس کا مقدر کیوں بنی؟ اس کا جواب صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے، اسلام سے انحراف کے نتیجے میں۔ لیکن عام لوگوں کے فکر ونظر کی کجی کا یہ حال ہے کہ وہ ترکی کے اس انحراف کو قابل تقلید سمجھتے ہوئے دوسرے اسلامی ملکوں کو بھی اسلام کے معاملے میں وہی رویہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں جو ترکی نے اختیار کیا حتیٰ کہ علامہ اقبال جیسے شخص نے بھی اپنے خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے ایک خطبے ''الجہاد فی الاسلام'' میں ترکی کے بعض اقدامات کی تحسین کی ہے جس سے مغرب زدہ افراد کو مزید حوصلہ ملتا ہے۔ علامہ مرحوم کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اسلام سے انحراف کو ''اجتہاد'' سے تعبیر کیا ہے، حالانکہ اسلامی قوانین کی بجائے مغربی قوانین کا اختیار کرنا، یہ ترکی کا اجتہاد نہیں بلکہ انحراف وارتداد ہے۔

سندھ ہائی کورٹ کے جج کا ایک نہایت ہی غلط فیصلہ

اسی غلطی کا اعادہ سندھ ہائی کورٹ کے ایک جج شائق عثمانی نے اپنے ایک فیصلے میں کیا ہے اور عورت کے حصۂ وراثت کو مرد کے برابر کرنے کے لیے ''اجتہاد'' کی دعوت دی ہے۔ ان کا یہ فیصلہ انگریزی میں ہے لیکن اس کے کچھ حصے کا اردو ترجمہ ایک ریٹائرڈ جج جناب جسٹس شفیع محمدی صاحب نے ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی کے 22 اپریل 1998ء والے شمارے میں شائع کروایا ہے۔ اس میں یہ جج صاحب فرماتے ہیں:

''بلاشبہ بچی کے حصے کا بچے کے حصے کے مقابلے میں آدھا ہونے کے متعلق قوانین کا اطلاق اس دعوے کی غلط تشریح کا نتیجہ ہے کہ یہ قانون ناقابل تبدیل ہے اور ہمیشہ رہنے

والا ہے۔ اصل میں یہ دعویٰ نتیجہ ہے مرد پرستی کے اس مزاج کا جو ہمارے سماج میں سرایت کر چکا ہے۔ ہمارے مذہب میں عورتوں کو آدھے حصے کی جو بات کی گئی ہے وہ اس کی کم سے کم حد قائم کرنے کے لیے ہے، زیادہ سے زیادہ کے لیے نہیں، اس لیے یہ ممکن ہے کہ کوئی اسلامی مملکت اجتہاد سے کام لے کر عورت کے حصے کو بڑھا دے۔ کم از کم ایک مسلم ملک، یعنی ترکی تو ایسا ملک ہے جہاں وراثت میں بچیوں اور بچوں کے حصے برابر ہیں......''

اس میں جج موصوف نے پہلے تو چند مفروضے قائم کیے ہیں:

① اسلام کے قانون وراثت کو ابدی (ہمیشہ رہنے والا) اور ناقابل تبدیل سمجھنے کا دعویٰ غلط تشریح کا نتیجہ ہے۔

② یہ دعویٰ مرد پرستی کا نتیجہ ہے۔

③ اسلام میں عورت کے آدھے حصے کی جو بات کی گئی ہے، وہ اس کی کم سے کم حد قائم کرنے کے لیے ہے، زیادہ سے زیادہ کے لیے نہیں۔

یہ تین مفروضے قائم کر کے وہ اس شوخ چشمانہ جسارت کا ارتکاب کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ اجتہاد کے ذریعے سے اس قانون کو تبدیل کر دیا جائے اور بطور مثال ترکی کا نام لیا ہے کہ اس نے یہ کام کر دکھایا ہے۔ گویا ترکی کی تحسین کر کے دوسرے اسلامی ملکوں کو بھی اس کافرانہ حرکت کا ارتکاب کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

ہمیں تعجب ہے کہ فاضل جج نے یہ مفروضے کس بنیاد پر قائم کیے ہیں کیا ان مفروضوں کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل ہے؟

ان کا پہلا مفروضہ یا واہمہ یہ ہے کہ عورت کا نصف حصہ اس غلط تشریح کا نتیجہ ہے کہ یہ قانون ناقابل تبدیل اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا یہ قانون تبدیل ہو سکتا ہے بلکہ ہونا چاہیے کیونکہ اسلام کی صحیح تشریح کا نتیجہ یہی ہے۔ موصوف نے

اپنے اس دعوے کے مضمرات پر غور نہیں کیا ورنہ وہ کبھی یہ کھوکھلا دعویٰ نہ کرتے۔ اس دعوے کا صاف مطلب یہ ہے کہ چودہ سو سال میں جو ہزاروں بلکہ لاکھوں علماء و فقہاء گزرے ہیں اور وہ اسلام کے قانون وراثت کو بالکل صحیح اور یکسر ناقابل تبدیل سمجھتے رہے ہیں، ان کا فہمِ اسلام ناقص اور ان کی قرآنی تفسیر وتشریح غلط ہے۔ اس کے برعکس آج کل کے مغرب زدہ مستغربین جو قرآن کریم کو شاید دیکھ کر بھی صحیح پڑھنے پر قادر نہیں، کجا کہ وہ اس کو سمجھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں، ان کا فہمِ قرآن صحیح اور ان کی تفسیر وتشریح معتبر ہے۔

اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ چودہ سو سال کے مفسرین و محققین اور علماء و فقہاء ہی کا فہمِ قرآن صحیح اور ان ہی کی توضیح وتشریح معتبر ہے۔ ان کے مقابلے میں آج کے یہ متفکرین اسلام جو عربی زبان اور قرآنی و حدیثی علوم سے یکسر نا آشنا ہیں، ان کا دعوائے فہمِ قرآن، محض ایک ادعا ہے۔ یہ اسلام کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ چودہ سو سال کے علماء و فقہاء کے مقابلے میں آج کل کے متجد دین و متفکرین کو جاہل اور اسلام سے نا آشنائے محض تسلیم کر لینا زیادہ آسان بھی ہے اور قرین صواب بھی۔

② ان کا دوسرا مفروضہ بھی براہ راست اللہ تعالیٰ کی ذات پر حملہ ہے۔ عورت کا نصف حصۂ وراثت اگر واقعی مرد پرستی کا نتیجہ ہے تو اس قانون کے واضع علماء و فقہاء نہیں، خود اللہ تعالیٰ ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کا یہ حکم حکمت و مصلحت کی بجائے کسی ایک جنس یا صنف کی بے جا طرف داری پر مبنی ہے؟ جیسا کہ موصوف کے دعوائے مرد پرستی سے یہی لازم آتا ہے تو اس کے بعد اللہ حکیم و عادل قرار پائے گا یا ظالم و غیر حکیم؟ امت کے تمام فقہاء، علماء اور مفسرین اللہ تعالیٰ کو حکیم و عادل ہی مانتے آئے ہیں اور اللہ پر ایمان رکھنے کا تقاضا اور مطلب بھی یہی ہے، اس لیے اس کے ہر حکم اور قانون کو وہ عدل و انصاف کا آئینہ دار بھی سمجھتے رہے

ہیں اور حکمت و مصلحت سے پُر بھی۔ چاہے وہ حکمت و مصلحت انسانوں کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ کا زیرِ بحث قانون وراثت بھی حکمت و مصلحت سے پُر ہے۔ ذرا سوچیے! اسلام نے عورت کو کسب معاش کی ذمے داریوں سے فارغ رکھا ہے جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ عورت کو تجارت و کاروبار کرنے کی ضرورت ہے نہ فیکٹریوں اور دفتروں میں مردوں کے دوش بدوش ملازمت کرنے کی۔ یہ اور اس قسم کے دیگر تمام بیرونی کاموں کے ذمے دار صرف اور صرف مرد ہیں۔

جب واقعہ یہ ہے تو سرمائے اور دولت کی زیادہ ضرورت مرد کو ہے یا عورت کو۔ جس کو زیادہ ضرورت ہے تو اس کی ضروریات کے پیش نظر اس کا حصہ بھی زیادہ مقرر کرنا عدل و انصاف اور حکمت کے مطابق ہے یا اس کے منافی؟ مرد و عورت کے درمیان جب نکاح کا سلسلہ قائم ہوتا ہے تو شادی کے اخراجات بھی اصل میں مرد ہی کی طرف سے ہوتے ہیں۔ ولیمہ کرنا بھی اس کی ذمے داری ہے اور مہر کی ادائیگی بھی مرد ہی کا فریضہ ہے۔ علاوہ ازیں اور بھی جتنے اخراجات ہیں، ان سب کا کفیل صرف مرد ہی ہے، عورت نہیں۔ کسی بھی مرحلے میں عورت پر کوئی مالی ذمے داری نہیں۔ جب وہ بیٹی ہے تو والدین اس کے کفیل ہیں، والدین کی عدم موجودگی میں وہ بھائیوں کی بہن ہے، وہ بھائی ہی اس کے کفیل ہیں۔ میکے سے سسرال منتقل ہونے کے بعد وہ بیوی ہے، اب اس کا کفیل اس کا خاوند ہے۔ صاحب اولاد ہونے کے بعد وہ ماں کے درجے پر فائز ہو جاتی ہے اب خاوند کے ساتھ ساتھ جوان اولاد بھی اس کی کفیل ہے اور خاوند کی عدم موجودگی میں تو بالخصوص اولاد ہی ماں کے تمام اخراجات کی ذمے دار ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ اسلامی معاشرہ جس کی بنیاد اسلامی تعلیمات ہیں۔ اس میں دیکھ لیجیے، ہر مرحلے میں مالی ذمے داریوں کا تمام بوجھ صرف مرد پر ہے۔ عورت کسی بھی موقع پر مال کمانے اور اسے حاصل کرنے کی مکلّف نہیں ہے۔ جب ایسا ہے

تو عورت کا نصف حصۂ میراث بھی دراصل اس کے احترام و وقار کو بحال کرنا ہے کیونکہ اسلام سے قبل زمانۂ جاہلیت میں عورت وراثت سے بالکل محروم تھی۔ اسلام ہی نے اسے وراثت میں حق دار قرار دے کر اس کی بے توقیری اور بے حیثیتی کو ختم کیا۔ اگر ذمے داریوں کے اعتبار سے وہ پوری وراثت کی حق دار ہوتی تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کا حصۂ میراث بھی مرد کے برابر ہی رکھتا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے خود ہی اسے تمام مالی ذمے داریوں سے اور بیرونی معاملات سے مستثنیٰ رکھا ہے تو یہ بات کس طرح عدل و انصاف کے مطابق ہوتی کہ اس کا حصۂ میراث بھی اس مرد کے برابر ہوتا جس پر مالی ذمے داریوں کا تمام بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔

③ موصوف کا تیسرا دعویٰ بھی یکسر بے بنیاد ہے، آخر قرآن کے کس لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ عورت کا آدھا حصہ کم از کم حد ہے۔ اگر یہ بات بالفرض صحیح تسلیم کر لی جائے تو دوسرا سوال یہ ہے کہ پھر زیادہ سے زیادہ حد کیا ہو گی یا کیا ہونی چاہیے؟ اگر مرد کے برابر یا اس سے زیادہ مقرر کی جائے گی تو مرد بجا طور پر معترض ہوں گے کہ مالی معاملات کے تمام تر ذمے دار تو ہم ہیں، پھر عورت کے لیے، جس پر سرے سے کوئی بوجھ ہی نہیں ہے، ہمارے برابر یا ہم سے بھی زیادہ حصہ کیوں رکھا گیا ہے؟ اس کا کوئی معقول جواب ان متجددین و متفکرین اسلام کے پاس ہے؟ اور اگر عورت کا حصہ مرد کے برابر یا اس سے زیادہ تو مقرر نہیں کیا جاتا، نصف سے تھوڑا بڑھا دیا جائے تو کیا عورت پرستی کے مریض مطمئن ہو جائیں گے؟ ان کا اعتراض برقرار ہی رہے گا تو پھر اس کھکھیڑ سے، جس کو یہ متجددین اجتہاد کا نام دے رہے ہیں، کیا حاصل ہو گا؟

④ رہی بات اجتہاد کی اور اس کی دعوت کی تو دراصل یہ لوگ اجتہاد کی حقیقت ہی سے بے خبر ہیں ورنہ اس دیدہ دلیری سے مسئلہ زیر بحث میں اجتہاد کی دعوت نہ دی جاتی۔

اجتہاد کا دروازہ یقیناً کھلا ہوا ہے۔ ہر دور میں اجتہاد ہوتا رہا ہے، آج بھی اجتہاد ہوتا ہے اور ہوسکتا ہے۔ بہت سے مسائل آج بھی یقیناً دعوتِ اجتہاد دے رہے ہیں اور ان میں اجتہاد کی ضرورت ہے لیکن یہ کون سے مسائل ہیں۔ منصوص مسائل نہیں، ان میں تو اجتہاد کی کوئی گنجائش ہی نہیں کیونکہ منصوص مسائل میں بغیر چون و چرا کیے ایمان لانا اور ایمان رکھنا ضروری ہے۔ ان کی بابت اجتہاد کی دعوت دینا دراصل اسلام سے بغاوت اور کفر و ارتداد ہے۔ جسٹس موصوف نے بھی ایک منصوص اور متفق علیہ مسئلے میں اجتہاد کی دعوت دے کر کفر و ارتداد ہی کا ارتکاب کیا ہے، جس سے انھیں، اگر وہ مسلمان رہنا اور اسلام ہی پر مرنا چاہتے ہیں تو، فوراً توبہ کرنی چاہیے۔

اجتہاد صرف ان مسائل میں ہوتا اور ہوسکتا ہے جو غیر منصوص ہوں یا منصوص احکام کے انطباق و اطلاق کے بارے میں سوچ بچار ہوسکتا ہے۔ جس کی بابت کوئی صراحت قرآن و حدیث میں نہیں ہے۔ ماہرین شریعت اس کی بابت غور کریں گے کہ شریعت میں اس سے ملتا جلتا کوئی مسئلہ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو علت و حکمت کے اعتبار سے اس کا انطباق اس پر ہوسکتا ہے یا نہیں۔ گویا شریعت کے دائرے اور اس کی حدود و قیود میں رہتے ہوئے نئے مسئلے کے حل کے لیے کوشش کرنے کا نام اجتہاد ہے، نہ کہ نص شریعت (کسی واضح حکم) کے بارے میں آزادانہ بحث یا نقد و نظر کی دعوت دینا۔ افسوس ہے کہ جسٹس موصوف نے اس دوسرے مفہوم کو ہی اجتہاد سمجھا ہے جو سرے سے اجتہاد ہی نہیں بلکہ الحاد و ارتداد ہے۔

⑤ اسی طرح ترکی کے اقدام کو بطور مثال پیش کرنا بھی ذہنی ارتداد ہی کا نتیجہ ہے کیونکہ ترکی میں اگر عورت کا حصۂ وراثت مرد کے برابر ہے تو انھوں نے یہ قانون اجتہاد کر کے نہیں بنایا (کیونکہ اس میں اجتہاد ہو ہی نہیں سکتا) بلکہ اسلام سے انحراف و بغاوت کر کے

جبرًا یہ قانون نافذ کیا ہے۔ اب جس کو اسلام سے انحراف و بغاوت محبوب ہے، وہ بصد شوق اسے مستحسن سمجھے لیکن جسے اسلام عزیز ہے اور وہ مسلمان رہنا چاہتا ہے تو وہ کبھی ترکی کے اس اقدامِ بغاوت کو نظرِ تحسین سے نہیں دیکھے گا، چہ جائیکہ وہ اس کی تقلید کی دعوت عام دینے کی جسارت کرے۔

عورت اور مرد کی نماز کا فرق؟

مرد و عورت کی نماز میں تفریق اور امتیاز اگر چہ ہمارے نزدیک عورت کے امتیازی مسائل میں شامل نہیں کیونکہ اس تفریق و امتیاز کی کوئی صحیح دلیل نہیں لیکن چونکہ برادران احناف نے مرد اور عورت کی نماز میں تفریق کر رکھی ہے، بنا بریں اس کی اصل حیثیت کی وضاحت ہمارے نزدیک ضروری ہے، اس لیے ذیل میں اس کی بابت بھی چند گزارشات اور احناف کے دلائل پر کچھ تبصرہ درج ہے۔ ویسے تو فقہائے احناف نے متعدد مسائل نماز میں مرد و عورت کے درمیان امتیاز بیان کیا ہے، تاہم تین مسئلوں میں بالخصوص وہ عورتوں کا مردوں سے مختلف طریقۂ نماز بتلاتے ہیں۔ ہم ذیل میں انھیں تین مسائل کی بابت کچھ عرض کرتے ہیں۔ وہ تین مسئلے حسب ذیل ہیں:

① رفع الیدین میں کہ مرد کانوں تک تکبیر کے لیے ہاتھ اٹھائے اور عورت کاندھے تک۔

② عورت سینے پر ہاتھ باندھے اور مرد زیر ناف۔

③ عورت جب سجدہ کرے تو اپنا پیٹ رانوں سے چپکا لے جبکہ مرد کو حکم ہے کہ وہ اپنی رانیں پیٹ سے دور رکھے۔

امر اوّل کے متعلق ہماری نظر سے کوئی منقول دلیل نہیں گزری، جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ احناف کے پاس اپنے اس موقف کے اثبات کے لیے سوائے قیاس کے کوئی دلیل نہیں ہے، چنانچہ امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«وَاعْلَمْ! أَنَّ هٰذِهِ السُّنَّةُ تَشْتَرِكُ فِيهَا الرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ، وَلَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلَى الْفَرْقِ بَيْنَهُمَا فِيهَا، وَكَذَا لَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلَى الْفَرْقِ بَيْنَ الرَّجُلِ وَالْمَرْأَةِ فِي مِقْدَارِ الرَّفْعِ، وَرُوِيَ عَنِ الْحَنَفِيَّةِ أَنَّ الرَّجُلَ يَرْفَعُ إِلَى الْأُذُنَيْنِ، وَالْمَرْأَةُ إِلَى الْمَنْكِبَيْنِ لِأَنَّـهُ أَسْتَرُلَهَا، وَلَا دَلِيلَ عَلٰى ذٰلِكَ كَمَا عَرَفْتَ»

''یہ رفع الیدین ایسی سنت ہے جو مرد و عورت دونوں کے لیے یکساں ہے، اس کی بابت دونوں کے درمیان فرق کرنے کا کوئی حکم نہیں ہے۔ اسی طرح مقدار رفع میں بھی فرق کرنے کی کوئی صراحت منقول نہیں ہے جیسا کہ حنفیہ کا مذہب ہے کہ مرد ہاتھ کانوں تک اٹھائے اور عورت کندھوں تک کیونکہ یہ عورت کے پردے کا باعث ہے۔ حنفیہ کے اس مذہب کی کوئی دلیل نہیں ہے۔''[1]

② ہاتھ باندھنے میں احناف مرد و عورت کے درمیان جو تفریق کرتے ہیں، اس کی بھی کوئی دلیل ہمارے علم میں نہیں۔ یہ بھی اس امر کی واضح شہادت ہے کہ احناف کے پاس اپنے اس موقف کے اثبات کے لیے بھی کوئی دلیل نہیں ہے، اس لیے احادیث صحیحہ کی رو سے مرد و عورت دونوں کے لیے یہی حکم ہے کہ وہ نماز میں سینے پر ہاتھ باندھیں۔

مولانا یوسف لدھیانوی مرحوم نے اپنی کتاب ''اختلاف امت اور صراط مستقیم'' میں سارا زور تیسرے فرق کے اثبات پر لگایا ہے کیونکہ اس مسئلے میں ان کے پاس ایک مرسل روایت اور بعض ضعیف آثار ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرسل روایت محدثین اور علمائے محققین کے نزدیک قابل حجت ہی نہیں۔ علاوہ ازیں یہ مرسل روایت بھی منقطع ہے اور اس میں ایک راوی (سالم) متروک ہے۔[2]

---

1 نيل الأوطار، باب رفع اليدين و بيان صفته ومواضعه: 206/2 . 2 ملاحظہ ہو: الجوهر النقي، حاشية السنن الكبرى للبيهقي: 223,222/2 .

اس مرسل و منقطع روایت کے علاوہ مدیر ''بینات'' نے کنز العمال کی ایک روایت بیہقی اور ابن عدی کے حوالے سے بروایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نقل کی ہے کہ ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عورت جب سجدہ کرے تو اپنا پیٹ رانوں سے چپکا لے ایسے طور پر کہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ پردے کا موجب ہو۔''[1]

یہ روایت سنن بیہقی میں موجود ہے لیکن موصوف نے یہ روایت سنن بیہقی کی بجائے کنز العمال کے حوالے سے نقل کی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ سنن بیہقی میں اس کی سند بھی موجود ہے اور اس کی بابت امام بیہقی کی یہ صراحت بھی کہ ''اس جیسی (ضعیف) روایت کے ساتھ استدلال نہیں کیا جا سکتا۔''[2]

اس کے باوجود اس روایت سے استدلال نہایت تعجب انگیز ہے۔

بہر حال ارکانِ نماز میں مرد و عورت کے درمیان شریعت اسلامیہ نے کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا۔ بلکہ ایک عام حکم دیا ہے [صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي] ''تم نماز اس طرح پڑھو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔''[3] اس حکم میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں جب تک کہ کسی واضح نص سے عورتوں کی بابت مختلف حکم ثابت نہ کر دیا جائے۔ جیسے عورت کے لیے ایک خاص حکم یہ ہے کہ وہ اوڑھنی (پردے) کے بغیر نماز نہ پڑھے، اسی طرح یہ بھی حکم ہے باجماعت نماز پڑھنے کی صورت میں اس کی صفیں مردوں سے آگے نہیں بلکہ پیچھے ہوں۔ اگر نماز کی ہیئت اور ارکان کی ادائیگی میں بھی فرق ہوتا تو شریعت میں اس کی بھی وضاحت کر دی جاتی اور جب ایسی صراحت نہیں ہے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ مرد اور عورت کی نماز میں تفریق کا کوئی جواز نہیں۔

---

1 كنز العمال، ص: 91,90 . 2 ملاحظہ ہو: السنن الكبرٰى للبيهقي: 223,222/2 . 3 صحيح البخاري، الأذان، باب الأذان للمسافر إذا كانوا جماعة......، حديث: 595 .

عورت کی امامت کا مسئلہ

اسی طرح ایک فرق آثارِ صحابہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ عورت عورتوں کی امامت کرائے تو وہ مرد امام کی طرح صفوں سے آگے کھڑی نہ ہو بلکہ اگلی صف میں درمیان میں کھڑی ہو، تاہم کسی حدیث میں اس کی بابت کوئی وضاحت نہیں۔ اسی لیے امام ابن حزم نے کہا کہ چونکہ عورت کے صف کے آگے کھڑے ہونے کی بابت ممانعت کی کوئی دلیل نہیں، اس لیے وہ آگے کھڑے ہو کر بھی نماز پڑھا سکتی ہے۔[1]

لیکن ہمارے خیال میں زیادہ صحیح یہی ہے کہ جب صحابہ کے آثار اور بعض ازواج مطہرات کے عمل سے یہ ثابت ہے کہ امامت کے وقت عورت صف کے درمیان کھڑی ہو تو اس کے مطابق عمل کرنا زیادہ بہتر ہے۔ یہ آثار حسب ذیل ہیں:

ریطہ حنفیہ رحمہا اللہ بیان کرتی ہیں:

«أَنَّ عَائِشَةَ أَمَّتْهُنَّ وَقَامَتْ بَيْنَهُنَّ فِي صَلَاةٍ مَكْتُوبَةٍ»

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرض نمازوں میں عورتوں کی امامت کے فرائض انجام دیے اور وہ ان کے درمیان کھڑی ہوئیں۔''[2]

تمیمہ بنت سلمہ بیان فرماتی ہیں:

«أَنَّهَا أَمَّتِ النِّسَاءَ فِي صَلَاةِ الْمَغْرِبِ، فَقَامَتْ وَسْطَهُنَّ، وَجَهَرَتْ بِالْقِرَاءَةِ»

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے مغرب کی نماز میں عورتوں کی امامت کے فرائض انجام دیے، تو عورتوں کے درمیان کھڑی ہوئیں اور جہری (بلند آواز سے) قراءت فرمائی۔''[3]

---

1 المحلّٰی ۔ 2 مصنف عبدالرزاق، الصلاۃ، باب المرأۃ تؤم النساء: 141/3 .

3 المحلّٰی لابن حزم: 219/4 .

ام حسن سے مروی ہے:

«أَنَّهَا رَأَتْ أُمَّ سَلَمَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ تَؤُمُّ النِّسَاءَ، تَقُومُ مَعَهُنَّ فِي الصَّفِّ»

''انھوں نے دیکھا کہ ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عورتوں کی امامت کے فرائض انجام دیے اور وہ ان کے ساتھ صف ہی میں کھڑی ہوئیں۔''[1]

امام ابن حزم رحمہ اللہ اس روایت کے متعلق فرماتے ہیں:

«هِيَ خَيْرَةٌ، ثِقَةُ الثِّقَاتِ - وَهٰذَا إِسْنَادٌ كَالذَّهَبِ»

''یہ بہترین سند ہے، اس کے سب راوی انتہائی ثقہ ہیں، یہ سند کیا ہے سونے کی ایک لڑی ہے۔''[2]

حجیرہ بنت حصین فرماتی ہیں:

«أَمَّتْنَا أُمُّ سَلَمَةَ فِي صَلَاةِ الْعَصْرِ قَامَتْ بَيْنَنَا»

''سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے نماز عصر میں ہماری امامت کے فرائض انجام دیے اور آپ ہمارے درمیان کھڑی ہوئی تھیں۔''[3]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

«تَؤُمُّ الْمَرْأَةُ النِّسَاءَ تَقُومُ فِي وَسْطِهِنَّ»

''عورت عورت کی امامت کرواسکتی ہے لیکن امامت کے وقت وہ عورتوں کے

---

1 مصنف ابن أبي شيبة، الصلوات، باب المرأة تؤم النساء: 430/1، حديث: 4953.
2 المحلّٰى لابن حزم: 220/4. 3 مصنف عبدالرزاق، الصلاة، باب المرأة تؤم النساء: 140/3، حديث: 5082، و مصنف ابن أبي شيبة، الصلوات، باب المرأة تؤم النساء: 430/1، حديث: 4952.

درمیان ہی میں کھڑی ہوگی۔[1]

اسی طرح سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق بھی مروی ہے:

«أَنَّهُ كَانَ يَأْمُرُ جَارِيَةً لَهُ، تَؤُمُّ نِسَاءَهُ فِي رَمَضَانَ»

''آپ اپنی لونڈی کو حکم دیتے تھے، پس وہ رمضان المبارک میں عورتوں کو باجماعت نماز پڑھاتی تھی۔''[2]

ان تمام روایات کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عورت دوسری عورتوں کی فرض اور نفل ہر دو طرح کی نمازوں میں بلا کراہت امامت کرواسکتی ہے۔ جن نمازوں میں جہری (بلند آواز سے) قراءت کی جاتی ہے ان میں اونچی آواز سے قراءت بھی کرسکتی ہے۔ ہاں! اگر آس پاس غیر محرم مرد ہوں تو پھر قراءت اونچی آواز سے نہ کرے لیکن اگر اس امام عورت کے محرم مرد ہوں تو قراءت بالجہر میں کوئی حرج نہیں ہے۔[3]

جہاں تک جماعت کے لیے عورت کے اذان دینے اور اقامت کہنے کا مسئلہ ہے تو عورت کے لیے پست (ہلکی) آواز میں اذان دینا اور اقامت کہنا بھی جائز ہے جیسا کہ طاؤس کے اس قول سے واضح ہوتا ہے، فرماتے ہیں:

«كَانَتْ عَائِشَةُ تُؤَذِّنُ وَتُقِيمُ»

''ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اذان واقامت خود کہہ لیا کرتی تھیں۔''[4]

اور جہاں تک امام عورت کے کھڑے ہونے کی جگہ کا سوال ہے تو اس کے لیے اگلی صف کے درمیان میں کھڑا ہونا مستحب ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ اسی سلسلے میں علامہ ابن

---

1 مصنف عبدالرزاق، الصلاة، باب المرأة تؤم النساء: 140/3، حديث: 5083.

2 المحلّى لابن حزم: 220/4. 3 المغني: 36/2. 4 المحلّى: 220/4، ومصنف عبدالرزاق، الصلاة، باب هل على المرأة أذان وإقامة: 126/3، حديث: 5015، 5016.

قدامہ مقدسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”جو علماء عورت کی امامت کے قائل ہیں ان کے نزدیک اس بارے میں ہمیں کسی اختلاف کا علم نہیں کہ اگر کوئی عورت دوسری عورتوں کی امامت کر رہی ہو تو وہ ان کے درمیان میں کھڑی ہو گی کیونکہ عورت کے لیے پردے میں رہنا زیادہ پسندیدہ ہے اور جب وہ صف کے درمیان میں ہو تو پردے میں ہوتی ہے کیونکہ اسے دونوں جانب سے دوسری عورتوں نے چھپا رکھا ہوتا ہے اور یہ مستحب عمل ہے۔“[1]

[1] المغني: 36/2.

بھٹو دور کی حقوقِ نسواں کمیٹی کی سفارشات اور ان پر تبصرہ

آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

کم و بیش 30 سال قبل جنوری 1976ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں ایک ''حقوقِ نسواں کمیٹی'' بنائی گئی تھی، جس کا مقصد عورتوں کے مسائل پر غور و خوض اور ان کا حل پیش کرنا تھا۔ اس سے قبل ایوب خاں نے بھی اپنے دور میں ''عائلی قوانین'' کا نفاذ کیا تھا جس کی کئی دفعات غیر اسلامی تھیں اور جو مغربی سانچے میں ڈھلی ہوئی بیگمات کی ناز برداری کے لیے نافذ کی گئی تھیں، جیسے مشرف دَور میں بھی اسی قسم کی بیگمات کی خواہش پر حدود آرڈی نینس کا تیاپانچہ کر کے ''خواتین ایکٹ'' نافذ کیا گیا ہے جس کی تفصیل الگ مضمون میں درج ہے۔ اسی قسم کی ایک سعیٔ مذموم بھٹو حکومت میں بھی کی گئی تھی، تاہم ابھی اس کی سفارشات کے نفاذ کی نوبت نہیں آئی تھی کہ بھٹو حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ یہ کمیٹی یحییٰ بختیار کی زیرِ صدارت قائم کی گئی تھی اور حسبِ ذیل حضرات و خواتین بطورِ ارکان مقرر کیے گئے تھے۔

بیگم نسیم جہاں ایم این اے، بیگم ریحانہ سرور ایم پی اے، بیگم نسیمہ عثمان فتح سابق سینیٹر، بیگم رشیدہ پٹیل وکیل قائمہ حکومت پاکستان، بیگم نسیمہ سلطانہ اکموت ایڈووکیٹ، آنسہ فضیلہ عالیانی ایم پی اے، جناب ڈی ایم اعوان ایڈووکیٹ جنرل پنجاب، جناب غلام علی میمن ایڈووکیٹ جنرل سندھ، مفتی محمد ادریس ایڈووکیٹ جنرل شمالی مغربی سرحدی

صوبہ، بیگم زری سرفراز مردان ، جناب محمد حیات جونیجوایڈووکیٹ کراچی، مسز مریم حبیب، مدیرہ خواتین ایڈیشن پاکستان ٹائمز لاہور، مسز میرافیلبوس، پرنسپل کینرڈ کالج برائے خواتین لاہور۔ ان تیرہ افراد کے علاوہ محکمۂ تعلیم پنجاب کی ڈاکٹر مسز پروین شوکت علی کو کمیٹی کے مُشیر کی حیثیت سے اور جناب سی اے رحمٰن بھٹی جوائنٹ سیکرٹری اور جناب جی ایس گھانگھرو ڈپٹی سیکرٹری شعبۂ قانون کو بالترتیب کمیٹی کے سیکرٹری اور اضافی سیکرٹری کے طور پر مقرر کیا گیا تھا۔

کمیٹی کوحسبِ ذیل اُمور تفویض کیے گئے تھے:

① پاکستان کی خواتین کی معاشرتی، قانونی اور معاشی حالت کو بہتر بنانے کے خیال سے قانونی اصلاحات کے لیے تجاویز پر غور کرنا اور انھیں اصولی صورت میں پیش کرنا اور نان نفقہ، بچوں کی تحویل وغیرہ جیسے معاملات میں دادرسی حاصل کرنے کے لیے زیادہ مستعد قانونی چارہ جوئی کے لیے احکام وضع کرنا۔

② پاکستانی خواتین کی معاشرتی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے تجاویز پیش کرنا۔

③ ان کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے سفارشات کرنا۔

④ پاکستانی خواتین کی حیثیت اور حالات کو بہتر بنانے کے لیے کوئی تجاویز جو کمیٹی پیش کرسکے۔

کمیٹی کے جولائی 1976ء تک مختلف شہروں میں 14 اجلاس ہوئے۔ سب سے پہلے کمیٹی نے قانونی اصلاحات پر غور کیا۔ اس ضمن میں مسلم عائلی قوانین آرڈی ننس، عدالت ہائے عائلی ایکٹ اور اندراجِ ازدواج نان نفقہ، بچوں کی تحویل، طلاق اور خلع وغیرہ سے تعلق رکھنے والے دیگر متعلقہ قوانین پر نظر ثانی کی گئی اور متعدد تبدیلیوں کی سفارش کی گئی ہے۔ کمیٹی کی رپورٹ کا حصہ اول شائع کردیا گیا ہے جو قانونی اصلاحات،

یعنی عائلی قوانین اور خواتین پر اثر انداز ہونے والے دیگر قوانین سے متعلق سفارشات سے بحث کرتی ہے۔ کمیٹی کا کام ابھی جاری تھا اور ابھی اس کو دیگر موضوعات پر جو خصوصی طور پر معاشی اور معاشرتی میدان میں خواتین کے حقوق اور حیثیت سے متعلق ہیں، غور و خوض کرنا باقی تھا۔

جو حصہ شائع ہوا ہے، اس میں کئی چیزوں کا تعلق تو انتظامی امور سے ہے، بعض غیر مسلم پرسنل لاء سے متعلق ہیں اور کچھ سفارشات وہ ہیں جو مسلم پرسنل لاء سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم ثالث الذکر سفارشات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں کہ (پھر اس کے بعد اس پر تبصرہ ہو گا) وہی سفارشات بحث و غور کا موضوع بنی ہوئی ہیں کیونکہ ان سے مسلمانوں کی اُس عائلی زندگی کے نقشے کے زیروزبر ہونے کا امکان ہے جو چودہ سو سال سے اسلامی معاشرے میں چلا آ رہا ہے۔

خلاصۂ سفارشات

① میاں بیوی میں نباہ کی صورت نہ ہو تو معاوضہ پر عدالت کی بھی وساطت کے بغیر بیوی ''خلع'' کر سکتی ہے ہاں، وہ چیئر مین کو ایک نوٹس دے کہ اُس معاوضے کی رقم کا تعین کیا جائے جو وہ اپنے شوہر کو ادا کرے گی۔

② چیئر مین معاوضے کی رقم کا تعین کرنے کے بعد مصالحتی کارروائی کا آغاز کرے گا اور اگر مصالحت ناکام ہو جائے تو نوٹس کی تاریخ سے نوّے دن کے انقضا یا وضع حمل کے بعد جو بھی بعد میں ہو، شادی فسخ ہو جائے گی۔ کمیٹی مزید سفارش کرتی ہے کہ خلع کے لیے معاوضے کا تعیُّن کرنے کے معاملے میں اپیل کا ایک حق ہونا چاہیے۔

③ طلاق کے مُؤثر ہونے پر اگر شوہر ایک ماہ کے اندر مہر ادا نہ کرے اور یا اس کا جہیز واپس نہ کرے تو اسے تین ماہ کی مدت کے لیے قید محض یا جرمانہ یا دونوں سزاؤں کا

مستوجب قرار دیا جائے۔

④ اگر زوجہ شادی کے بعد 5 سال یا زیادہ کے لیے اپنے شوہر کے ساتھ رہ چکی ہو، تب شوہر کی طرف سے طلاق کے مؤثر ہو جانے کی صورت میں وہ شوہر کی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ میں 1/8 حصہ وصول کرنے کی مستحق ہو گی۔

⑥ شوہر اور زوجہ کے درمیان عدالت سے باہر مصالحت کے لیے عدالت ہائے عائلی ایکٹ میں احکام وضع کیے جائیں۔ عائلی عدالت فریقین کی طرف سے مشترکہ درخواست پر ان اشخاص میں سے کسی کو جس کا نام ضلع جج کی تیار کردہ بہبود کی فہرست میں موجود ہو۔ مصالحت کنندہ کے طور پر کام کرنے کے لیے نامزد کرے۔ بایں طور پر نامزد کردہ شخص کو حکم دیا جائے کہ ایک ماہ کے اندر اپنی مصالحتی کوششوں کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں عدالت کو رپورٹ پیش کرے۔ اس صورت میں کہ وہ اپنی مصالحتی کوششوں میں ناکام ہو جائے، اسے نہ تو اہل گواہ سمجھا جائے اور نہ اس کی رپورٹ کو شہادت کا حصہ بنایا جائے۔

⑦ جب شوہر یا اس کے رشتے دار دانستہ طور پر زوجہ کے والدین بچوں، بھائیوں یا بہنوں سے ملنے سے روکیں تو اُسے ایسا جُرم قرار دیا جائے جو تین ماہ کی مدت تک قید یا جُرمانہ یا دونوں سزاؤں کا مستوجب ہو۔ مذکورہ بالا جرم کے لیے شوہر کو سزا دہی کی صورت میں، زوجہ اسے انفساخِ ازدواج کے عذر کے طور پر استعمال کر سکے گی۔

⑧ بچوں کی ولدیت یا تحویل سے متعلق مقدمات میں اگر کسی عورت کی پاکدامنی یا کردار پر الزامات عائد کیے جائیں اور اگر ایسے الزامات جھوٹے ثابت ہوں تو عدالت کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ متعلقہ فریق کو اظہارِ وجوہ کا موقع دینے کے بعد چھ ماہ کی مدت تک قید محض یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دے سکے۔

⑨ مجموعۂ ضابطہ فوجداری کی دفعہ 544 الف میں مناسب ترمیم کی جائے تاکہ زنا بالجبر یا

عورت کی بے حرمتی کرنے کے جُرم کے لیے کسی شخص کو سزا دینے والی عدالت اس عورت کو معقول معاوضہ دلا سکے جس کی نسبت ارتکابِ جرم ہوا ہو۔

⑩ اسقاطِ حمل کو جائز اور مزید وُسعت دینے کے لیے کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 312 میں بحسب ذیل ترمیم ہونی چاہیے۔

(ا) دفعہ 312 میں دوسری مرتبہ آنے والے لفظ ''عورت'' کے بعد الفاظ ''یا اس کی جسمانی یا ذہنی صحت کو درپیش سنگین خطرے کے تدارک کے لیے'' شامل کر دیے جائیں اور

(ب) اس دفع میں ایک اور تشریح کا اضافہ کر دینا چاہیے۔ جس میں یہ قرار دیا گیا ہو کہ اس دفعہ کی اغراض کے لیے ایک سو بیس (120) دن سے کم کا جنین، بچہ تصور کیا جائے گا۔

⑪ سماجی تحفظ ملازمین آرڈی نینس 1965ء کے تحت سماجی تحفظ اسکیم کے ذریعے تمام شہروں میں سرکاری پرورش گاہوں، دن کے وقت دیکھ بھال کرنے والے مراکز اور نرسریوں کے قیام کے لیے اہتمام کیا جائے۔

ان کارخانوں میں ملازم خواتین کو بھی انتفاعات میسر ہوں جہاں دس سے زائد اشخاص ملازم ہوں۔ یہ انتفاعات زچگی تین سے زائد زچگیوں کے لیے نہیں دیے جانے چاہئیں۔

⑫ ہر ایک مقامی سرکاری ادارے کی کُل رکنیت کا 25 فیصد خواتین کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔

ہر سیاسی جماعت کے لیے لازمی قرار دیا جائے کہ اگر وہ 10 یا اس سے زائد امیدوار کھڑے کریں تو ایسے امیدواروں میں سے کم از کم 10 فیصد خواتین ہونی چاہئیں۔

⑬ وراثت کے سلسلے میں داخل خارج اندراج کی تصدیق افسر مال گزاری اُن صداقت ناموں کی بنیاد پر کرے جو عدالتِ دیوانی کی طرف سے جاری کیے گئے ہوں جن میں

متوفی مالک کے وارثوں کے نام درج ہوں۔

⑭ کسی حاکم مجاز کو کسی عورت کی طرف سے خواہ ورثہ میں پانے پر یا بصورتِ دیگر، کسی جائیداد میں حصہ ترک کرنے کے مضمون کا کوئی بیان قبول نہیں کرنا چاہیے تاوقتیکہ مذکورہ بیان کی کسی سول جج کی طرف سے تصدیق نہ کر دی گئی ہو۔

⑮ آخر میں خاندانی منصوبہ بندی کے لیے سفارشات پیش کی گئی ہیں جن میں ایک سفارش یہ بھی ہے کہ مردوں کے لیے شادی کی کم از کم عمر 18 سال سے بڑھا کر 21 سال کر دینی چاہیے۔

مذکورہ ''حقوقِ نسواں کمیٹی'' کی سفارشات کا شرعی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے ایک سرسری جائزہ

یہ کمیٹی جن حضرات وخواتین پر مشتمل ہے، ان پر ایک نظر ڈالنے سے خوب اندازہ ہو سکتا ہے کہ حکومت عورتوں کو اسلام کے عطا کردہ حقوق دینے کی خواہاں نہیں بلکہ ان کو ایسے ''حقوق'' دینے کے لیے مضطرب ہے جو بیگمات کو مغربی معاشرے میں حاصل ہیں کیونکہ اگر اس کا مقصد اسلام کے مطابق عورتوں کے حقوق کا تعین اوران کی حفاظت ہوتا تو کمیٹی کے ممبر سب کے سب اگر علومِ دین سے بہرہ ور نہ بھی ہوتے تب بھی چند ایسے علمائے دین کو تو اس کمیٹی میں شامل کر دیا جاتا جو شریعت کے عطا کردہ حقوق کی صحیح صحیح وضاحت کر سکتے ہیں مگر کمیٹی کے مذکورہ ممبران میں کوئی بھی معروف اور مسلمہ معنوں میں عالم دین نہیں ہے۔

غالبًا یہی وجہ ہے کہ اس کمیٹی نے اسلام کے احکام کو بالکل نظر انداز کر کے محض مغرب زدگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اول تو کسی بھی مسئلے میں قرآن وحدیث کے حوالوں کی ضرورت نہیں سمجھی گئی لیکن اگر ایک آدھ مسئلے میں یہ تکلف کیا بھی گیا ہے تو غلط طریقے سے، یعنی آیت وحدیث کے حوالے سے بات اپنی کشید کی گئی ہے جو آیت وحدیث سے ثابت شدہ مسئلے کے بالکل برعکس ہے وہی یہودیوں کا انداز ﴿يَكْتُبُونَ الْكِتَٰبَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ﴾ (اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھ کر کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف

سے ہے) اس اعتبار سے سفارشات کا یہ انداز اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ حکومت ''حقوقِ نسواں'' کے خوش نما عنوان سے عورت کو بے پردہ کرنے کے بعد اسے یورپ کی ڈگر پر ڈالنا چاہتی ہے جس کے نتیجے میں وہ خود اخلاق باختگی کے جہنم میں جھلس رہا ہے اور وہ اب اس سے بے زار ہے، نیز عورت کو اسلام کے تصورِ عفت و عصمت سے بھی محروم کرنا چاہتی ہے اور اسے مغربی عورتوں کی سی آزادی دے کر اُس عائلی نظام کو درہم برہم کرنا چاہتی ہے جو چودہ سو سال سے اسلامی معاشرے میں چلا آ رہا ہے جس کی وجہ سے ہزار خرابیوں کے باوجود ابھی اسلامی معاشرے میں حیا و عفت کی قدریں موجود ہیں اور اکثر و بیشتر حالات میں عائلی زندگی پُرسکون اور پُرمسرت ہے، پھر ان سفارشات سے ارکانِ کمیٹی کا یہ ذہن بھی کھل کر سامنے آ جاتا ہے کہ وہ اسلام کے اُن حقوق پر مطمئن نہیں جو اسلام نے عورتوں کو دیے ہیں، نہ وہ اُن حدود و ضوابط کو اہمیت دیتے ہیں جو صنفِ نازک کے لیے اسلام نے مقرر کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ارکانِ کمیٹی نے عورتوں کے لیے کئی ایسی سفارشات کی ہیں جن سے وہ مغربی معاشرے کی عورتوں کی سطح پر آ جائیں اور ایسی کوئی سفارش اس کمیٹی نے نہیں کی جن سے وہ اسلامی اخلاق و کردار سے مُتّصف ہو سکیں اور انھیں اسلامی حدود و ضوابط کا پابند بنایا جا سکے۔

افسوس! ارکانِ کمیٹی غالبًا علمائے اسلام کو عورتوں کا دشمن سمجھتے ہیں یا کم از کم عورتوں کو یہ تأثر دینا چاہتے ہیں جیسے کمیونسٹ، علماء کو مزدوروں اور غریبوں کا دشمن باور کراتے ہیں، حالانکہ علماء کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ سوشلسٹ نظریات کو اسلام باور کرنے کے لیے تیار نہیں ورنہ علماء سے زیادہ غریبوں اور مزدوروں کا حامی کوئی نہیں۔ بالکل اسی طرح مغرب زدہ افراد یہ تأثر دینے کی مذموم سعی کر رہے ہیں کہ علماء عورتوں کو پسماندہ اور اپنے حقوق سے بے شعور رکھنا چاہتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے، ان کی بھی مائیں، بہنیں، بیٹیاں اور

بیویاں ہیں وہ کب چاہیں گے کہ ان کی یہ مستورات ظلم و ستم کا شکار ہوں؟ ان کے سینوں میں دل کی جگہ پتھر کی سِل تو نہیں کہ وہ معاشرے میں اپنی بہن بیٹیوں پر ظلم ہوتے دیکھیں اور اُف نہ کریں؟ دراصل علماء کا قصور یہ ہے کہ وہ مسلمان عورت کو مغربی عورتوں کی طرح ترت پھرت دیکھنا پسند نہیں کرتے، انھیں فیکٹریوں اور کارخانوں میں حصول معاش کی فکر میں سرگرداں دیکھنا نہیں چاہتے اور انھیں ان کا شمعِ محفل بننا گوارا نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اسلام نے عورتوں کے لیے ان تمام چیزوں کو ناپسند کیا ہے۔ اسلام نے عورت کو معاشی مشین کا کل پُرزہ نہیں بلکہ گھروں کا محافظ اور اولاد کا مربی بنایا ہے، علماء انھیں اسی منصب و مقام پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اسلام کی ہدایات کے مطابق انھیں صرف چراغِ خانہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ علماء کے اس طرزِ فکر و عمل کو عورت دشمنی قرار دینا بالکل کمیونسٹوں کی تکنیک ہے کہ وہ علمائے اسلام کو سوشلسٹ نظریات کی مخالفت کی بنا پر غریب دشمن اور مزدور کش باور کراتے ہیں۔ بہر حال علمائے اسلام عورتوں کے دشمن نہیں، وہ عورتوں کو وہ تمام حقوق دینا پسند کرتے ہیں جو اسلام نے ان کو دیے ہیں، چنانچہ قانون انفساخ نکاح 1949ء علمائے کرام ہی نے بنوایا تھا، البتہ ''حقوقِ نسواں'' کے نام پر مغرب زدگی کی اجازت علماء کبھی نہیں دیں گے کیونکہ ایسا کرنا عورتوں کے ساتھ دوستی نہیں، سخت دشمنی ہو گی۔ ''حقوقِ نسواں کمیٹی'' کی تازہ سفارشات اسی انداز کی ہیں کہ ان پر عمل درآمد کی صورت میں۔

ہماری مسلمان عورتیں مغربی عورتوں کی طرح آزاد، بے پردہ اور اقتصادی مشین کا کل پُرزہ ہو کر رہ جائیں گی اور یہ چیز بالآخر اسلامی معاشرے میں فساد کا باعث ہو گی۔ باخبر لوگ جانتے ہیں کہ مغربی معاشرہ اس وقت مرد و زن کی مساوات پر عمل کرنے کی بنا پر کن مشکلات اور پیچیدگیوں کا شکار ہے۔ علمائے اسلام نہیں چاہتے کہ وہی پیچیدہ حالات یہاں

بھی پیدا ہوں۔

اب ہم مختصراً مذکورہ سفارشات کے متعلق بتلاتے ہیں کہ وہ کیوں کر غیر اسلامی ہیں اور ان سے معاشرتی اصلاح کے بجائے کیوں کر معاشرتی بگاڑ پیدا ہوگا؟ سب سے پہلا مسئلہ خلع کا مسئلہ ہے جس میں ارکانِ کمیٹی نے اسلامی نقطۂ نظر کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔

مسئلۂ خلع اور کمیٹی کی سفارش

اسلام میں قوامیت کی بنا پر طلاق کا حق صرف مرد کو حاصل ہے، البتہ عورت کے لیے یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ اگر وہ کسی بھی جائز وجہ سے مرد سے علیحدہ ہونا چاہتی ہے تو وہ خلع کرا سکتی ہے لیکن حق خلع کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بیوی کو یکطرفہ خلع کا حق حاصل ہے لیکن کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ بیوی یک طرفہ طور پر مرد سے علیحدگی کا فیصلہ کر کے اس کو نافذ کر سکتی ہے۔ اس میں کسی بھی تیسرے شخص کی مداخلت کی ضرورت نہیں، خواہ وہ کوئی قاضی ہو یا ثالث.........، البتہ معاوضے میں اختلاف ہو تو صرف معاوضے کی تعیین یا اس کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی تیسرے شخص کو مداخلت کا حق ہوگا۔

کمیٹی کی رپورٹ میں ایک آیت اور ایک حدیث سے ''کام نکالنے'' کی بھی کوشش کی گئی ہے، حالانکہ نہ آیت کا وہ مطلب ہے نہ حدیث کا جو ارکانِ کمیٹی نے ان سے کشید کیا ہے۔ ان سے تو خلع کا وہی مفہوم نکلتا ہے جو ہم نے شروع میں بیان کیا ہے، چنانچہ جس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے:

﴿وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ شَیْئًا اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ﴾

اس کا ترجمہ رپورٹ میں یہ درج کیا گیا ہے جو مولانا اشرف علی تھانوی سے منسوب ہے۔

"اور تمھارے لیے یہ بات حلال نہیں کہ (چھوڑنے کے وقت) کچھ بھی لو (گو) اس میں سے (سہی) جو تم نے ان کو (مہر) میں دیا تھا مگر یہ کہ میاں بیوی دونوں کو احتمال ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ضابطوں کو قائم نہ کرسکیں گے۔ سو اگر تم لوگوں کو یہ احتمال ہو کہ وہ دونوں ضوابط خداوندی قائم نہ کرسکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا اس (مال کے لینے دینے) میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑا لے۔"[1]

اس آیت کریمہ اور اس کے ترجمہ کے خط کشیدہ الفاظ میں زوجین کے علاوہ دوسرے لوگوں سے خطاب ہے جس کے صاف معنی یہی ہیں کہ اگر میاں بیوی کے تعلقات اس نہج پر پہنچ جائیں کہ ان میں نباہ کی کوئی صورت نہ رہے اور از خود بھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے تو دوسرے لوگ آگے بڑھ کر ان کا "خلع" کرا دیں۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کے دور کا جو واقعہ کمیٹی کی رپورٹ میں بطور استشہاد پیش کیا گیا ہے، وہ حسبِ ذیل ہے:

"ایک دن جمیلہ بنت عبداللہ بن اُبی ابن سلول رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہا "یا رسول اللہ! میں اور ثابت (اس کا خاوند) ایک ساتھ نہیں رہ سکتے ہیں میں نے اس کو دیکھا آتے ہوئے چند آدمیوں کے ساتھ، وہ سب سے زیادہ کالا تھا ان لوگوں میں۔ اور سب سے زیادہ کوتاہ قد تھا اور سب سے زیادہ بدصورت تھا۔ خدا کی قسم! میں عیب نہیں لگاتی ہوں اس کی دینداری میں اور نہ اخلاق میں۔ لیکن میں اس کی بدصورتی کی وجہ سے اس سے نفرت کرتی ہوں۔ خدا کی قسم! اگر مجھے خدا کا خوف نہ ہوتا تو میں اس کے منہ پر تھوک دیتی جب وہ میرے پاس آئے (مطلب یہ ہے کہ وہ اس کی شکل سے نفرت کرتی تھی) یا رسول اللہ! آپ دیکھتے ہیں کہ میں کتنی خوبصورت ہوں، جبکہ ثابت بہت بدصورت آدمی ہے۔ میں اس کے نیک برتاؤ اور خوبیٔ دین میں کچھ عیب نہیں لگاتی لیکن حالتِ اسلام میں

---

1. البقرة 2:229.

کفر (ناشکری) کو برا جانتی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تو اپنے شوہر کا باغ لوٹا دے گی (جو ثابت نے اسے بطور مہر دیا تھا) تو اس نے جواب دیا ''ہاں'' اور کچھ زیادہ بھی اگر وہ اس کا مطالبہ کرے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اما الزیادة فلا . اس سے زیادہ نہیں جو اس نے تجھے دیا تھا۔'' آنحضرت ﷺ نے ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ''باغ لے لو اور اس کو ایک طلاق دے دو'' انھوں نے ایسا ہی کیا۔''

یہ واقعہ درج کر کے سفارشات کے مُرتبین اس سے اپنی بات بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

''متذکرہ بالا حدیث سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی ہے کہ یہ زوجہ کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ خلع کے ذریعے انفساخ ازدواج طلب کرنے کے لیے اپنا حق ثابت کرے......، (اس لیے) کمیٹی کا خیال ہے کہ ایسی کوئی وجہ نہیں کہ کسی مسلمان زوجہ کو یہ ثابت کرنے کے لیے کسی عدالت کے روبرو جانے کے لیے مجبور کیا جائے کہ وہ اور اس کا شوہر اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود میں زندگی نہیں گزار سکتے......۔''

حالانکہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت جمیلہ رضی اللہ عنہا کا جو واقعہ اوپر نقل کیا گیا ہے اس سے صاف واضح ہے کہ بیوی ازخود یک طرفہ طور پر خاوند سے علیحدگی کا فیصلہ نہیں کرسکتی اگر ایسا ہوتا تو جمیلہ کو اپنا مقدمہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، وہ ازخود اپنا فیصلہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ (اپنے خاوند) کو سنا دیتیں، اسی طرح آنحضرت ﷺ بھی اس کے خاوند کو یہ نہ کہتے کہ اس سے باغ لے لو اور اس کو ایک طلاق دے دو، بلکہ ان کی بیوی (جمیلہ) سے کہتے کہ تمھیں ازخود اس سے علیحدہ ہونے کا حق حاصل ہے، کسی تیسرے شخص (ثالث یا عدالت) کی مداخلت کی اس میں ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جمیلہ نے ازخود گھر بیٹھے ثابت سے علیحدگی اختیار نہیں کی بلکہ اپنے وقت کے سب سے بڑے قاضی کے سامنے اپنا معاملہ پیش کیا، پھر

آنحضرت ﷺ نے بھی ثابت کو یہ کہہ کر کہ ''اس کو ایک طلاق دے دو'' اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ ''طلاق'' علیحدگی کا فیصلہ کرنا مرد کا حق ہے، وہ اگر عورت کو علیحدہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا تو پھر عدالت اس کو ایسا کرنے کا حکم دے گی۔ بہر حال خلع کا یہ مفہوم جو ارکانِ کمیٹی نے پیش کیا ہے کہ بیوی کسی کی وساطت کے بغیر ازخود علیحدگی کے فیصلے کا آزادانہ اعلان کر سکتی ہے، یکسر غلط ہے۔ اس طرح عورت کو حق طلاق ''عطا'' کرنے کی یہ ناکام کوشش ہے جبکہ وہ صرف مرد ہی کو حاصل ہے۔ خدانخواستہ اس کو قانونی شکل دے دی گئی تو اس سے اسلامی معاشرے میں سخت انتشار برپا ہو جائے گا۔

اس لیے ہم ارکانِ کمیٹی سے عرض کریں گے کہ اسلام نے بیوی کو جو خلع کا حق دیا ہے اور جو ہمارے آئین میں پہلے سے موجود ہے، اس میں ہرگز خلافِ شریعت ترمیمات کرنے کے گناہ کا ارتکاب نہ کریں خلع کا وہی مفہوم درست ہے جو چودہ سو سال سے مسلم چلا آ رہا ہے۔ خلع کی ایسی خطرناک تعریف نہ کریں جو رپورٹ میں کی گئی ہے جس کی رُو سے ہماری مسلمان عورتوں کو مغربی عورتوں سے بھی زیادہ حق آزادی مل جاتا ہے، مغربی عورت کو، پھر بھی مرد سے گلو خاصی حاصل کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کرنا پڑتا ہے، آپ کی خود ساختہ تعریف سے تو علی الاطلاق بیوی کو آزادی مل سکتی ہے جس کو دنیا کا کوئی بھی مذہب تو درکنار عقل صحیح بھی گوارا نہیں کر سکتی۔

''خلع'' کے بعد مصالحت......؟

''خلع جدید'' سے متعلقہ دفعات میں بعض عجیب وغریب سفارشات کی گئی ہیں، مثلاً: چیئرمین کی طرف سے معاوضے کی رقم کے تعین کے بعد مصالحتی کارروائی کا آغاز، اس مصالحت میں ناکام ہو جانے کی صورت میں نوٹس کی تاریخ سے نوے دنوں کے انقضا یا وضع حمل کے بعد جو بھی ہو، فسخ نکاح یا معاوضہ متعینہ کے معاملے میں اپیل کا حق وغیرہ وغیرہ۔

ان دفعات پر بحث اس لیے غیر ضروری ہے کہ خلع کے مسئلے میں ہی کمیٹی نے غلط موقف اختیار کیا ہے، جب اصل مسئلے میں صحیح مسلک اختیار کر لیا جائے گا تو اس سے متعلق دوسرے امور کی اصلاح کوئی مشکل امر نہیں۔ ویسے بعد کی ان دفعات سے کمیٹی کا ذہنی انتشار اور تضاد نمایاں ہو جاتا ہے کہ ایک طرف وہ خلع میں کسی کو بھی مداخلت کا حق دینے کے لیے تیار نہیں کہ جس سے تفریقِ زوجین سے قبل مصالحت کی کوئی صورت ممکن ہو سکے لیکن جب کمیٹی کے عطا کردہ اختیار کی رُو سے بیوی خاوند سے بذریعہ ''خلع جدید'' علیحدگی اختیار کرے تو پھر مصالحت کے امکان کو تسلیم کر کے چیئرمین کو مصالحت کا اختیار دیا جا رہا ہے، حالانکہ شریعت کی رو سے خلع طلاق بائن کا حکم رکھتا ہے جس کے بعد مصالحت کی گنجائش ہی ختم ہو جاتی ہے گویا جس مرحلے میں شریعت مصالحت کی کوششوں کو روا رکھتی ہے، اس مرحلے پر تو مصالحت کا راستہ مسدود کیا جا رہا ہے اور جب مصالحت کی تمام صورتیں ازروئے شریعت ناممکن ہو گئیں تو پھر مصالحت کے لیے سلسلۂ جنبانی کا حق دیا جا رہا ہے۔ چہ خوب؟ ظاہر بات ہے کہ کمیٹی کا یہ اندازِ فکر اس بات کی صاف غمازی کرتا ہے کہ کمیٹی کے ارکان شریعت اسلامیہ سے زیادہ واقف نہیں یا پھر وہ شریعت کو چنداں اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں جو بھی صورت ہو، بہر حال یہ واضح ہے کہ جب تک بغیر کسی ذہنی تحفظ کے ماہرین شریعت وعلمائے اسلام کی آراء کو، جو نصوص پر مبنی ہیں، کوئی اہمیت نہیں دی جائے گی۔ عورتوں کو اسلام کے مطابق حقوق عطا کرنے کا دعوی ایک فریب کے سوا کچھ نہیں۔

مہر یا جہیز کی عدم ادائیگی کی سزا......؟

طلاق کے بعد بیوی کو بعض وقت مہر کی وصولی اور جہیز کی واپسی کے سلسلے میں ''بڑی مشکلات'' کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ عدالتوں تک جانے کی بھی نوبت آ جاتی ہے بیوی کو اس ''مشکل'' سے نکالنے کے لیے کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ طلاق کے مؤثر ہونے پر اگر

شوہر ایک ماہ کے اندر مہر ادا نہ کرے یا اس کا جہیز واپس نہ کرے تو اسے تین ماہ کی مُدّت کے لیے قید محض یا جرمانہ یا دونوں سزاؤں کا مستوجب قرار دیا جائے۔

جہاں تک مہر کی ادائیگی کا معاملہ ہے اس کی ادائیگی کے لیے ایسا اہتمام ضرور کیا جانا چاہیے جس کی رو سے ہر بیوی اپنا یہ شرعی حق بآسانی وصول کر سکے، اس لیے کہ شریعت نے بیوی کے اس حق کی بڑی تاکید کی ہے۔ لیکن اس کو فوجداری جُرم بنانے کے لیے قرآن و حدیث اور تعامل سلف سے دلیل لانی چاہیے از خود شریعت سازی کا کوئی جواز نہیں، اس طرح فقۂ اسلامی بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گی، پھر جہیز کو بھی مہر کے ساتھ نتھی کر کے اس کی عدم ادائیگی کو فوجداری جرم بنا دینا تو یکسر غیر معقول ہے۔ ایک تو اس لیے کہ مروجہ جہیز کوئی شرعی مسئلہ نہیں، یہ موجودہ صورت میں ہندوانہ رسم ہے، ثانیاً جہیز کی بعینہ واپسی بڑی مشکل بات ہے۔ جہیز عام طور پر ایسی اشیاء پر مشتمل ہوتا ہے جو گھروں میں عام استعمال میں آتی ہیں۔ ان کو اس طرح سنبھال کر کوئی نہیں رکھتا کہ کل کلاں کو اگر بیوی سے ناچاقی اور علیحدگی ہو گئی تو یہ سارا سامان بحفاظت واپس کرنا ہوگا، اس لیے اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی معاشرے سے جہیز کے غلط رواج کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے اور بیویوں کو وراثت میں حصہ دلانے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جائے کیونکہ جہیز کو ہندوؤں کی طرح وراثت ہی کا بدل سمجھ لیا گیا ہے اور زیادہ سے زیادہ جہیز دینے کے پیچھے عام طور پر یہی ذہن کارفرما ہوتا ہے۔

مطلقہ کو جائیداد کا حصہ؟

طلاق کی کثرت کو روکنے کے لیے کمیٹی نے جو سفارش کی ہے، وہ ذہنی اختراع کا عجیب وغریب شاہکار ہے۔ کمیٹی نے سفارش کی ہے:

اگر زوجہ شادی کے بعد پانچ سال یا زیادہ کے لیے اپنے شوہر کے ساتھ رہ چکی ہو تب

شوہر کی طرف سے طلاق کے مؤثر ہو جانے کی صورت میں وہ شوہر کی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ میں 1/8 حصہ وصول کرنے کی مستحق ہوگی۔

کمیٹی کی یہ سفارش بھی خالص مغربی (یورپی) ذہن کی آئینہ دار ہے کیونکہ یورپ میں ہی یہ رسم ہے کہ مطلقہ بیوی (چاہے طلاق خاوند نے دی ہو یا بیوی نے حاصل کی ہو) اپنے خاوند سے ایک معقول رقم وصول کرتی ہے۔ اسی چیز کو کمیٹی نے 1/8 حصہ کا عنوان دے کر یہ تأثر دینے کی ناکام کوشش کی ہے کہ یہ سفارش قرآن و حدیث پر مبنی ہے، حالانکہ قرآن مجید میں حصے کی صورت بطور وراثت ہے جس کا مرحلہ خاوند کی وفات کے بعد آ سکتا ہے، یعنی یہ کہ اگر خاوند مر جائے اور وہ صاحب اولاد ہو تو اس کی بیوہ کو خاوند کی جائیداد میں سے 1/8 حصہ ملے گا۔ ''زندہ خاوند'' پر (خواہ وہ طلاق بھی دے دے) اس حکم کو لاگو کرنے والے پیپلز پارٹی کی حکومت کے مقرر کردہ ارکانِ کمیٹی کون ہوتے ہیں جبکہ قرآن میں ردوبدل کرنے کا حق آنحضرت ﷺ کو بھی نہ تھا، پھر ان ''لیڈیز اور جنٹلمین'' حضرات کو یہ حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ اور وہ کس طرح اس بات کے مجاز ہیں کہ وہ قرآن میں مذکورہ صورت کے حکم کو کسی دوسری جگہ لاگو کرنے کی سفارش کریں؟

تعجب ہے کہ یہ موٹی سی بات ہمارے ان بزرجمہروں کی عقل میں نہ آ سکی (یا عمداً معاشرے کو فتنہ و فساد اور بگاڑ کی راہ پر ڈالنے کے لیے ایسا کیا ہے) کہ اس تجویز سے طلاق کا سلسلہ رکنے کی بجائے اور بڑھے گا کیونکہ مشاہدہ یہ ہے کہ لوگ بالعموم لڑکیوں کو وراثت میں حصہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور بھائی، والد کے مرنے کے بعد اکثر و بیشتر بہنوں کے حصے پر بھی خود ہی قابض رہتے ہیں تو پھر لوگ مطلقہ عورت کو، جس سے مرد کا، پھر نہ صرف کوئی تعلق باقی نہیں رہتا بلکہ آپس میں بالعموم سخت دشمنی ہو جاتی ہے، کیوں کر اپنی جائدادوں میں سے 1/8 حصہ دینے کے لیے تیار ہوں گے؟ پھر یا تو یہ ہوگا

کہ لوگ پانچ سال کی مدت پوری ہونے سے قبل ہی ان عورتوں کو اپنے سے علیحدہ کرنا پسند کریں گے جن سے ان کے ازدواجی تعلقات زیادہ خوشگوار نہ ہوں۔ پانچ سال کی جو تلوار ان کے سر پر لٹک رہی ہوگی، وہ دوسرے پہلوؤں سے ان کی توجہ ہٹا کر اس طرف زیادہ مبذول کردے گی کہ اگر پانچ سال سے پہلے پہلے میں نے اپنی بیوی سے گلوخلاصی حاصل نہ کی تو یہ تو میری جائیداد کی حصہ دار بن جائے گی، چنانچہ وہ اس کو فوراً طلاق دینے کی سوچے گا یا پھر لوگ طلاق ہی نہ دیں گے چاہے طلاق ناگزیر ہوگئی ہو کیونکہ بعض حالات میں طلاق کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں رہتا، اسی لیے شریعت نے اگرچہ طلاق کو سخت مذموم سمجھا ہے اور اس کے متعلق آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ "حلال چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض (ناپسندیدہ) اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔" لیکن چونکہ بعض حالات میں طلاق دینے کی مجبوری ہو جاتی ہے، اس لیے طلاق پر بالکل قدغن بھی نہیں لگائی گئی اور ان خاص حالات میں طلاق دے کر گلوخلاصی حاصل کی جاسکتی ہے۔

علاوہ ازیں کمیٹی کی سفارش کی وجہ سے متعلقہ بیوی کو طلاق کے فوراً بعد جائیداد میں سے 1/8 حصہ خاوند کو دینا پڑے گا، چاہے اس کے مرنے تک اس کے پاس کچھ نہ رہے اور اصل وارثوں کو کچھ نہ ملے لیکن ایسی عورت جائیداد میں سے حصہ وصول کر بھی چکی ...... ہوگی جو شرعاً وارث ہی نہیں ہے، اس طرح اصل وارثوں کی حق تلفی ہوگی، یہ یقیناً ایک ظلم ہے اس ظلم کا ذمہ دار کون ہوگا؟ اس طرح ظلم کی کئی صورتیں نکل آتی ہیں، مثلاً: طلاق دینے والے شخص نے بعد میں مزید دو عورتوں سے شادیاں کی ہوں اور وہ آخر وقت تک اس کے حبالۂ عقد میں رہ کر اس کی شرعی وارث بن گئی ہوں تو اس صورت میں شوہر کی جائیداد میں سے 1/8 حصہ دونوں پر تقسیم ہوگا اور ہر بیوی کو 1/16، 1/16 حصہ ملے گا جو

مطلقہ عورت کے حصے سے نصف ہے۔ یہاں بھی اصل وارثوں کو تو تھوڑا ملا اور جو شرعی وارث ہی نہیں، وہ زیادہ حصہ مار لے جائے گا، یہ بھی ظلم ہے، اسی طرح کسی شخص کی خاص جائیداد ہی نہیں ہے۔ صرف مختصر اور محدود سا مکان ہے یا ایسا چھوٹا موٹا کاروبار ہے کہ جس سے روزانہ کے اخراجات کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل سکتا، ایسے شخص سے 1/8 حصہ لے کر مطلقہ کو دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے کاروبار کو ٹھپ کر کے یا اپنے مکان کو فروخت کر کے یہ جبری حصہ ادا کرے۔ دونوں صورتوں میں ایسے شخص کی خانہ بربادی لازم ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کی سرے سے کوئی جائیداد ہی نہ ہو تو اس صورت میں حکومت مطلقہ بیوی کو کیا دلوائے گی؟ ان کے علاوہ کئی معاشرتی قباحتیں بھی پیدا ہوں گی۔ بہر حال جس لحاظ سے بھی دیکھا جائے ''حقوق نسواں کمیٹی'' کے ارکان کا یہ ''اجتہاد'' مداخلت فی الدین کے ناقابل معافی جرم کے علاوہ ایسی کئی متعدد قباحتوں کا باعث ہوگا جس سے بعد میں نمٹنا سخت مشکل ہوگا۔

مطلقہ کے لیے نان ونفقہ؟

بزعمِ خویش طلاق کو روکنے کے لیے کمیٹی نے ایک سفارش یہ کی ہے:

''شوہر کی طرف سے طلاق کی صورت میں اسے حکم دیا جائے کہ عدت کے زمانے کے علاوہ شادی شدہ زندگی کے ہر سال کے لیے ایک ماہ کے حساب سے شمار کی جانے والی مدت کے لیے اپنی سابقہ زوجہ کو نان ونفقہ ادا کرے۔''

اس بے معنی سی عبارت کا بظاہر یہ مطلب ہے کہ جتنے سال وہ اور اس کی مطلقہ بیوی ایک ساتھ رہے ہیں اتنے اور رشتۂ ازدواج کے انقطاع کے بعد نان ونفقہ ادا کرے، اگر دس سال ساتھ رہے ہیں تو دس ماہ کا نفقہ 20 سال رہے تو 20 ماہ کا نفقہ اور پانچ سال رہے ہیں تو پانچ ماہ کا نفقہ اسے دے۔ لیکن نان ونفقہ کی یہ صورت بھی ارکانِ کمیٹی کی خود

ساختہ اور شریعت کے منافی ہے۔ شریعت کی رو سے مطلقہ عورت کا یہ استحقاق ہے کہ عدت کے دوران کا نفقہ اور حاملہ ہونے کی صورت میں وضع حمل تک اور اس کے بعد مدتِ شیر خوارگی تک زچہ و بچہ کا نفقہ خاوند کے ذمے ہے۔ وہ بھی اس صورت میں جبکہ طلاق عدت والی ہو۔ علاوہ ازیں یہ تجویز ہے بھی یکسر غیر معقول۔ ظاہر ہے کہ کسی بیوی کے ایامِ رفاقت بہت زیادہ سالوں پر محیط ہوتے ہیں اور کئی بیویوں کا نباہ چند مہینوں تک ہی محدود ہوتا ہے اور اس کے بعد طلاق ہو جاتی ہے۔ پہلی تو ''سفارش'' کے ذیل میں آ سکتی ہے لیکن دوسری صورت میں کیا ہوگا: معلوم ہوتا ہے کہ ''سفارشات'' کرنے والی عورتیں ہیں جبھی تو جگہ جگہ ان کی ''نقص عقل'' کا پرتو ان میں نظر آتا ہے۔

فریقین کو عدالتی کھکھیڑوں سے بچانے کے لیے کمیٹی کے ارکان نے مصالحت کی درج ذیل صورت تجویز کی ہے:

''شوہر اور زوجہ کے درمیان عدالت سے باہر مصالحت کے لیے عدالت ہائے عائلی ایکٹ میں احکام وضع کیے جائیں۔ عائلی عدالت فریقین کی طرف سے مشترکہ درخواست پر ان اشخاص میں سے کسی کو جس کا نام ضلع جج کی تیار کردہ افسرانِ بہبود کی فہرست میں موجود ہو، مصالحت کنندہ کے طور پر کام کرنے کے لیے نامزد کرے۔ بایں طور نامزد کردہ شخص کو حکم دیا جائے کہ ایک ماہ کے اندر اپنی مصالحتی کوششوں کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں عدالت کو رپورٹ پیش کرے۔''

مصالحت کی یہ تجویز بھی قرآن مجید کے صریح منافی ہے۔ تعجب ہے کہ کمیٹی بار بار ''اسلام'' کا نام لینے کے باوجود ہر معاملے میں قرآن و حدیث (یعنی اسلام) کے خلاف ہی سفارش کی ضرورت کیوں محسوس کرتی ہے؟ اگر مصالحت کی وہی صورت تجویز کی جاتی جو قرآن نے بتلائی ہے تو اس سے اس کی اسلام پسندی کا کسی مقام پر تو ثبوت مہیا ہو

جاتا، بصورتِ موجودہ اس کے ارکان تو اسلام ہی سے الرجک معلوم ہوتے ہیں۔

سُنیے! قرآن حکیم نے مصالحت کی جو صورت تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ زَوجَین کے قریبی رشتے داروں میں سے دو شخصوں کو اس کام کے لیے متعین کیا جائے۔ ایک کا تعلق بیوی کے خاندان سے ہو اور دوسرے کا شوہر کے خاندان سے۔﴿وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا﴾[1] ظاہر بات ہے کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کے سامنے بیوی اپنے شوہر کے حالات اور شوہر اپنی بیوی کے حالات بیان کرنے میں اتنا تأمل نہیں کریں گے جتنا وہ بیگانے افراد کے سامنے بیان کرنے میں کرتے ہیں۔ کمیٹی کی تجویز کردہ صورت میں فریقین کو اپنا معاملہ بیگانے افراد کے سامنے پیش کرنا پڑے گا، اس لیے مصالحت کی وہی صورت ہونی چاہیے جو قرآن حکیم نے بیان فرمائی ہے۔

ایک سفارش کمیٹی نے یہ کی ہے کہ ''جب شوہر یا اس کے رشتہ دار دانستہ طور پر زوجہ کے والدین، بچوں، بھائیوں یا بہنوں سے ملنے سے روکیں تو اسے ایسا جرم قرار دیا جائے جو تین ماہ کی مدت تک قید یا جرمانہ یا دونوں سزاؤں کا مستوجب ہو۔ مذکورہ بالا جرم کے لیے شوہر کو سزا دہی کی صورت میں زوجہ اسے انفساخِ ازدواج کے عذر کے طور پر استعمال کر سکے گی۔''

اگر بعض دفعہ ایسی صورت پیدا ہو جائے اور سنگین صورت اختیار کر جائے تو اس کا کوئی معقول حل نکالا جانا چاہیے لیکن اگر اسے تعزیری اور فوج داری جُرم بنانے ہی پر کمیٹی تلی ہوئی ہے۔ تو اس کے لیے قرآن و حدیث اور تعاملِ سلف سے کوئی دلیل لانی چاہیے تھی۔ دراصل یہ مسئلہ ایسا ہے ہی نہیں کہ اس کے لیے کوئی ''قانون'' بنایا جائے اور قانون بھی ایسا کہ اس کی زد میں صرف شوہر ہی آئے، چاہے اس کے اس اقدام کے لیے معقول وجوہ موجود

[1] النسآء 4:35.

ہوں، عین ممکن ہے کہ شوہر بیوی پر اس قسم کی پابندی، اس لیے عائد کرتا ہو کہ اسے دینی و اخلاقی فساد کا اندیشہ ہو، اس لیے اس قسم کی شکایت کے ازالے کے لیے تعزیری قانون بنانے کی بجائے مصالحتی کمیٹی کی تشکیل زیادہ صحیح ہے کہ وہ شوہر سے مل کر وجوہِ پابندی کی تحقیق کرے، اگر شوہر بلاوجہ بیوی کو اپنے قریبی اعزہ سے ملنے سے روکتا ہے تو اسے ایسا کرنے سے روکے اور اگر اس کے پاس معقول وجوہ ہوں تو وہ بیوی کو ان باتوں سے روکنے کی کوشش کرے جن کی بنا پر خاوند پابندی عائد کرنے پر مجبور ہو۔ یہ مصالحتی وفد بھی قرآن کے اس حکم ﴿ فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ﴾ ہی کے دائرے میں ہو۔

مقدمہ بازی کی صورت میں مرد کی طرف سے بعض دفعہ عورت پر بدکرداری کا جو سنگین الزام عائد کردیا جاتا ہے اس کے سدِّ باب کے لیے کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ

''بچوں کی ولدیت یا تحویل سے متعلق مقدمات میں اگر کسی عورت کی پاکدامنی یا کردار پر الزامات عائد کیے جائیں اور اگر ایسے الزامات جھوٹے ثابت ہوں تو عدالت کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ متعلقہ فریق کو اظہارِ وجوہ کا موقع دینے کے بعد چھ ماہ کی مدت تک قید محض یا جُرمانہ یا دونوں سزائیں دے سکے۔''

یہ سفارش بھی شریعت سازی کے ضمن ہی میں آتی ہے، جب اسلام میں حدِّ قذف (اَسّی کوڑے) موجود ہے تو اپنی طرف سے سزا کی حد مقرر کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ یہ صورت قذف (تہمت زنا) ہی کی ہے اور اس کی وہی سزا تجویز کی جانی چاہیے جو اسلام میں مقرر کی گئی ہے۔

''عصمت'' کا ''مالی معاوضہ''

کمیٹی کی ایک سفارش یہ ہے:

''مجموعۂ ضابطۂ فوج داری کی دفعہ 544 الف میں مناسب ترمیم کی جائے تاکہ زنا

بالجبر یا عورت کی بے حرمتی کرنے کے جُرم کے لیے کسی شخص کو سزا دینے والی عدالت اس عورت کو معقول معاوضہ دلا سکے جس کی نسبت ارتکابِ جرم ہوا ہو۔''

یہ سفارش بھی غلط در غلط ہے۔ اوّلاً اس میں زنا بالجبر اور زنا بالرضا کی وہ تفریق ہے جو یورپ میں پائی جاتی ہے اور اسی کی تقلید میں ہمارے مروجہ قانون میں یہ تفریق کر دی گئی ہے جس کی رُو سے زنا بالرضا جرم ہی نہیں رہتا۔ حالانکہ زنا بہرصورت زنا ہے چاہے وہ بالجبر ہو یا رضا مندی سے، (البتہ اس عورت پر شرعی حد جاری نہیں ہوگی جس کی آبرو ریزی جبرًا کی گئی ہو) کمیٹی نے بھی زنا بالجبر کی تخصیص کر دی ہے جو صریحاً اسلام کے منافی ہے۔ اسلام کی رُو سے زنا مطلقاً حرام اور ناجائز ہے۔ ثانیاً اس میں زانی کے لیے وہ حد تجویز نہیں کی گئی جو قرآن مجید میں بتلائی گئی ہے، یعنی جو شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لیے سنگساری اور غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لیے سو کوڑے کی سزا ہے۔ ثالثًا اسلام میں عصمت دری کے جُرم میں مالی معاوضے کا کوئی تصور نہیں، اسلام میں تو یہ اتنا سخت جرم ہے کہ اس کا ارتکاب اگر کوئی شادی شدہ کرے تو جب تک سرِعام پتھر مار مار کر اس کو ہلاک (رجم) نہ کر دیا جائے، اس سے یہ گناہ دُھل ہی نہیں سکتا اگر اس جرم کا مالی معاوضہ مناسب ہوتا تو شریعت اس کو چھوڑ کر سنگساری کی حد نافذ نہ کرتی۔

بعض لوگوں نے کمیٹی کی اس سفارش کی تحسین کی ہے اور انھوں نے اسے فقہ حنفی کے مسئلۂ عقر پر چسپاں کر لیا ہے، حالانکہ اوّلاً یہ تجویز سراسر اسلامی غیرت وحمیت اور نسوانی وقار کے خلاف ہے، کون مسلمان عورت ہے جو اس طرح اپنی عصمت کا معاوضہ طلب کرنے کے لیے عدالتی چارہ جوئی کے لیے تیار ہوگی؟ اگر مسلمان عورت کو خدانخواستہ اس راہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی تو یقیناً اسلامی معاشرے سے حیا وعفت کا وہ تصور ختم ہو جائے گا جو فطرت انسانی کا تقاضا اور چودہ سو سال سے اسلامی معاشرے کا طرّۂ امتیاز چلا آرہا

ہے اور جس کی اسلام نے بڑی تاکید کی ہے۔ ثانیاً عام زنا کاری کا اس عُقر سے کوئی تعلق نہیں جس کی صراحت فقہ حنفی میں ملتی ہے۔ عُقر کا مطلب وہ مال ہے جو ناجائز جماع کے معاوضے میں عورت کو دیا جائے اور یہ ناجائز جماع کسی شبہے کے سبب سے نادانستہ وقوع میں آیا ہو، یہ فقہائے حنفیہ کے نزدیک گویا ایک طرح سے مہر ہی کی ایک شکل ہے جو بلا ارادہ کسی شبہ کی بنا پر کسی عورت کی آبروریزی کی وجہ سے ادا کرنا پڑے گا، اس کا تعلق اس زنا کاری سے بالکل نہیں ہے جو بالارادہ (بالجبر یا بالرضا) ہو، چنانچہ حدیث میں ہمیں ایک واقعہ ایسا ملتا بھی ہے جس میں نبی ﷺ نے زنا کا مالی معاوضہ قبول کرنے سے انکار فرما دیا تھا، دورِ نبوی ﷺ میں ایک ملازم لڑکے نے اپنے مالک کی بیوی سے زنا کا ارتکاب کرلیا، لڑکے کے باپ نے اس کے عوض سو بکریاں اور ایک لونڈی مالک کو پیش کی لیکن نبی ﷺ نے فرمایا: یہ بکریاں اور لونڈی واپس کردی جائیں گی اور تیرے لڑکے کو سو کوڑوں کی حد (بدنی سزا) جاری کی جائے گی اور (جس شادی شدہ عورت) سے اس نے زنا کیا تھا، اس کو آپ ﷺ نے سنگسار کروا دیا۔[1]

عہدِ نبوی کے اس واقعہ سے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ زنا ایسا جُرم ہے کہ جس کی کوئی تلافی مالی معاوضے سے ممکن نہیں بلکہ اس کی سزا سنگساری یا سو کوڑے ہی ہیں۔ زنا کاری کی اپنی طرف سے کوئی سزا مقرر کرنا یہ وہ شریعت سازی ہے جس کی اسلام میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔

ناجائز اسقاطِ حمل کے...... جواز کی تجویز!

اسقاطِ حمل کو جائز اور عام کرنے کے لیے کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ مجموعۂ تعزیراتِ

[1] صحيح البخاري، كتاب المحاربين من أهل الكفرة والردة...... الخ، ج 6 ص:1011، اصح المطابع کراچی۔

پاکستان کی دفعہ 312 میں بحسب ذیل ترمیم ہونی چاہیے۔

''دفعہ 312 میں دوسری مرتبہ آنے والے لفظ ''عورت'' کے بعد الفاظ ''یا اس کی جسمانی یا ذہنی صحت کو درپیش سنگین خطرے کے تدارک کے لیے'' شامل کر دیے جائیں اور

(ب) اس دفعہ میں ایک اور تشریح کا اضافہ کر دینا چاہیے جس میں یہ قرار دیا گیا ہو کہ اس دفعہ کی اغراض کے لیے 20 دن سے کم کا جنین بچہ تصور نہیں کیا جائے گا۔''

کمیٹی کی اس سفارش کا پورا مفہوم اس وقت تک اچھی طرح واضح نہیں ہوتا جب تک تعزیراتِ پاکستان کی وہ متعلقہ دفعہ بھی سامنے نہ ہو جس میں ترمیم کی سفارش کی گئی ہے۔

یہ دفعہ حسبِ ذیل ہے:۔

''جو فرد بھی ارادتاً و عمداً کسی حاملہ عورت کا حمل گرانے کا باعث بنے گا، اگر یہ اسقاطِ حمل کا فعل نیک نیتی کے ساتھ عورت کی جان بچانے کی غرض سے صادر نہیں ہوگا تو اس فرد کو تین سال تک کی قید (جو ہر نوعیت کی ہو سکتی ہے) یا جُرمانہ یا دونوں سزائیں دی جائیں گی اور جو عورت خود تعجیل ولادت کا ارتکاب کرے گی اسے سات سال تک کی ہر قسم کی قید کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کی بھی مستوجب ہوگی۔

توضیح: جو عورت خود اپنا حمل گرانے کی موجب بنے گی اس پر بھی اس دفعہ کا اطلاق ہوگا۔

تعزیراتِ پاکستان کی اس دفعہ کی رُو سے اسقاطِ حمل کا صرف ایک ہی صورت میں جواز تھا کہ نیک نیتی کے ساتھ حاملہ عورت کی جان بچانا مقصود ہو۔ لیکن کمیٹی کی تجویز کردہ ترمیم کے بعد یہ دفعہ حسب ذیل صورت اختیار کر لے گی۔

''جو فرد بھی ارادتاً و عمداً کسی حاملہ عورت کا حمل گرانے کا باعث بنے گا، اگر یہ اسقاطِ حمل نیک نیتی کے ساتھ اس عورت کی جان بچانے یا اس کی جسمانی یا ذہنی صحت کو درپیش

سنگین خطرے کے تدارک کے لیے نہیں ہوگا، اس فرد کو تین سال تک کی قید......الخ

خط کشیدہ الفاظ کا اضافہ ایسا مبہم اور ذو معنی ہے کہ اس کے بعد اسقاطِ حمل کسی صورت میں بھی قابل مؤاخذہ جرم نہیں رہے گا۔ کیونکہ ''جسمانی یا ذہنی صحت کا سنگین خطرہ'' ایک ایسی ''اصطلاح'' ثابت ہوگی جس سے فائدہ ہر وہ عورت اٹھائے گی جو ناجائز اسقاطِ حمل بھی کرائے گی اور کمیٹی کی خواہش بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ اسقاطِ حمل کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے، جیسا کہ کمیٹی کی رپورٹ میں کہا گیا ہے:

''یہ عام احساس پایا جاتا ہے کہ اسقاطِ حمل کو قانونی طور پر جائز قرار دیا جائے کیونکہ تمام دنیا میں عورتوں کی طرف سے ایسا ہی مطالبہ پیش کیا جارہا ہے۔

افسوس! اسی خدا بیزار اور آخرت فراموش دنیا کی خواہش کے مطابق کمیٹی اسقاط حمل کو مطلقاً جائز قرار دینا چاہتی ہے؟ اور ایسی ترمیم تجویز کی جارہی ہے تاکہ کوئی عورت بھی اسقاطِ حمل کے جُرم میں ماخوذ نہ ہوسکے؟ علاوہ ازیں کمیٹی نے مزید سفارش یہ کی ہے کہ ''ایک سوبیس دن سے کم کا جنین بچہ تصور نہیں کیا جائے گا۔''

گویا چار مہینے سے پہلے پہلے ہی اسقاطِ حمل کرالیا گیا تو اس کے متعلق تو سرے سے کوئی باز پرس ہی نہیں، ظاہر بات ہے کہ غیر شادی شدہ عورتیں اپنے گھناؤنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے ابتدا ہی میں ایسی حرکتیں کرتی ہیں ان مسوں (باکرہ عورتوں) کے لیے اب یہ دروازہ چوپٹ کھول دیا جائے گا کہ اپنے پسندیدہ دوستوں سے ناجائز اختلاط کریں اور اس غیر شرعی ملاپ کے نتیجے میں اگر ''کچھ'' ہوجائے تو بلا روک ٹوک اپنی ''صفائی'' کروا لیں، ان سے کسی قسم کی باز پُرس نہیں کی جائے گی، معاشرتی بگاڑ کے بڑھتے ہوئے طوفان میں بے حیائی و فحاشی کے لیے مزید سہولتوں کے اہتمام اور قانون وضوابط کے اس طرح انہدام کے بعد جو کچھ ہوگا، اس کا تصور ہی ایک مسلمان کے لیے سخت ہولناک ہے لیکن

افسوس کمیٹی اب اس اسلامی معاشرے کو اسی راہ پر ڈالنے پر تُلی ہوئی ہے۔

تربیتِ اطفال کے ادارے

ایک سفارش کمیٹی کی یہ ہے:

''سماجی تحفظ ملازمین آرڈی نینس 1965ء کے تحت سماجی تحفظ اسکیم کے ذریعے تمام شہروں میں سرکاری پرورش گاہوں، دن کے وقت دیکھ بھال کرنے والے مراکز اور نرسریوں کے قیام کے لیے اہتمام کیا جائے۔''

یہ ''تجویز'' بظاہر بڑی دل فریب اور خوش نما ہے لیکن اس کے پیچھے وہی مغربی ذہنیت کارفرما ہے جس کی رُو سے عورتوں کو خانہ نشینی کی بجائے شمعِ محفل اور معاشی مشین کا کل پرزہ بننے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ کمیٹی کے سر پر یہ بھوت سوار ہے کہ پاکستانی ''بیگمات'' بھی مغربی عورتوں کی طرح مردوں کے دوش بدوش فیکٹریوں، کارخانوں اور سرکاری اداروں میں نوکریاں کریں۔ رہا گھروں میں بچوں کی دیکھ بھال کا مسئلہ تو اس ''مرض'' کے علاج کے لیے ''نسخہ'' وہی تجویز کر دیا گیا جو مغرب (یورپ) میں عام ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسی مملکت کے لیے جس کو اسلامی باور کرایا جاتا ہے۔ اس نسخے میں کیا کشش ہو سکتی ہے اور یہاں ایسی سفارشات پیش کرنے میں کیا تک ہے؟

کارخانوں میں خواتین کے لیے مخصوص رعایت

''اُن کارخانوں میں ملازم خواتین کو بھی انتفاعات میسر ہوں جہاں دس سے زائد اشخاص ملازم ہوں یہ انتفاعاتِ زچگی، تین سے زائد زچگیوں کے لیے نہیں دیے جانے چاہئیں۔''

اس کا تعلق بھی پچھلی تجویز ہی سے ہے، یعنی عورتوں کو معاشی میدان میں مردوں کے

دوش بدوش لانے کی سعی ء لا حاصل، علاوہ ازیں اس میں خاندانی منصوبہ بندی کی زہرنا کی بھی گھول دی گئی ہے اور یہ سفارش کی گئی ہے کہ کارخانوں میں ملازم خواتین کو مخصوص رعایات صرف تین زچگیوں کے لیے دی جائیں، گویا ان کے نزدیک وہی عورت ہمدردی کی مستحق ہے جو خاندانی منصوبہ بندی پر عمل پیرا ہو اور جو عورت ایسا نہیں کرے گی وہ ان مخصوص رعایات (انتفاعات) سے محروم رہے گی۔ کیا خوب عورتوں کے ساتھ ہمدردی ہے؟

ع۔ ہوئے تم دوست جس کے، دُشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

ذیل کی دو اور تجاویز بھی اسی مغربی ذہن وفکر کا شاخسانہ ہیں۔ ان میں سے ایک میں کہا گیا ہے: ''ہر ایک مقامی سرکاری ادارے کی کل رُکنیت کا 25 فیصد خواتین کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔'' اور دوسری تجویز میں کہا گیا ہے کہ ''ہر سیاسی جماعت کے لیے لازمی قرار دیا جائے کہ اگر وہ 10 یا اس سے زیادہ اُمیدوار کھڑے کرے تو ایسے امیدواروں میں کم از کم 10 فیصد خواتین ہونی چاہئیں۔

یہ دونوں سفارشیں پچھلی دونوں تجویزوں سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ اس طرح تو کوئی سرکاری ادارہ اور کوئی سیاسی گروہ مردوزن کے اس بے کار اختلاط سے محفوظ نہیں رہے گا۔ جو اسلامی شریعت میں سخت ناپسندیدہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اس ملک میں ان جماعتوں کے لیے کوئی میدانِ کار باقی نہیں چھوڑنا چاہتی جو اسلام کے علمبردار ہیں اور اسلامی نظام کے قیام میں کوشاں ہیں کیونکہ ان کے لیے اس شرط کا پورا کرنا ممکن نہ ہوگا۔

مقطع کا بند؟

خاندانی منصوبہ بندی (ضبطِ ولادت) کو عام کرنے کے لیے کمیٹی نے جو سفارشات کی ہیں وہ بقول ''بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔'' اس ساری رومانی غزل کے مقطع کا بند ہے

ملاحظہ فرمائیے۔

① تمام دوا فروشوں کے لیے قانونی طور پر فرض قرار دیا جائے کہ موانع حمل موجود رکھیں اور مذکورہ فرض قانونی کو ان کے لائسنس کی شرط قرار دیا جائے۔ علاوہ ازیں شفا خانوں اور ہسپتالوں میں موانع حمل کا وافر سٹاک شادی شدہ لوگوں میں فوری تقسیم کے لیے موجود رہنا چاہیے۔

② خاندانی منصوبہ بندی کا مضمون ایم بی بی ایس کے نصاب میں بطور لازمی مضمون شامل کیا جانا چاہیے۔

③ میڈیکل سند یافتگان، مرد اور عورت دونوں جو ڈاکٹری کے پیشے کی پریکٹس نہ کر رہے ہوں، ان کو منصوبہ بندی کی تربیت دی جانی چاہیے اور ہفتے میں کم از کم دس 10 گھنٹے خدمت انجام دینے پر مجبور کیا جائے۔

④ منصوبہ بندی کی رضا کارانہ تنظیمیں قائم کی جائیں اور ایسے سند یافتگان تلاش کیے جائیں جو اس کی تربیت حاصل کرنے میں دل چسپی رکھتے ہوں اور بلا مشاہرہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔

⑤ مردوں کے لیے شادی کی کم از کم عمر 18 سال سے بڑھا کر 21 سال کر دینی چاہیے۔

یہ پانچوں سفارشیں جو ضبط ولادت کی حمایت اور اسے عام کرنے کے متعلق ہیں۔ اس امر کی صاف دلیل ہے کہ ارکانِ کمیٹی اسلام یا اخلاق کو کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں۔ اگر اسلام یا اخلاق کی کوئی اہمیت ان کے دل کے کسی گوشے میں موجود ہوتی تو وہ ضبط ولادت کے متعلق مذکورہ سفارشات کبھی نہ کرتے کیونکہ اسلامی شریعت اور صحیح اخلاقی ضوابط میں قانون ضبط ولادت کی کوئی گنجائش نہیں۔ جب ایسا ہے تو پھر خاندانی منصوبہ بندی کے لیے مختلف قسم کی تجاویز کا جواز کیونکر نکل سکتا ہے؟ علاوہ ازیں کمیٹی کی ان تمام

تجاویز سے بے حیائی اور زنا کاری کے بڑھتے ہوئے طوفان میں زیادہ تندی اور تیزی ہی آئے گی اور فحاشی کا یہ سیلاب حیا وعفت کی بچی کھچی قدروں کو بھی بہا کر لے جائے گا۔ ہم اس وقت سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں جب کمیٹی کی سفارشات کے مطابق خدانخواستہ ضبطِ ولادت کے لیے ''تمام سہولتیں'' مہیا کر دی جائیں گی۔ لا قدر ھا اللّٰہ ثم لا قدر ھا اللّٰہ.

یہ ہے کمیٹی کی سفارشات پر مختصر تبصرہ، اس سے ہر باشعور آدمی اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ کمیٹی پاکستانی عورتوں کو وہ حقوق دینا چاہتی ہے جو اسلام نے ان کو دیے ہیں یا وہ ''حقوقِ نسواں'' کے خوش نما عنوان سے ان کو اسلام کے عطا کردہ زیورِ حیا وعفت سے محروم کر کے انھیں مغربی عورتوں کی طرح

ع...... بے حیا باش و ہر چہ می خواہی کُن

کے مقام پر کھڑا کرنا چاہتی ہے؟

آخر میں ہم قومی وصوبائی اسمبلیوں کے ارکان سے عرض کریں گے کہ وہ اسمبلی کے ایوانوں میں اس مسئلے کو اٹھائیں اور ''سفارشات'' کے اس دفترِ بے معنی کو ''غرقِ مئے ناب اولیٰ'' کا مصداق قرار دیں کیونکہ بیشتر سفارشات اسلامی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے سخت تباہ کن ہیں۔

(ہفت روزہ ''الاعتصام'' جلد 28، شمارہ 15-22، 12 نومبر، 1976ء تا 7 جنوری 1977ء)
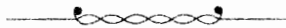
مشرف دور کا خواتین ایکٹ

اغراض ومقاصد، نتائج ومضمرات

مغرب زدہ اور لادین عناصر کی 27 سالہ جدوجہد کے نتیجے میں بالآخر حدود آرڈی نینس (نافذ کردہ 1979ء) کا تیاپانچہ کر کے 13 نومبر 2006ء کو تحفظ نسواں بل قومی اسمبلی سے اور بعدازاں سینٹ سے پاس ہو کر صدر مملکت کے دستخط کے بعد ایکٹ (قانون) کی صورت میں نافذ کر دیا گیا ہے۔

اس بل کا پاس ہو جانا اور پھر قانون بن کر نافذ ہو جانا، ان اسلامیانِ پاکستان کے لیے جو پاکستان کا مقصدِ قیامِ اسلام کا نفاذ سمجھتے تھے اور اسی لیے انھوں نے جان و مال کی گراں قدر قربانیاں پیش کی تھیں، ایک عظیم صدمے سے کم نہیں، اس لیے اس پر قرآن کریم کے الفاظ میں ﴿إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ ہی پڑھا جا سکتا ہے اور پڑھا جانا چاہیے۔ قرآن نے کہا ہے:

﴿الَّذِيْنَ إِذَآ أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّآ إِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۝﴾

''مومنین صابرین کو جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ انا للہ...... پڑھتے ہیں۔''[1]

جمہوریت، اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک عظیم خطرہ

حدود آرڈی نینس تقریباً 27 سال نافذ رہا لیکن حکومتوں کی بدنیتی، مغرب سے مرعوبیت

[1] البقرۃ 156:2۔

اور غلامانہ ذہنیت کی وجہ سے عملاً غیر مؤثر رہا اور کسی ایک شخص کو بھی اس کے تحت صحیح معنوں میں سزا نہیں ملی، صرف دارو گیر اور قید و بند تک معاملہ رہا اور ججوں سمیت عدالتی اہل کاروں، وکیلوں اور پولیس کی چاندی رہی اور اس طویل عرصے میں کسی ایک حد کا بھی نفاذ نہیں ہوا، نہ کسی چور کے ہاتھ کٹے، نہ کسی زانی کو کوڑے لگے اور نہ کسی کو سنگسار ہی کیا گیا۔ یہ تاریخ انسانیت کا ایک عجوبہ قانون ہے جس کے تحت کسی کو سزا نہیں ملی، حالانکہ چوری کی وارداتیں بھی اتنی کثرت سے ہوتی ہیں کہ الأمان والحفیظ. اسی طرح زنا کاری کا جرم بھی کثیر الوقوع ہے اور شراب نوشی بھی عام ہے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ حدود آرڈی نینس کے خلاف اتنا شور وغوغا بلند کیا جاتا رہا، سیکولر عناصر اس کے خلاف مسلسل سرگرم اور متحرک رہے اور مغربی لابیاں اور این جی اوز اس کو ایک چیلنج سمجھتی رہیں اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں جب تک کہ اس کے بالکل برعکس ایک سراسر غیر اسلامی قانون انھوں نے منظور نہیں کروالیا۔

یہ سب مغربی جمہوریت کا شاخسانہ اور اس کی ''برکات'' ہیں۔ مغربی استعمار اور اس کے گماشتے اسلامی ملکوں میں جمہوریت کے نفاذ پر جو زور دیتے ہیں، اس کا مقصد یہی ہے کہ اس کے ذریعے سے اسلامی ملکوں اور اسلامی معاشروں کو ان کی اسلامی خصوصیات اور اسلامی تہذیب واقدار سے دور کر دیا جائے۔ یہ مقصد جمہوریت ہی سے حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ ایسی جمہوریت ہی میں آزادئ رائے کی مکمل اجازت ہے اور اس اجازت کا مطلب یہی ہے کہ ہر شخص کو اپنی رائے کے اظہار کا اور اس کی طرف لوگوں کو بلانے کا حق حاصل ہے قطع نظر اس کے کہ وہ نظریہ یا رائے اسلام کے خلاف ہے یا اس کے مطابق؟ علاوہ ازیں اسمبلیاں مطلقاً قانون سازی کا حق رکھتی ہیں، اس کے ممبر عوام کے منتخب نمائندے ہیں، وہ اکثریتی رائے سے جو چاہیں قانون بنا سکتے اور نافذ کر سکتے ہیں، ان کو

اللہ اور رسول کی رائے اور ان کی باتوں کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔

مغربی جمہوریت کی انھی دو کمزوریوں یا بقول ان کے دو ''خوبیوں'' سے مذکورہ عناصر نے فائدہ اٹھایا۔ پہلے 27 سالہ یک طرفہ جھوٹے پروپیگنڈے کے زور سے یہ باور کرایا گیا کہ حدود آرڈی نینس کی وجہ سے عورت پر بڑا ظلم ہو رہا ہے، اس لیے اس کو ختم کر کے عورت کی دادرسی کا اہتمام ضروری ہے۔ دوسرے نمبر پر قومی اسمبلی میں اپنی اکثریت کے بَل پر متنازعہ اور خلافِ اسلام بِل پاس کروالیا۔

یہ ان حضرات کے لیے لمحۂ فکریہ ہے جو کہتے ہیں کہ جمہوری نظام اسلام کے خلاف نہیں ہے بلکہ اسلام کے مطابق ہے جس طرح پہلے سوشلسٹ اور کمیونسٹ کہتے تھے کہ سوشلزم عین اسلام ہے، اس میں کوئی بات خلافِ اسلام نہیں۔ حالات اور واقعات نے ثابت کر دیا کہ جس طرح سوشلزم کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، اسی طرح جمہوریت بھی سراسر غیر اسلامی نظام ہے۔ علاوہ ازیں اس کے ذریعے سے کبھی اسلام نہیں آسکتا۔ ہاں! اسلام سے دُور ہو سکتے ہیں۔ دیکھ لیجیے، قومی اسمبلی اور سینٹ میں اسلامی ذہن رکھنے والے حضرات ایک معقول تعداد میں موجود تھے لیکن وہ زیر بحث بِل کو رکوانے میں ناکام رہے اور خدانخواستہ یہ قانون اگر چند سال نافذ رہ گیا تو اسلام کے تصور حیا و عفت کی دھجیاں بکھر جائیں گی اور حیا باختگی کا وہ طوفان آئے گا کہ جس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لا قدرہ اللّٰہ .

قانون کا نام ''تحفظِ نسواں'' کیوں؟

اس قانون کو ''تحفظ نسواں'' کا نام دیا گیا ہے۔ حالانکہ اس قانون کا تعلق زنا اور قذف کی سزاؤں سے ہے جس میں مردوں کی طرح عورتیں بھی ملوث ہوسکتی ہیں، مردوں کی طرح عورتیں بھی ورغلا کر مردوں کو زنا کاری پر آمادہ یا مجبور کرسکتی ہیں جیسے قرآن مجید

میں امرأۃ العزیز (زلیخا) اور حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اس کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اسی طرح (زنا کی جھوٹی تہمت) کا ارتکاب مردوں کی طرح عورتوں سے بھی ہوتا اور ہو سکتا ہے تو پھر اسے تحفظ نسواں کا نام کس طرح دیا جا سکتا ہے؟ کیا دنیا میں کوئی قانون ایسا بھی ہے جسے ''تحفظ مرداں'' یا ''تحفظ حقوق مرداں'' کے نام سے معنون کیا جاتا ہو۔ تنظیمیں اور وزارتیں تو مخصوص اغراض و مقاصد کے لیے بنتی ہیں تو ان کے نام بھی ان کے مخصوص اغراض و مقاصد کے مطابق رکھ لیے جاتے ہیں۔ اگر حکومت بھی ایک پرائیویٹ تنظیم ہے یا اس کا تعلق کسی ایک وزارت سے ہے تو وہ صرف حقوقِ نسواں کے تحفظ کو اپنا مقصدِ وحید قرار دے سکتی ہے لیکن اگر حکومت کا مقصد تمام شہریوں کے حقوق کا تحفظ ہے، چاہے وہ مرد ہو یا عورت تو پھر حکومت کے فرائض میں مرد و عورت دونوں کے حقوق کا تحفظ...... یکساں طور پر...... داخل ہے، وہ کسی ایک صنف کو نظر انداز کر کے دوسری صنف ہی کو اپنا مطمع نظر قرار نہیں دے سکتی۔ بالخصوص ایسے معاملات میں جن میں دونوں صنفیں برابر کے حقوق رکھتی ہوں۔ کسی ایسے جرم کے ارتکاب کی سزا کے لیے قانون بنایا جائے جس کا ارتکاب مرد اور عورت دونوں میں سے کوئی بھی کر سکتا ہے تو اس قانون کا نام ایسا تجویز کیا جائے گا جو اس جرم کے انسداد اور اس کی سزا کا مظہر ہو، نہ کہ کسی ایک صنف کے نام پر اسے معنون کیا جائے گا۔

مثلاً: رشوت کے انسداد اور اس کی سزا کے لیے کوئی قانون بنایا جائے تو کیا اس کا نام تحفظ حقوق مرداں یا نسواں یا عوام رکھا جا سکتا ہے؟ قانون تو سب کے لیے یکساں ہے، جو بھی اس قانون کی خلاف ورزی کرے گا، مرد ہو یا عورت، اس کا مؤاخذہ واحتساب ہوگا، اس کو قانون کی گرفت میں لایا جائے گا، اس قانون کو کسی ایک صنف کے حقوق کے تحفظ کا مظہر کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے؟

بنابریں زیر بحث قانون، جس کا تعلق زنا اور قذف کے جرم سے ہے، اس کا نام خواتین ایکٹ، تحفظ نسواں یا تحفظ حقوق نسواں رکھنا بنیادی طور پر غلط ہے اور اس صنفی امتیاز کا مظہر ہے جس کو ختم کرنے کا حکومت مسلسل اعلان اور دعویٰ کرتی ہے۔

''تحفظ نسواں'' نام کا پس منظر، ایک جھوٹا پروپیگنڈہ ہے

دراصل بات یہ ہے کہ یہ عجیب وغریب نام بھی ایک پس منظر رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سیکولر عناصر، مغرب زدہ حضرات اور بیرونی استعمار کی پروردہ اور ایجنٹ این جی اوز مسلسل یہ پروپیگنڈہ کرتی آرہی ہیں کہ حدود آرڈی نینس کی وجہ سے عورتوں پر بڑا ظلم ہو رہا ہے، جو عورت بھی آکر یہ فریاد کرتی ہے کہ اس کی عصمت دری کی گئی ہے تو اس سے چار عینی گواہوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے، جو کہ ظاہر ہے کہ پیش نہیں کیے جا سکتے، نتیجتاً خود اس عورت کو الزامِ زنا میں دھر لیا جاتا ہے اور اس کو حوالۂ زنداں کر دیا جاتا ہے۔ یہ پروپیگنڈہ یکسر خلافِ واقعہ ہے اس کی وضاحت مولانا تقی عثمانی سابق جج وفاقی شرعی عدالت وشریعت اپیلیٹ بینچ نے خود اپنے ایک مضمون میں کی ہے جو کم وبیش 21,20 سال ان مقدمات کی سماعت کرتے رہے ہیں، ان سے زیادہ واقف حال کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے اس پروپیگنڈے کے غبارے کی ساری ہوا نکال دی ہے، ان کے مضمون سے متعلقہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

تحریر فرماتے ہیں:

''قرآن کریم، سنت نبویہ علی صاحبہا السلام اور خلفائے راشدین کے فیصلوں سے یہ بات کسی شبہے کے بغیر ثابت ہے کہ زنا کی حد جس طرح رضامندی کی صورت میں لازم ہے، اسی طرح زنا بالجبر کی صورت میں بھی لازم ہے اور یہ کہنے کا کوئی مجاز نہیں ہے کہ قرآن وسنت نے زنا کی جو حد (شرعی سزا) مقرر کی ہے، وہ صرف رضامندی کی صورت

میں لاگو ہوتی ہے، جبر کی صورت میں اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔

سوال یہ ہے کہ پھر کس وجہ سے زنا بالجبر کی شرعی سزا کو ختم کرنے پر اتنا اصرار کیا گیا ہے؟ اس کی وجہ دراصل ایک انتہائی غیر منصفانہ پروپیگنڈا ہے جو حدود آرڈی نینس کے نفاذ کے وقت سے بعض حلقے کرتے چلے آرہے ہیں، پروپیگنڈا یہ ہے کہ حدود آرڈی نینس کے تحت اگر کوئی مظلوم عورت کسی مرد کے خلاف زنا بالجبر کا مقدمہ درج کرائے تو اس سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ زنا بالجبر پر چار گواہ پیش کرے اور جب وہ چار گواہ پیش نہیں کرسکتی تو الٹا اسی کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ وہ بات ہے جو عرصۂ دراز بے تکان دہرائی جارہی ہے اور اس شدت کے ساتھ دہرائی جارہی ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ اسے سچ سمجھنے لگے ہیں اور یہی وہ بات ہے جسے صدر مملکت نے بھی اپنی نشری تقریر میں اس بل کی واحد وجہ جواز کے طور پر پیش کیا ہے۔

جب کوئی بات پروپیگنڈے کے زور پر گلی گلی اتنی مشہور کر دی جائے کہ وہ بچے بچے کی زبان پر ہو تو اس کے خلاف کوئی بات کہنے والا عام نظروں میں دیوانہ معلوم ہوتا ہے لیکن جو حضرات انصاف کے ساتھ مسائل کا جائزہ لینا چاہتے ہیں، میں انھیں دلسوزی کے ساتھ دعوت دیتا ہوں کہ وہ براہِ کرم پروپیگنڈے سے ہٹ کر میری آئندہ معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں۔

مراد یہ ہے کہ میں خود پہلے وفاقی شرعی عدالت کے جج کے حیثیت سے اور پھر سترہ سال تک سپریم کورٹ کی شریعت اپیلیٹ بنچ کے رکن کی حیثیت سے حدود آرڈنینس کے تحت درج ہونے والے مقدمات کی براہِ راست سماعت کرتا رہا ہوں۔ اتنے طویل عرصے میں میرے علم میں کوئی ایک مقدمہ بھی ایسا نہیں آیا جس میں زنا بالجبر کی کسی مظلومہ کو اس بنا پر سزا دی گئی ہو کہ وہ چار گواہ پیش نہیں کرسکی اور حدود آرڈی نینس کے تحت ایسا ہونا ممکن

بھی نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدود آرڈی نینس کے تحت چار گواہوں پر جرم کے اقرار کی شرط صرف زنا بالجبر موجب حد کے لیے تھی لیکن اسی کے ساتھ دفعہ 10 (3) زنا بالجبر موجب تعزیر کے لیے رکھی گئی تھی جس میں چار گواہوں کی شرط نہیں تھی بلکہ اس میں جرم کا ثبوت کسی ایک گواہ، طبی معائنے اور کیمیاوی تجزیہ کار کی رپورٹ سے بھی ہو جاتا تھا، چنانچہ زنا بالجبر کے بیشتر مجرم اسی دفعہ کے تحت ہمیشہ سزایاب ہوتے رہے ہیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو مظلومہ چار گواہ نہیں لاسکی، اگر اسے کبھی سزا دی گئی ہو تو حدود آرڈی نینس کی کون سی دفعہ کے تحت دی گئی ہوگی؟ اگر یہ کہا جائے کہ اسے قذف (زنا کی جھوٹی تہمت لگانے) پر سزا دی گئی تو قذف آرڈی نینس کی دفعہ 3 استثنا نمبر 3 میں صاف صاف یہ لکھا ہوا موجود ہے کہ جو شخص قانونی اتھارٹیز کے پاس زنا بالجبر کی شکایت لے کر جائے اسے صرف اس بناء پر قذف میں سزا نہیں دی جاسکتی کہ وہ چار گواہ پیش نہیں کر سکا، کر سکی۔ کوئی عدالت ہوش وحواس میں رہتے ہوئے ایسی عورت کو سزا دے ہی نہیں سکتی، دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اسی عورت کو رضا مندی سے زنا کرنے کی سزا دی جائے لیکن اگر کسی عدالت نے ایسا کیا ہو تو اس کی یہ وجہ ممکن نہیں ہے کہ وہ خاتون چار گواہ نہیں لاسکی بلکہ واحد ممکن وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ عدالت شہادتوں کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ عورت کا جبر کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر کوئی عورت کسی مرد پر یہ الزام عائد کرے کہ اس نے زبردستی اس کے ساتھ زنا کیا ہے اور بعد میں شہادتوں سے ثابت ہو کہ اس کا جبر کا دعویٰ جھوٹا ہے اور وہ رضا مندی کے ساتھ اس عمل میں شریک ہوئی تو اسے سزایاب کرنا انصاف کے کسی تقاضے کے خلاف نہیں ہے۔ لیکن چونکہ عورت کو یقینی طور پر جھوٹا قرار دینے کے لیے کافی ثبوت عموماً موجود نہیں ہوتا، اس لیے ایسی مثالیں بھی اکّا دکّا ہیں، ورنہ 99 فیصد مقدمات میں یہ ہو رہا ہے کہ اگرچہ عدالت کو اس بات پر

اطمینان نہیں ہوتا کہ مرد کی طرف سے جبر ہوا ہے لیکن چونکہ عورت کی رضامندی کا کافی ثبوت بھی موجود نہیں ہوتا، اس لیے ایسی صورت میں بھی عورت کو شک کا فائدہ دے کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

حدود آرڈی نینس کے تحت پچھلے 27 سال میں جو مقدمات ہوئے ہیں، ان کا جائزہ لے کر اس بات کی تصدیق آسانی سے کی جا سکتی ہے۔ میرے علاوہ جن جج صاحبان نے یہ مقدمات سنے ہیں، ان سب کا تاثر بھی میں نے ہمیشہ یہی پایا کہ اس قسم کے مقدمات میں جہاں عورت کا کردار مشکوک ہو، تب بھی عورتوں کو سزا نہیں ہوتی، صرف مرد کو سزا ہوتی ہے۔

چونکہ حدود آرڈی نینس کے نفاذ کے وقت ہی سے یہ شور بکثرت مچتا رہا ہے کہ اس کے ذریعے بے گناہ عورتوں کو سزا ہو رہی ہے، اس لیے ایک امریکی اسکالر چارلس کینیڈی یہ شور سن کر ان مقدمات کا سروے کرنے کے لیے پاکستان آیا، اس نے حدود آرڈی نینس کے مقدمات کا جائزہ لے کر اعداد و شمار جمع کیے اور اپنی تحقیق کے نتائج ایک رپورٹ میں پیش کیے جو شائع ہو چکی ہے۔ اس رپورٹ کے نتائج بھی مذکورہ بالا حقائق کے عین مطابق ہیں۔ وہ اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے:

Women fearing conviction under section 10(2) froquently bring charges of rape under 10(3) against their alleged partners. The FSC finding no circumstantial evidence to support the letter charge, convict the male accused under soction 10(2)....... the women is exonerated of any wrong doing due to reasonable doubt, rule."

(charls nannedy: the status of women in pakistan in islamization of laws P.74)

''جن عورتوں کو دفعہ 10 (2) کے تحت (زنا بالرضا کے جرم میں) سزا یاب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، وہ اپنے مبینہ شریک جرم کے خلاف دفعہ 10 (3) کے تحت (زنا بالجبر کا) الزام لے کر آ جاتی ہے۔ فیڈرل شریعت کورٹ کو چونکہ کوئی ایسی قرائنی شہادت نہیں ملتی جو

زنا بالجبر کے الزام کو ثابت کر سکے، اس لیے وہ مرد ملزم کو دفعہ 10 (2) کے تحت (زنا بالرضا) کی سزا دے دیتا ہے...... اور عورت ''شک کے فائدے'' والے قاعدے کی بنا پر اپنی ہر غلط کاری کی سزا سے چھوٹ جاتی ہے۔''

یہ ایک غیر جانبدار غیر مسلم اسکالر کا مشاہدہ ہے، جسے حدود آرڈی نینس سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اور ان عورتوں سے متعلق ہے جنھوں نے بظاہر حالات رضا مندی سے غلط کاری کا ارتکاب کیا اور گھر والوں کے دباؤ میں آکر اپنے آشنا کے خلاف زنا بالجبر کا مقدمہ درج کرایا، ان سے چار گواہوں کا نہیں، قرائنی شہادت (Circumstntial evidenve) کا مطالبہ کیا گیا اور وہ قرائنی شہادت بھی ایسی پیش نہ کر سکیں جس سے جبر کا عنصر ثابت ہو سکے۔ اس کے باوجود سزا صرف مرد کو ہوئی اور شک کے فائدے کی وجہ سے اس صورت میں بھی ان کو کوئی سزا نہیں ہوئی۔

لہٰذا واقعہ یہ ہے کہ حدود آرڈی نینس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کی رُو سے زنا بالجبر کا شکار ہونے والی عورت کو چار گواہ پیش نہ کرنے کی بنا پر اُلٹا سزا یاب کیا جا سکے۔

البتہ یہ ممکن ہے اور شاید چند واقعات میں ایسا ہوا بھی ہو کہ مقدمے کے عدالت تک پہنچنے سے پہلے تفتیش کے مرحلے میں پولیس نے قانون کے خلاف کسی عورت کے ساتھ یہ زیادتی کی ہو کہ وہ زنا بالجبر کی شکایت لے کر آئی لیکن انھوں نے اسے زنا بالرضا میں گرفتار کر لیا۔ لیکن اس زیادتی کا حدود آرڈی نینس کی کسی خامی سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس قسم کی زیادتیاں ہمارے ملک کی پولیس ہر قانون کی تنفیذ میں کرتی رہتی ہے، اس کی وجہ سے قانون کو نہیں بدلا جاتا، ہیروئن رکھنا قانوناً جرم ہے مگر پولیس کتنے بے گناہوں کے سر ہیروئن ڈال کر انھیں تنگ کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہیروئن کی ممانعت کا قانون ہی ختم کر دیا جائے۔

زنا بالجبر کی مظلوم عورت کے ساتھ اگر پولیس نے بعض صورتوں میں ایسی زیادتی کی بھی ہے تو فیڈرل شریعت کورٹ نے اپنے فیصلوں کے ذریعے اس کا راستہ بند کیا ہے اور اگر بالفرض اب بھی ایسا کوئی خطرہ موجود ہو تو ایسا قانون بنایا جاسکتا ہے جس کی رُو سے یہ طے کر دیا جائے کہ زنا بالجبر کی مستغیثہ کو مقدمے کا آخری فیصلہ ہونے تک حدود آرڈی نینس کی کسی بھی دفعہ کے تحت گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ اور جو شخص ایسی مظلومہ کو گرفتار کرے، اسے قرار واقعی سزا دینے کا قانون بھی بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کی بنا پر ''زنا بالجبر'' کی حدِ شرعی کی کو ختم کر دینے کا کوئی جواز نہیں ہے، لہٰذا زیر نظر بل میں زنا بالجبر کی حدِّ شرعی کو جس طرح بالکلیہ ختم کر دیا گیا ہے، وہ قرآن وسنت کے واضح طور پر خلاف ہے اور اس کا خواتین کے ساتھ ہونے والی زیادتی سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسلامی تعلیمات ہی عورتوں کے حقوق کا تحفظ کر سکتی ہیں

بات تحفظ نسواں کی آ گئی ہے تو آگے چلنے سے پہلے یہ وضاحت کر دینی بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ خواتین کا تحفظ اگر ہوسکتا ہے تو صرف اور صرف اسلامی قوانین اور اسلامی تعلیمات پر عمل درآمد ہی سے ہوسکتا ہے، ان سے گریز اوراعراض کر کے ان کے تحفظ کا دعویٰ

ایں خیال است و محال است و جنوں

ہی کے ضمن میں آتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کا تصور حیا وعفت اتنا بلند ہے کہ دوسرے مذاہب و نظریات اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ خواتین ایکٹ میں یہی ظلم کیا گیا ہے کہ حدود آرڈی نینس کی تمام اسلامی دفعات کا خاتمہ کر کے، جو عورت کے تحفظ کی ضامن تھیں، نئی دفعات تجویز کی گئی ہیں جن سے عورت کی مٹی پلید ہوگی، البتہ آوارگی کا راستہ

آسان ہو جائے گا۔ اگر عورت کے تحفظ کا مطلب یہی ہے کہ آوارہ منش، شیطان صفت لوگوں اور ہوس کاروں کو عورت کی عفت و عصمت سے کھیلنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع مہیا کیے جائیں، اس راستے کی رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے اور ارتکابِ فواحش کی سہولتیں عام کر دی جائیں تو بلاشبہ اس خواتین ایکٹ میں مذکورہ باتوں کا قانونی اہتمام کر دیا گیا ہے۔ خدانخواستہ یہ ایکٹ چند سال نافذ رہا تو دیکھ لینا کہ مغربی معاشروں میں حیا باختگی کے جو مناظر عام ہیں، برسر عام بوس و کنار کی جو حیا سوز صورتیں وہاں دعوت نظارہ دیتی ہیں اور شراب و شاہد کی جو ایمان شکن فتنہ انگیزیاں لوگوں کے دلوں کو بھاتی اور گرماتی ہیں۔ یہ اخلاق سوز، ایمان شکن اور رہزنِ تمکین و ہوش مناظر یہاں بھی عام ہوں گے اور اہل ایمان

ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم

کے بمصداق مہر بہ لب رہنے پر مجبور ہوں گے کیونکہ خواتین ایکٹ ان کی پشت پر ہوگا۔

قانونِ الٰہی سے گریز وانحراف، سراسر تباہی کا راستہ ہے

یہ بات بھی یاد رکھیں کہ انسان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے صرف اللہ تعالیٰ ہی انسانی وجود کے اندر کارفرما مشینری کی پوری حقیقت کو جانتا ہے، اس کے علاوہ کسی کو اس کا پورا علم ہے، نہ ہی ہوسکتا ہے۔ بنابریں یہ مشینری اسی وقت اور اسی وقت تک صحیح کام کرے گی جب اسے اس کے بنانے والے کی ہدایات کے مطابق استعمال کیا جائے گا اور جب بھی ان ہدایات سے انحراف کیا جائے گا یہ مشینری انسانی معاشرے کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اس مشینری کے خالق نے یہ ہدایات آسمانی صحیفوں اور اپنے نمائندے رسولوں کے ذریعے سے عام انسانوں تک پہنچا دی ہیں۔ اسی لیے اس نے قرآن مجید کے ایک مقام پر، سورۂ مائدہ میں فرمایا:

جو اللہ کی نازل کردہ باتوں کے ساتھ فیصلہ نہیں کرتے، وہ کافر ہیں، وہ فاسق ہیں، وہ ظالم ہیں۔

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ ،﴿فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ ، ﴿فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہدایات سے انحراف کرنے والوں کے لیے اتنی سخت وعید کیوں؟ اس لیے کہ انسانی مشینری کو غلط طریقے سے استعمال کرنے سے انسانوں کو فائدے کے بجائے سخت نقصان ہوگا، معاشرے میں امن و سکون قائم نہیں ہو سکے گا، انسان آرام و راحت کی نیند نہیں سو سکیں گے۔ انسانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ نہیں ہو سکے گا۔ بالخصوص جرائم کا قلع قمع اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی حدود کو قائم و نافذ کیے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اور جرائم کی کثرت ہی انسانوں کے امن وسکون کو غارت کرتی ہے۔

دو معاشرے، دو مثالیں

آج اس گئے گزرے دور میں بھی، اس بات کو سمجھنے کے لیے، ہمارے سامنے دو مثالیں موجود ہیں۔ ایک مثال اس معاشرے کی ہے جہاں بہت حد تک اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی اسلامی سزائیں (حدیں) قائم و نافذ ہیں اور دوسری مثال ان معاشروں کی ہیں جہاں حدودِ الٰہی نافذ نہیں ہیں۔ پہلی مثال سعودی معاشرے کی ہے جہاں اسلامی حدود کی برکات کا یہ نتیجہ ہے کہ وہاں جرائم برائے نام ہیں، لوگ نہایت امن وسکون کی زندگی گزار رہے ہیں، کسی کو جان و مال یا عزت و آبرو کی پامالی کا خطرہ نہیں ہے۔ دوسری قسم کے معاشرے مغربی یا ان کی نقالی میں اسلامی حدود سے گریز کرنے والے مسلمان ملکوں کے معاشرے ہیں جہاں امن وسکون عنقا ہیں، کسی امیر، غریب کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں۔

﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ﴾

''بلاشبہ اس میں اس شخص کے لیے نصیحت ہے جس کا (خاص) دل ہے یا وہ (دل ودماغ کی) حاضری کے ساتھ کان لگائے (اور توجہ سے سُنے)'' [1]

اسلامی سزائیں انسان کی پانچوں اہم اشیاء کی حفاظت کی ضامن ہیں

علماء نے لکھا ہے کہ انسان کی پانچ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی حفاظت نہایت ضروری ہے اور وہ ہیں ① دین وایمان یا عقیدہ ② عقل ③ جان ④ مال ⑤ عزت وآبرو۔

اسلامی حدیں، بشرطیکہ انھیں خلوص دل سے نافذ کیا جائے، مذکورہ پانچوں چیزوں کی حفاظت کی ضامن ہیں۔

① دین وایمان یا عقیدے کے تحفظ کے لیے ارتداد کی سزا یا حدّ ہے جو قتل ہے، نبی ﷺ کا فرمان ہے۔

«مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ»

''جو دین اسلام سے پھر جائے، اسے قتل کر دو۔'' [2]

یہ سزائے قتل، ایک مسلمان کے دین وایمان کے تحفظ کے لیے ہے۔

② شراب نوشی پر کوڑوں کی سزا یا حد ہے، اس کا مقصد عقل کا تحفظ ہے۔ اور اسی شراب میں ہر نشہ آور مشروب یا چیز شامل ہے کیونکہ شراب کی طرح ہر نشہ آور چیز انسانی عقل کو ماؤف کر دیتی ہے۔

③ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ﴾

---

1 قٓ 50:37 . 2 صحيح البخاري، الجهاد والسير، حديث: 3017 .

''اے اصحابِ دانش! تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔''[1]

یعنی اگر کوئی کسی کو ناجائز قتل کر دے تو بدلے کے طور پر اس قاتل کو بھی قتل کر دیا جائے، اس کا نام قصاص ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو انسانی زندگی کے لیے ضمانت قرار دے رہا ہے اور یہ سو فیصد سچ ہے، اس لیے کہ اگر مجرم کو یہ پتا ہو کہ میں نے اگر کسی کو قتل کیا تو مجھے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے، یہ خوف مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کے لیے بڑا اہم اور نہایت کارگر ہے، جس معاشرے میں یہ قانونِ قصاص صحیح معنوں میں نافذ ہو، وہ معاشرہ قتل و غارت گری کی وبائے عام سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ یوں گویا قصاص جان کی حفاظت کا ضامن ہے۔

④ چوری اور ڈکیتی کی اسلامی سزائیں، مال کی حفاظت کی ضامن ہیں۔

⑤ اسی طرح عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے، جو ایک ایماندار اور غیرت مند معاشرے میں بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے، زنا اور تہمتِ زنا (قذف) کی سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی سزاؤں کے نفاذ کے بغیر دنیا میں کہیں بھی امن قائم نہیں ہوسکتا۔

اسلامی سزائیں ہی گناہ کا کفارہ ہیں، دوسری سزائیں نہیں

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ ایک مومن کے نزدیک آخرت کی زندگی، دنیوی زندگی سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ دنیا تو عارضی، فانی اور چند روزہ ہے جبکہ آخرت کی زندگی غیر فانی اور دائمی ہے، وہ دنیا کی چند روزہ عارضی زندگی کی خاطر آخرت کی دائمی زندگی کو خراب کرنا پسند نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ حضرت ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ سے جب زنا جیسے گناہ کا صدور ہو گیا تو از خود بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر یہ

1 البقرة 179:2۔

اصرار سزا کے ذریعے سے پاک ہونے کا اظہار فرمایا۔ اسی طرح غامدیہ عورت نے بھی آ کر خود ہی اعترافِ زنا کیا، رسالت مآب ﷺ نے حمل کی وجہ سے اسے واپس فرما دیا تو بچہ جننے کے بعد پھر سزا کے لیے حاضر ہوئی، آپ نے اسے پھر واپس کر دیا تا کہ ابھی وہ بچے کو دودھ پلائے، جب تیسری مرتبہ حاضر ہوئی تو بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا پکڑا کر لائی تا کہ اس دفعہ آپ اسے سزا دیے بغیر واپس نہ کریں، چنانچہ آپ نے اسے سنگسار کروا دیا۔

ازخود جرم کا اقرار کر کے سزا کے لیے اتنی بے قراری کا اظہار یوں ہی بلا مقصد نہیں تھا، نہ کسی دماغی خلل اور فتور کا نتیجہ تھا بلکہ اس کے پیچھے عقیدۂ آخرت کارفرما تھا، انھیں یہی فکر تھی کہ کہیں ہماری آخرت برباد نہ ہو جائے۔ دنیا کی یہ سزا (سنگساری) بھی اگرچہ بڑی سخت ہے لیکن آخرت کی سزا کے مقابلے میں کچھ نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام نے جو سزائیں مقرر کی ہیں، وہ ان گناہوں کا کفارہ ہیں جن کی وہ سزائیں ہیں، ان سزاؤں کے بعد انسان اس گناہ سے پاک ہو جاتا ہے۔ ان سزاؤں کو خوش دلی سے قبول اور گوارا کر لینا، ایسی سچی اور خالص توبہ ہے کہ اسے اگر ایک پوری بستی پر تقسیم کر دیا جائے تو سب کی مغفرت کے لیے کافی ہو جائے۔ مذکورہ صحابی اور صحابیہ کا بجا طور پر یہی عقیدہ تھا کہ اگر دنیا کی یہ سزا ہم گوارا کر لیں گے تو آخرت کی سزا سے ہم محفوظ ہو جائیں گے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَارْضَاهُمْ. علاوہ ازیں اللہ کی کسی حد کا زمین پر نافذ کرنا اہل زمین کے لیے چالیس دن کی بارش سے زیادہ خیر و برکت کا باعث ہے، حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے:

«إِقَامَةُ حَدٍّ بِأَرْضٍ خَيْرٌ لِأَهْلِهَا مِنْ مَّطَرِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً»

''زمین میں ایک حد قائم کرنا زمین والوں کے لیے چالیس روز بارش برسنے سے بہتر ہے۔''[1]

1. سنن النسائي، قطع السارق، حديث: 4909.

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حدود ہی وہ بابرکت سزائیں ہیں جن سے انسان پاک بھی ہو جاتا ہے اور اُخروی زندگی میں اُس گناہ کے عذاب سے محفوظ بھی ہو جاتا ہے۔ اور اس کا نفاذ دنیوی خیر و برکت کا باعث بھی ہے۔ لیکن اگر ان حدود کو دوسری سزاؤں میں بدل دیا جائے تو اس کے صاف معنی یہ ہوں گے کہ سزا پانے والا دنیوی عدالت میں تو سرخرو ہو جائے گا لیکن آخرت کی اصلی عدالت میں وہ بدستور مجرم ہی رہے گا۔ علاوہ ازیں دنیوی خیر و برکت سے بھی اس علاقے کے لوگ محروم رہیں گے۔ اب زنا اور قذف کی اصلی سزائیں جو اللہ نے مقرر کی ہیں، بدلنے والے سوچ لیں کہ وہ ان میں تخفیف کر کے مجرموں اور اہلِ زمین پر احسان کر رہے ہیں۔ یا ان پر ظلم کر رہے ہیں؟ ظاہر بات ہے کہ یہ سراسر ان پر ظلم ہے کہ دنیوی سزا بھگتنے کے باوجود بارگاہ الٰہی میں وہ مجرم کے مجرم اور رُوسیاہ ہی رہیں گے اور پورا کا پورا ملک دنیوی خیر و برکت سے محروم رہے گا۔

خواتین ایکٹ کے اصل اغراض و مقاصد

علاوہ ازیں سزاؤں میں تخفیف سے جرائم کی حوصلہ شکنی کے بجائے حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور ہمارے خیال میں خواتین ایکٹ سے اصل مقصود یہی ہے۔ صدر مشرف اول روز سے جس ''روشن خیالی'' کا اظہار کر رہے ہیں، زیر بحث قانون بھی ان کی اسی ''روشن خیالی'' کا ایک مظہر ہے۔

اس ترمیمی قانون کے ذریعے سے مغرب اسلامی ملکوں میں جو کچھ کرنا چاہتا ہے، اس کی طرف کافی پیش رفت ہوگئی ہے اور وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟

مغربی تہذیب اور اس کے فلسفے کے مطابق وہ چاہتا ہے کہ مغربی ملکوں کی طرح

- اسلامی ملکوں میں بھی اخلاقی جرائم عام ہوں۔
- زنا کاری کی سہولتیں عام ہوں۔

- خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے جو ابھی تک بہت حد تک محفوظ ہے۔
- بن بیاہ (کنواری) ماؤں کا وہاں بھی طوفان آ جائے۔

اسلامی ملکوں کے مغربی آقا، تہذیبی میدان میں، اپنے مشرقی شاگردوں اور ایجنٹوں کے ذریعے سے مذکورہ چاروں مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ زیر بحث قانون میں ایسی ماہرانہ چابک دستی سے کام لیا گیا ہے کہ اس ایک تیر سے دو نہیں، چار شکار ہوں گے، یعنی چاروں مقاصد حاصل کر لینے کا بندوبست کر لیا گیا ہے۔ وہ کس طرح؟ اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

① اخلاقی جرائم کی کثرت اور مجرمین کی حوصلہ افزائی

اخلاقی جرائم اس طرح عام ہوں گے کہ اللہ کا خوف تو ویسے ہی تقریباً مفقود ہے جو جرائم کی حوصلہ شکنی میں سب سے زیادہ مؤثر ہے۔ معاشرے کی ذلت و رسوائی کا خوف کنڈوم اور اس طرح کی مانع حمل ادویات نے ختم کر دیا ہے جو بدکاری کی راہ میں دوسری بڑی رکاوٹ ہے۔ تیسرے نمبر پر سخت سزاؤں کا خوف ہے جو مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کو جرائم سے باز رکھتا ہے۔ حدود آرڈی نینس اگرچہ عملی طور پر غیر مؤثر تھا لیکن اس میں درج سخت سزاؤں (کوڑے اور سنگساری) کا خوف ہی مجرمین کی حوصلہ شکنی کے لیے بڑا اہم اور نہایت مؤثر تھا۔ زیر بحث قانون نے زنا کی وہ اصل سزائیں، جو قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہیں اور چودہ سو سال سے بالاتفاق مُسلّم چلی آ رہی ہیں، علاوہ ازیں وہ نہایت عبرت ناک ہیں، انھیں یک قلم ختم کر کے آسان سی سزائیں تجویز کی گئی ہیں اور وہ ہیں زیادہ سے زیاد پانچ سال قید اور دس ہزار روپے تک جرمانہ۔ اسی طرح قذف کی قرآنی سزا اَسّی کوڑے ختم کر کے اس کے لیے بھی مذکورہ سزا (پانچ سال تک قید اور دس ہزار روپے تک جرمانہ) ہی تجویز کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں یہ سزا بھی زنا بالرضا کی ہے زنا

بالجبر کی نہیں۔ حالانکہ اسلام میں سرے سے یہ تقسیم ہی نہیں ہے۔ (جس پر آگے چل کر گفتگو ہوگی)، پھر ستم بالائے ستم مبادیاتِ زنا، اقدامِ زنا، سرعام فحاشی، بوس وکنار وغیرہ جرائم کی سزائیں (جو حدود آرڈی نینس میں تھیں) یکسر ختم کر کے ان تمام بے حیائیوں کا راستہ چوپٹ کھول دیا گیا ہے۔

شریعت میں زنا کی اصل سزا کیا ہے؟ وہ ہے شادی شدہ زانیوں کے لیے سنگساری اور کنوارے زانیوں کے لیے سو کوڑے۔ علاوہ ازیں اس میں رضا مندی یا جبر کے حساب سے کوئی تفریق بھی نہیں، البتہ عورت، جبر کی صورت میں سزا سے مُستثنیٰ ہوگی، صرف مرد سزایاب ہوگا۔ لیکن زیر بحث قانون میں ایک تو زنا کو مغربی معاشرے کی طرح دو قسموں میں تقسیم کر دیا ہے، بالرضا اور بالجبر۔ دوسرے نمبر پر اس کی اصلی سزا جو نہایت عبرت ناک تھی، اسے ختم کر دیا۔ تیسرے نمبر پر اس کا طریق کار بھی دنیا سے ایسا نرالا اور انوکھا تجویز کیا گیا ہے کہ کسی کو سزا ملنا ہی کارے دارد ہوگا۔ چوتھے نمبر پر سزا ملی بھی تو برائے نام ہوگی جس سے کسی کو بھی عبرت نہیں مل سکتی بلکہ مجرمین کی حوصلہ افزائی ہی ہوگی۔

② بدکاری کی بہتات

مجرمین کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں اخلاقی جرائم عام ہوں گے اور زنا کی اصل سزا اور مبادیاتِ زنا کی سزا ختم کرنے سے زنا کاری کی لعنت وبائے عام کی صورت اختیار کر لے گی جیسے یورپ وغیرہ میں ہے۔

③ خاندانی نظام کی تباہی

جب مرد وعورت دونوں کو قانونی طور پر زنا کی سہولتیں حاصل ہو جائیں گی تو اسی طرح خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا جیسے مغرب میں یہ نظام تباہ ہو چکا ہے۔

مغرب امداد اور اصلاح کے نام سے پاکستان کے اسلامی معاشرے کو بھی مادر پدر آزاد معاشرے میں تبدیل کرنا چاہتا ہے جس سے خاندانی نظام بربادی کا شکار ہو جائے گا۔

④ بن بیاہی (کنواری) ماؤں کا طوفان

سولہ سال تک کی بچی زنا بالجبر کی سزا سے مستثنیٰ ہو گی تو اس کا مقصد بھی پاکیزہ معاشرے کے بجائے ایسے معاشرے کو معرض وجود میں لانا ہے جس میں بلوغت کے ساتھ ہی جنسی مخالفت کا اختلاط نہ صرف آغاز ہو جائے بلکہ اس کی ترغیب و ترویج کا بھی اہتمام ہو جیسے مغرب اور انگلستان وغیرہ میں ہے وہاں سولہ سال سے کم عمر کی بیشتر لڑکیاں اپنی رضا مندی سے جنسی بدفعلی کی مرتکب ہوتی ہیں جیسے کہ لاس اینجلس ٹائمز کی 4 مارچ 2005ء کی رپورٹ میں اسی شہر کے چھٹی کلاس کے طلبہ وطالبات کا ایک سروے شائع کیا گیا ہے، اس میں بتلایا گیا ہے کہ 70 فیصد بچے جنسی بے راہ روی کے مرتکب پائے گئے ہیں، چنانچہ آئے روز سکولوں کی طالبات کے حاملہ ہونے کی خبریں وہاں کا معمول ہیں۔ (بحوالہ ماہنامہ، محدث، دسمبر 2006ء) اس طرح وہاں بن بیاہی (کنواری) ماؤں کا ایک طوفان آیا ہوا ہے۔ جس کا تناسب کسی جگہ 60 فیصد اور کسی جگہ 50 فیصد اور کسی جگہ ان سے بھی زیادہ ہے۔

نئے قانون کے سربستہ راز کھلنے کی دیر ہے......

ابھی تو اکثر عوام کو پتا نہیں ہے کہ یہ نیا قانون کیا ہے؟ اور زناکاروں کو اس میں کیسی کیسی سہولتیں دی گئی ہیں اور سزا کے عمل کو کس طرح پیچیدہ بنا دیا گیا ہے کہ کسی کو سزا ملنا ہی نہایت مشکل ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ اس قانون کی پرتیں کھلیں گی، اس کے سربستہ اسرار واضح ہوں گے اور وکیلوں کی قانونی موشگافیاں مجرموں کی ہم نوائی اور ان کی حوصلہ افزائی کریں گی تو پھر دیکھنا کہ مغربی آقاؤں کی امیدیں کس طرح بر آتی ہیں اور ہمارا معاشرہ بدکاری کی راہ پر کس طرح بگٹٹ دوڑتا ہے۔ لا قدرھا اللّٰہ ثم لا قدرھا اللّٰہ۔

خواتین ایکٹ کے نہایت خطرناک عواقب و مضمرات

یہی وجہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں کے مغربی آقایانِ ولی نعمت نے حدود آرڈی نینس کی تنسیخ اور اس کی جگہ نئے ترمیمی قانون کی نہ صرف حمایت کی ہے بلکہ اس پر نہایت مسرت کا اظہار کیا ہے۔ امریکہ اور برطانیہ وغیرہ کے مبارک بادی اور آشیر بادی کے پیغامات اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس سلسلے میں ریٹائرڈ جسٹس خلیل الرحمٰن خان کے مضمون کا ایک حصہ بھی بڑا چشم کشا ہے جو روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور میں چار قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ جسٹس صاحب موصوف لکھتے ہیں:

''تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کے تحت جس طرح شادی کا اسلامی قانونی تصور مسخ کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح خاندانی نظام اور قانونی وراثت میں ناجائز مداخلت کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ اس ایکٹ کو پارلیمان سے منظور کرانے کا پس منظر کیا ہے؟ حکومتی حلقے اصرار سے دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ دور رس تبدیلیاں عورتوں کی حالت بہتر بنانے اور ان کے حقوق کے حصول کو یقینی بنانے اور قوم و ملک کے بہترین مفاد میں کر رہے ہیں۔ یہ تبدیلی نہ تو مغرب کے کلچر کی تقلید ہے اور نہ ہی یہ مغربی ایجنڈہ کی پیروی ہے۔ قارئین بہر حال جانتے ہیں کہ بہت سی این جی اوز نے چند سال سے ڈالر کمانے کے لیے اسلامی قوانین کے خلاف کئی اداروں کی معاونت سے ایک طوفان برپا کر رکھا تھا۔

اس میں اس سال الیکٹرانک میڈیا بھی شامل کیا گیا۔ یہ بات زبان زد عام تھی کہ ایک صد ملین ڈالر بالادست قوت اسلامی قوانین کے خلاف مہم پر خرچ کر رہی ہے، پھر یہ بھی دیکھا گیا کہ ایک ٹی وی چینل نے ہر بڑے شہر میں لمبے چوڑے بورڈ اور ہورڈنگ لگوائے۔ ٹی وی پر حدود قوانین پر پروگرام پیش کرنے سے پہلے جن پر لکھا تھا ''ذرا سوچیے'' بھاڑ میں جائیں مشرقی اقدار۔ اسلامی عفت اور شرم و حیا کی روایات۔ اور ایکٹ کے نفاذ کے

بعد اسی چینل پر سکرپٹ چلائی جاتی ہے۔ ''سوچنے کا شکریہ'' مبارک ہو پارلیمان کے ممبران کو جن کے ووٹ سے قانون منظور ہوا اور مغرب کے ایجنڈا میں دیے گئے کام (JOB) کی تکمیل ہوئی کیونکہ امریکہ کے اختیارات، ان کے کار پردازان اور تھنک ٹینک اس کام کی تکمیل پر ازحد خوش ہیں۔

امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے بیورو آفس آف ڈپلومیسی اور ہیومن رائٹس ویلیبر کی مورخہ 8 نومبر 2005ء کو جاری شدہ رپورٹ اس معینہ کام (JOB) کے بارے میں بہت کچھ واضح کرتی ہے۔ اس رپورٹ میں درج ہے:

"As part of its education reform initiatry the U.S Govt continued to help the Education Ministry revise its curriculum, including eleminating the teaching of rellgious intolerance. Embassy Officials remained ongaged with all parties involved in the Madrassah reform to encourage similar changes. Embassy Officials pressed Parlimentarians and the government to rivise blassphemy laws and Hadood Ordinance to minimise abuses and raised coneerns with Government Officials and religious leaders over growing shetoric againts ismall flowers of Aha khan and sectarian strik in the Northern Areas."

① ''تعلیمی اصلاحات کی ابتدائی کوششوں کے طور پر امریکی حکومت نے نصاب میں ترمیم کے لیے وزارت تعلیم کی امداد جاری رکھی، اس میں مذہبی عدم رواداری کی حامل تعلیمات کا نصاب سے اخراج بھی شامل ہوا۔ امریکی سفارت خانے کے حُکّام نے مدارس کے نصاب میں بھی ایسی ہی تبدیلیاں لانے کے لیے تمام ذمہ داران سے مسلسل رابطے کا کام انجام دیا۔ سفارت خانے کے حکام نے ارکان پارلیمنٹ اور حکومت پر زور دیا کہ توہین رسالت آرڈی نینس اور حدود آرڈی نینس کے غلط استعمال کو کم سے کم کرنے کے لیے ان میں ترامیم کی جائیں۔ انھوں نے سرکاری حکام اور مذہبی رہنماؤں کے ساتھ ملاقاتوں میں انھیں اپنی اس تشویش

سے آگاہ کیا کہ شمالی علاقہ جات میں آغا خان کے اسماعیلی پیروکاروں کے خلاف جذبات بھڑکائے جارہے ہیں اور وہاں فرقہ پرستی کے ہنگامے زوروں پر ہیں۔

اس تیرہ صفحات پر مشتمل رپورٹ میں تعلیمی نصاب کی تشکیلِ نو اور قادیانی اصحاب و دیگر اقلیتوں، اسماعیلی پیروکاروں سے سلوک اور مدرسے کے نصاب میں تبدیلی کے بارے میں امریکہ گورنمنٹ کی کوشش، تحریک اور تجاویز اور امریکہ کے سفارت کاروں میں حکومت پاکستان کے افسروں اور وزارت تعلیم اور وزارت مذہبی امور کو ترغیب اور معاونت کی تفصیل درج ہے۔ رپورٹ کے آخر میں منجملہ باتوں کے جو اختتامی ریمارکس دیے، وہ قابل توجہ ہیں:

Chief concerns during this roporting period included the blsaphemy laws, the Hadood Ordiances, curriculum reform in public education and madarassa education. Systems, treatment of Ahmedyos community, sectarian violance and growing social presure on Ismaill followers of Aga khan....

The U.S Govt continued to raise concerns in formally about the abuse of the blasphemy laws Hadood Ordiances with Govt. parlimentarians and Officalls Embassy Officials particepated in a number of semenars that the N.G.O' organized to discuss these issues...

The new legeslation that the Govt: enacted in January 2005 represented and important positive step in this direction. As a part of its over all public education reform program valued at s 100 million (5.8 Billion Rupees). The united States provided substantial financial support to the Govt's curriculum reform initiative which included the teaching of roligious intolerance.

”رپورٹ کے مطابق اس عرصے میں امریکی سفارتی حکام نے زیادہ تر توہین رسالت آرڈی نینس، حدود آرڈی نینس، تعلیم عامہ اور مدارس کی تعلیم، احمدی برادری سے سلوک، فرقہ درانہ تشدد اور آغا خان کے اسماعیلی پیروکاروں پر روز افزوں سماجی دباؤ کے بارے میں تشویش ظاہر کی۔“

''امریکی حکومت کے اہلکاروں نے پاکستان کی حکومت، پارلیمنٹ کے ارکان اور حکام سے رسمی ملاقاتوں میں توہین رسالت قوانین اور حدود قوانین کے غلط استعمال کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ سفارت خانے کے حکام نے کئی سیمیناروں میں شرکت کی جو این جی اوز نے ان مسائل پر بحث کرنے کے لیے منعقد کیے۔''

''حکومت نے جنوری 2005ء میں جوئنٹ قانون سازی کی، اس میں بھی اس سمت میں ایک اہم قدم اٹھایا گیا۔ امریکہ نے اپنے اور آل پبلک ایجوکیشن ریفارم پروگرام کے ایک جزو کے اوپر جس کی مالیت 10 کروڑ ڈالر (5.8 ارب روپے) دیے، حکومت پاکستان کے نصابی اصلاحی اقدامات کے لیے خاطر خواہ مالی امداد فراہم کی، جس میں مذہبی عدم رواداری کی تعلیم کے سد باب کے لیے دی گئی امداد بھی شامل تھی۔''

اس کے بعد رپورٹ میں مدرسہ ریفارمز پروگرام کے بارے میں جو نتائج حاصل کیے گئے ان کا ذکر ہے۔ مدرسہ ریفارم میں اس حد تک دخل دینا کہاں تک جائز ہے۔ ہمارے ملک اور ہماری قوم کے لیے نصاب تعلیم کیا ہونا چاہیے اور ہمارے قوانین کیا ہونے چاہئیں یہ ہمارا اندرونی اور ذاتی مسئلہ ہے اور ہمیں بتایا بھی یہی جاتا ہے کہ یہ سب کچھ ہم کسی کے دباؤ کے تحت نہیں بلکہ خود اپنے قومی اور ملی مفاد میں کر رہے ہیں لیکن ان سب رپورٹوں اور غیر ملکی اخباروں میں امریکی حکام کا دعویٰ کہ ہمیں خوشی ہے کہ ان کی ریفارم تحریک بارآور ہو رہی ہے اور جب امریکی ڈالر اسی کام کی تکمیل کے لیے وصول کیے ہوں تو بہت نہیں تو تھوڑا سر تو نیچا کرنا ہی پڑتا ہے (شرم آئے نہ آئے)۔

اور پھر کیا کیا جائے کہ جو کچھ ایسی رپورٹوں میں درج ہو وہی ہمارے محترم وزراء کرام

کی پالیسی سٹیٹمنٹ میں بھی درج ہو۔ ملاحظہ ہو وزیر تعلیم کا بیان:

''جنرل مضامین سے اسلامی مواد ہٹادیں گے۔ نیا تعلیمی نصاب زور دے گا کہ پاکستان مذہبی ریاست نہیں، سکولوں میں تنگ نظر مذہبی رجحانات کی حوصلہ شکنی کی جائے گی۔ بچوں کو محض مولوی نہیں بنانا چاہیے۔ دو قومی نظریہ سے پیچھے نہیں ہٹ رہے۔ (نوائے وقت 19 دسمبر 2006ء)

وزیر با تدبیر کو کون بتائے کہ حضور آپ تو وہی زبان بول رہے ہیں جو کہ ہمارے اور آپ کے آقا کے بیانوں اور رپورٹوں میں درج ہیں۔ کون انھیں یاد لائے کہ آپ آئین پاکستان کو بھی بھول گئے ہیں آئین پاکستان کا آرٹیکل نمبر 2 کہتا ہے۔ کہ اسلام مملکت پاکستان کا مذہب ہے۔

Islam shall be state religion of pakistan.

اور ابھی تک آرٹیکل دو الف بھی دستور کا حصہ ہے اور آغاز یا مقدمہ preamble بڑی صراحت کے ساتھ اسلام، عقیدہ اور ایمان سے وابستگی اور عوام کی زندگی اسلام کے اصولوں (جسے انتہا پسندی اور تنگ نظر کا نام دیتا ہے) سے زندگی استوار کرنے کے عزم کا اظہار کرتا ہے۔

اسلام تعلیم کے ذریعہ ہی ذہنی اور فکری انقلاب کا حامی ہے۔ ذہنی تربیت صرف اسلام کو ایک مضمون کے طور پر پڑھانے سے ممکن نہیں ہوتی جبکہ اس مضمون کو بھی خاص ڈھانچے میں ڈھالنے کا اہتمام ہو بلکہ یہ ایک ہمہ گیر پروگرام اور با مقصد تعلیمی پروگرام اور نظم ہی سے آتا ہے۔ اس ذہنی نشوونما میں فرق وہی کر سکتے ہیں۔ جنھوں نے اسلامی سکولوں اور مشنری سکولوں سے فارغ التحصیل بچوں کا موازنہ کیا ہو۔

مغرب کو کس قسم کا اسلام قبول ہے اس کی وضاحت رینڈ کارپوریشن (ایک امریکی تھنک ٹینک) کی رپورٹوں سے عیاں ہے۔ انور سعید ایک امریکی مسلمان مفکر کا کہنا ہے

کہ رینڈ کارپوریشن کی رپورٹیں مغربی کلچر کی یلغار کا حصہ ہیں جو کہ اسلام کا چہرہ مہرہ تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ بی نارڈ (Benard) جوز لمے خلیل زاد کی بیگم (جوز لمے خلیل زاد افغانستان میں امریکہ کے سفیر رہے ہیں آج کل وہ عراق میں ہیں) کی رپورٹ کے بارے میں لکھتی ہیں کہ اس رپورٹ میں تجویز دی گئی ہے کہ امریکہ کو ایک نئے اسلام کی ترویج کا ذمہ اپنے اوپر لینا چاہیے ایک ایسا اسلام جو امریکی مفادات کے مطابق ہو۔

"Berard in her report suggest that America take upon itself to divise nothing less than a new "Islam" carefuly crafted in order to suit American interest."

''بینارڈ نے اپنی رپورٹ میں مشورہ بھی دیا کہ ایک نیا اسلام وضع کرنے کا کام اپنے ذمے لے جو بڑی احتیاط سے گھڑا جائے تا کہ وہ امریکی مفادات کے لیے سازگار ہو۔''

جو پاکستان میں جدت پسند اور نئے اسلام کے حامی اور دیگر سیکولر خیال کی پولیٹیکل پارٹیز قوانین، فوجداری نظام اور نظام تعلیم کو مغربیت کے پیمانے پر جانچتے ہوئے تبدیل کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ مسلمانوں کے قوانین روایات اور نظام کی روح اور مقاصد مغرب کے قوانین، روح اور مطمع نظر اور نظام سے کسی طور میل نہیں کھاتے۔ یہی وجہ ہے کہ دوقومی نظریہ، قائداعظم محمد علی جناح شاعر مشرق کے خیالات اور سوچ کو نئے معانی پہنائے جا رہے ہیں بلکہ اب تو کچھ لوگ دوقومی نظریے کے سانحہ 1971ء کے ساتھ ہی کالعدم اور غیر مؤثر ہونے کا پرچار بھی کر رہے ہیں۔ یقین نہیں آیا کہ دیکھیے اخبار ڈان کا اداریہ مورخہ 9 دسمبر 2006ء۔

اس یلغار کو روکنے کے لیے اسلامیان پاکستان کو آئین پاکستان، اس کے اسلامی نظریہ اور نظام کو بچانے کے لیے ایک سوچ اور ایک انداز کے ساتھ متحد ہو کر آگے آنا ہوگا۔

وگرنہ خالق و مالک کا فیصلہ تو اٹل ہے ہی۔[1]

زیر بحث قانون کی وضاحت کے لیے چند واقعات اور خبریں

علاوہ ازیں چند واقعات بھی جو اخبارات میں شائع ہوئے ہیں، ہماری آنکھیں کھولنے اور اس قانون کی اصل حقیقت (جس کی وضاحت مذکورہ سطور میں کی گئی ہے) مزید واضح کرنے کے لیے کافی ہیں، مثلاً: پیر پگاڑا نے اپنے اخباری ویاکھیان میں کہا:

''خواتین حدود بل وقت کی ضرورت ہے...... چار دیواری کے اندر بے ہودگی کی اجازت ہونی چاہیے۔''[2]

بے ہودگی کا مطلب، وہی جنسی آزادی ہے جس کی سہولت تحفظ خواتین ایکٹ میں دی گئی ہے۔ پیر پگاڑا نے اس کی تائید کی ہے۔ سچ ہے ؎

کند ہم جنس باہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز

ایک اور خبر ملاحظہ فرمائیں۔

دیپالپور: حدود قانون کی مخالفت پر دو نوجوانوں نے بزرگ کو پیٹ ڈالا

نوجوان قانون پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے بزرگ نے حقیقت بتائی تو وہ برہم ہو گئے

دیپالپور (نامہ نگار) تحفظ حقوق نسواں بل پر دو نوجوان ایک بزرگ سے جھگڑ پڑے۔ تفصیلات کے مطابق گزشتہ روز مقامی کالج کے دو طالب علم کالج سے چھٹی کے بعد جنرل بس اسٹینڈ میں موجود حمام میں آئے اور کنگھا کرنے لگے، اسی دوران ایک طالب علم نے اپنے دوسرے دوست طالب علم کو مخاطب ہو کر کہا کہ تحفظ حقوق نسواں بل اب پاس ہو چکا

1 روزنامہ نوائے وقت، لاہور، 4-5 جنوری 2007ء۔ 2 نوائے وقت، لاہور۔ 7 دسمبر 2006ء۔

ہے اور مکمل آزادی ہو گئی ہے، اب اپنی دوست لڑکی کو کہیں لانے یا لے جانے میں کوئی دقت نہیں رہی۔ اب پولیس کو کوئی اختیار نہیں رہا کہ وہ کسی کو پکڑے یا مقدمہ درج کرے۔ان کی گفتگو سن کر حمام میں موجود عمر رسیدہ بزرگ نے ان سے کہا کہ آپ کو اس وقت اس بات کا احساس ہوگا جب تمھاری بہن یا بیٹی سے کوئی ایسا کرے گا اور شکایت لے کر جاؤ گے اور پولیس تمھیں قانونی کارروائی کرنے سے معذرت کرے گی جس پر وہ دونوں طالب علم شدید مشتعل ہو گئے اور اس کے گلو گیر ہو گئے اور غلیظ گالی گلوچ کرنا شروع کر دی۔قریبی دوکانداروں نے حمام کے اندر جا کر بزرگ کی جان چھڑائی۔[1]

ایک اور مراسلہ ملاحظہ ہو جو ''نا دیدنی'' کے عنوان سے نوائے وقت لاہور (9 جنوری 2007ء کی اشاعت) میں شائع ہوا ہے۔

نادیدنی

مکرمی! شام کے 4 بجے تھے۔ ہم اپنی بیگم کو ساتھ لے کر لاہور کے ایک پارک میں واک کے لیے گئے اور بھی بہت سے مرد و خواتین اور بچے سیر و تفریح میں مشغول تھے۔اور سورج کی ہلکی تمازت کو انجوائے کر رہے تھے۔ میری بیٹی اور اس کا دو سالہ بیٹا بھی وہیں آ گئے کہ ہم نے دیکھا کہ ایک نوجوان قریباً چوبیس پچیس سال کا بغیر آستین کے ٹی شرٹ اور کالے رنگ کی پینٹ پہنے ہلکی ہلکی جوگنگ کر رہا ہے تھوڑا پیچھے سے ایک اٹھارہ انیس سال کی لڑکی کانوں میں ہیڈ فون لگائے چست ولایتی جامہ پہنے بھرپور جوگنگ کرتی ہوئی آئی۔ جونھی وہ اس نوجوان کے پاس سے گزری ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ہم لوگ دیکھتے ہی رہ گئے۔ان دونوں کے بازو ایک دوسرے کی کمر میں حمائل ہو گئے اور چند قدم اسی طرح ''مخلوط'' جوگنگ ہوئی اور پھر شائد شدت جذبات کا غلبہ ہوا کہ دونوں ایک

1. بشکریہ ماہنامہ ''حرمین''، جہلم، نومبر، دسمبر 2006ء۔

دوسرے سے لپٹ گئے۔ تمام دوسرے جوگنگ اور واک کرنے والے مردوزن دم بخود کچھ خواتین نے منہ پرے کر لیے۔ وہ تو بھلا ہو وہاں موجود سکیورٹی گارڈ کا کہ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ بھاگتا ہوا آیا اور بآواز بلند کہا کہ صاحب یہ کوئی پیرس نہیں ہے، آپ کیا کر رہے ہیں اور ان دونوں نے اسی طرح لپٹے ہوئے حیرانگی اور حقارت سے گارڈ کی طرف دیکھا جس پر اس نے ہمت کی اور ان کو ایک دوسرے کے ''پنجوں'' سے چھڑایا۔

آپ لکھتے رہیے اپنی اقدار کے متعلق آپ کہتے رہیے کہ ہم غلام در غلام ہوتے جا رہے ہیں اور ان کے جواب بھی سن رہے ہیں کہ کیا مرد عورتیں اکٹھے ہوائی جہاز میں سفر نہیں کرتے کیا دفتروں میں کام نہیں کرتے کیا اکٹھے شاپنگ نہیں کرتے تو اکھٹے بھاگ لیا تو کیا۔ اور پھر یہ بھی تو کہا گیا کہ جنھیں شرم آتی ہے یا جنھیں نہیں دیکھنا تو وہ گھر بیٹھیں یا منہ پرے کر لیں۔ ہم تو گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اگر Libralism اور Moderanism ہمارے پارکوں ہمارے لڑکوں، یعنی ہمارے گھروں میں آ جائے تو پھر کیا کریں؟ گھروں سے نکل کر ویرانوں میں چلے جائیں یا پھر حضرت اکبر الہ آبادی کے مطابق ؎

میں نے تو یہ سوچ رکھا ہے کہ اکبر آج سے
خانقاہ میں بیٹھ جاؤ ڈٹ کے قوالی سنو [1]

ایک اور اخباری تبصرہ ملاحظہ ہو:

''دو غریب لڑکیوں سے جبری زیادتی، یعنی Rape کا ایک کیس سامنے آیا۔ دونوں مظلوم لڑکیاں بیان درج کروانے عدالت پہنچ گئیں اور وہاں زاروقطار روتی رہیں۔ اس واقعے کی خبر اخبارات میں، اس لیے چھپ گئی ہے کہ تحفظ خواتین آرڈی نینس ابھی سینیٹ سے پاس نہیں ہوا ہے۔ یہ قانون پاس ہو کر

---

1 سید محمد بابا رشاہ...... لاہور۔ (روزنامہ ''نوائے وقت'' 9 جنوری 2007ء)

نافذ ہونے دیں، پھر دیکھیے گا کہ ریپ کی شکار کس عورت میں اتنی ہمت ہوتی ہے کہ وہ انصاف کے لیے فریاد کرے اور اخبارات میں خبر چھپوائے؟ بہر حال دو چار دن کی بات ہے ایسی خبریں خلاف قانون قرار پائیں گی۔''

ایک اور اخباری کالم ملاحظہ ہو

''یہ بل خواتین اور ان کے دوست مردوں کے حق میں ہے یا نہیں یہ پولیس کے خلاف ضرور ہے۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ اس زنانہ و مردانہ تعلق اور رابطے میں پولیس کو دخل اندازی میں مشکل پیش آئے گی اور ایسی خبریں بند ہو جائیں گی جن میں بتایا جاتا ہے کہ کل رات فلاں ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس پر چھاپہ مار کر اتنی عورتوں اور اتنے مردوں کو فحاشی اور بدکاری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا، اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کی خبر میں نے کبھی شاذ و نادر ہی دیکھی ہے کیونکہ پولیس کی خصوصی دلچسپی گرفتاری کی حد تک ہوتی ہے اور اس کارروائی کے ثمرات سے اس کے بعد اگر یہ کیس عدالت میں جاتا ہے تو پولیس کی بلا سے وہاں عدالت جانے یا وکیل حضرات۔ مشہور ہے کہ لاہور کے ایک وکیل صاحب جنھوں نے اپنا کیمپ آفس تھانہ ٹبی (بازار حسن) کے قریب قائم کر رکھا تھا، اپنے پاس ضمانت ناموں کے عدلیہ سے دستخط شدہ فارم رکھا کرتے تھے اور بوقت ضرورت ان میں ملزم کا نام بھر کر تھانے میں پہنچ کر ملزم کو ضمانت پر رہا کرا لیتے تھے، خود پولیس بھی مقدمہ درج کرنے سے پہلے پہلے ایسی رہائی کر دیا کرتی ہے۔ پولیس کو مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب وہ مقدمہ درج کر کے چالان عدالت میں بھجوا دیتی ہے اور اس طرح ملزم اس کے ہاتھ سے نکل کر عدالت کے سپرد ہو جاتا ہے۔

یہ بل جسے تحفظ نسواں بل کہا گیا ہے، میں نے بھی پڑھنے کی کوشش کی ہے لیکن سوائے اس کے کہ اب مرد عورت کے تعلقات میں خاصی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں، بات زیادہ سمجھ

میں نہیں آسکی وہ تو نفاذ کے لیے جب قانون تیار ہوگا تو کسی وکیل صاحب سے اس کے اسرار ورموز سے باخبر ہونے کی کوشش کی جائے گی، ویسے ہم عام لوگوں سے زیادہ پولیس والوں کو فکر ہوگی اور جب وہ قانون اس کے پاس پہنچے گا تو پولیس کے ماہرین اس پر غور کریں گے اور اس نئے قانون کو اپنے لیے مفید اور کارآمد بنانے کے راستے تلاش کریں گے۔ خیال یہی ہے کہ ماہرین پولیس اس قانون کو کارآمد بنانے کے کئی راستے تلاش کر لیں گے کیونکہ آج تک کوئی قانون ایسا تیار نہیں کیا جا سکا جس سے تھانیدار اور پٹواری کو بے بس کیا جا سکے۔ مشہور ہے کہ ایک سرکاری اہلکار شدید قسم کا بدعنوان تھا، بہت سوچا گیا کہ اس کو کیا ڈیوٹی دی جائے کہ وہ بدعنوانی نہ کر سکے۔ عقلمند اہلکاروں نے طے کیا کہ اسے دریا کی لہریں گننے پر لگا دیا جائے وہاں وہ کیا کر سکے گا، چنانچہ اسے دریا کے کنارے بھیج دیا گیا، چند دن بعد وہاں سے بھی اس کی شکایتیں آنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ لہروں کی گنتی کے دوران کوئی کشتی ادھر سے گزرتی تو وہ ملاح کو پکڑ لیتا کہ تم نے میری گنتی خراب کر دی ہے اور لہروں کا حساب کتاب گڑ بڑ کر دیا ہے۔

اس بل کی منظوری پر بازار حسن وغیرہ میں بہت خوشی منائی گئی ہے اور خوشی منانے والوں نے ایک بات یہ کہی ہے کہ پولیس ہمارے کوٹھوں پر چھاپے مارتی تھی، اب وہ ایسا نہیں کر سکے گی، ان لوگوں کو خوش ہونے کا حق حاصل ہے لیکن عین ممکن ہے ان کی یہ خوشی عارضی ثابت ہو اور پولیس تھانے میں بیٹھی ان پر ہنس رہی ہو کہ خوش ہولو، قانون آنے دو، پھر تمھیں پتہ چلے گا کہ تمھارے تحفظ کا کیا حال ہوتا ہے۔ یوں تو ایک مقابلہ حسن میں شریک ایک پاکستانی لڑکی سحر محمود نے ایک بیان میں خوبصورت جسم کی نمائش کو ملک اور قوم کے لیے بیرونی سرمایہ کاری سے زیادہ مفید اور اس کی نیک نامی اور مشہوری کا بہت بڑا ذریعہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر جنرل مشرف دو برس مزید رہ گئے تو پاکستان میں بھی

ایسا مقابلۂ حسن منعقد ہوگا لیکن معلوم ہوتا ہے اس پاکستانی لڑکی کا واسطہ کبھی قانون پر عمل درآمد کرنے والے پاکستانی اداروں سے نہیں پڑا جو فحاشی کے جرم میں اسے تھانے میں بند کر کے اس کے حسن کا معائنہ کرتے تو اسے پتہ چلتا کہ نمائش حسن اور مقابلۂ حسن کیا ہوتا ہے اور اس سے ملک کی ترقی کیسے ہوتی ہے؟ اس بل کو مغربی دنیا میں بہت سراہا جارہا ہے اور امریکہ سے آنے والی خبروں میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان اپنی دقیانوسیت سے نکل کر روشنی کی طرف بڑھ رہا ہے اور یہ ایک بہت حوصلہ افزا امر ہے۔ مغربی دنیا کے پاس زندگی کا کوئی نظریہ تو ہے نہیں صرف ایک سرمایہ داری کا نظام ہے جو لوٹ مار پر مبنی ہے، اس کے پاس اگر کچھ ہے تو یہ اسکا کلچر ہے جسے وہ مغربی تہذیب وتمدن کا نام دیتا ہے۔ اسی کلچر کو پھیلانا اس کا مشن ہے جسے امریکی دانشور اور سیاستدان ہنری کسنجر نے روشن خیالی اور اعتدال پسندی کا نام دیا ہے۔ ہم نے اس بات کو اپنے پلے باندھ لیا ہے۔ امریکہ اگر روشن خیالی کے اسی رنگ ڈھنگ سے خوش ہوتا ہے تو ہمارا ایک صوفی تو بہت پہلے کہہ چکا ہے کہ ''مینوں نچ یار مناون دے'' یہ جو تحفظ نسواں کا بل ہے اس کا ایک خصوصی فائدہ اسی رقص وسرود کا تحفظ ہے۔ مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہماری سوسائٹی میں راتوں کو جو کچھ ہوتا ہے وہ تو کسی قانونی مدد کے بغیر بھی ہو رہا ہے اور اسے کوئی روک نہیں سکتا، اسے تو انسان کا قدیم ترین پیشہ بھی کہا گیا ہے، اس لیے بہتر یہی تھا کہ اسے ایک قانونی جواز عطا کر دیا جائے کہ چار دیواری کے اندر جو چاہو کرتے رہو مگر اس انقلابی قانون کا فائدہ تب ہوگا جب پولیس کو بھی اس قانون کا قائل کیا جائے گا ورنہ وہ اسے بھی دوسرے کئی قوانین کی طرح ناکام اور اپنی مطلب برآری کا ذریعہ بنالے گی۔ ہمارے قانون سازوں کو اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے اور اس قانون کی روشنی میں پولیس کا ریفریشر کورس کرنا چاہیے۔

اب ایک خاتون کا خط جو ''نوائے وقت کے کالم ''نقش خیال'' میں شائع ہوا ہے،

ملاحظہ فرمائیں۔

''یوں تو ''مضامین تازہ'' کا ایک انبار سا لگا ہے اور ہر موضوع دامانِ قلم کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے لیکن آج ای ایم ای سوسائٹی لاہور سے مسز شہناز چودھری کا خطہ ملاحظہ فرمائیے:

آداب: ''نوائے وقت'' میں آپ کا کالم ضمیر کو تازہ دم رکھے ہوئے ہے۔ کاش آپ کی آواز صاحب اقتدار لوگوں تک بھی پہنچ پائے۔ آج کل تو روزانہ ہی تواتر سے ایسی دل خراش خبریں آ رہی ہیں کہ دل سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ ذرا ان خبروں کا تسلسل ملاحظہ ہو۔

① حدود آرڈی نینس میں ترمیم کا بل منظور ہو گیا۔

② صدر اور وزیر اعظم نے اس بل کی منظوری پر قوم کو مبارک باد دی۔

③ ٹونی بلیئر کی آمد پر فیصل مسجد میں، لاؤڈ سپیکر پر عصر کی اذان کی ممانعت کر دی گئی۔

④ فوج کا موٹو، ایمان، تقویٰ، جہاد فی سبیل اللہ بدلہ جا رہا ہے۔

میں تو حیران ہوں کہ مسلمان ہوتے ہوئے ان خبروں پر مجھے ہارٹ اٹیک کیوں نہیں ہوا اور ہمارے علمائے کرام میں سے بھی کسی کی حرکت قلب بند نہیں ہوئی۔ میں سوچ رہی ہوں کہ اب جو خبریں آنے والی ہیں، وہ کچھ اس طرح کی ہوں گی۔

① توہین رسالت پر موت کی سزا ختم کر دی گئی۔ (میرے منہ میں خاک)

② مرتد کی سزا ختم کر دی گئی۔

③ اسقاطِ حمل کی قانونی اجازت دے دی گئی۔

④ ہم جنس پرستی جائز قرار دے دی گئی۔

⑤ پاکستان میں مقابلۂ حسن کا انعقاد ہو رہا ہے۔

⑥ شراب پر عائد پابندی ختم کر دی گئی ہے۔

⑦ جوا خانوں کی تعمیر کی قانونی اجازت دے دی گئی۔

یا پروردگار! یہ سیلاب کہاں جا کر رکے گا؟ کون اس کے سامنے بند باندھے گا؟ ہم یہ سب کچھ سننے، سب کچھ دیکھنے کے لیے کیوں زندہ رہے؟ کوئی تو اٹھے جو کہے کہ جو یہ خرافات چاہتے ہیں، ان کے پاس تو پہلے ہی امریکی ویزے ہیں، وہ وہاں کیوں نہیں چلے جاتے؟ وہ ہمارے اس جنت جیسے پاک وطن کو کیوں ناپاک کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟ کیا یہ پچھلے سال 18 اکتوبر (2006ء) کا زلزلہ بھول گئے ہیں؟ اب یہ کون سے عذاب الٰہی کو دعوت دے رہے ہیں؟۔

قوم کو مہنگائی، فحاشی، عریانی اور ناچ گانے کے چکر میں الجھا کر، اسے بے حس کر دیا گیا ہے۔ اسے ان سات برسوں کے دوران تقسیم در تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اب اگر خدانخواستہ کسی طرف سے مشرق یا مغرب سے ہم پر یلغار ہوئی تو کون لڑے گا؟ کیا ہم عراقی قوم کی طرح لڑ سکتے ہیں جنھوں نے امریکہ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا؟ کیا ہم افغانیوں کی طرح روکھی روٹی پیاز کے ساتھ کھا کر دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ پہلے تو ہندوستان سے لٹ کر اپنے گھر اور زمینیں جلتی چھوڑ کر ہمارے والدین اور آباء و اجداد پاکستان آ گئے تھے، اب وہ کہاں جائیں گے؟ اے غفور الرحیم! ہمارے حکمرانوں کے دل اور دماغ کو بدل دے۔ یا اللہ ان کو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت دے؟ آخر انھوں نے امریکہ کو کیوں خدا مان لیا ہے؟

آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے نوجوان، جذبۂ جہاد کے تحت ہی فوج میں جاتے ہیں۔ اگر آپ ''جہاد'' کے نعرے کو ''اتحاد'' سے بدل دیں گے تو کون جائے گا؟ کیسا اتحاد؟ ہمارے حکمران اور سیاستدان اتحاد پیدا کر رہے ہیں یا اتحاد کو پارہ پارہ کر رہے ہیں؟ اگر جہاد کا نعرہ تبدیل کیا جا رہا ہے تو فوجی تربیت گاہوں کا نصاب بھی ضرور بدلا جا رہا ہوگا؟

کیا اس میں سے بھی جذبۂ جہاد اور جذبۂ ایمان پیدا کرنے والی وہ آیات نکالی جارہی ہیں جو ایک فوجی کیڈٹ میں (Motivation) پیدا کرتی ہیں؟ کوئی ہے جو وہاں کی خبر لائے؟
میں نے 21 سال پڑھایا ہے۔ میں سائنس کی لیکچرار رہی ہوں جس نے بچوں کے سامنے ڈاکٹر قدیر کو رول ماڈل کے طور پر پیش کیا۔ میرے بہت سے شاگرد K.E.L اور غلام اسحاق خان انسٹی ٹیوٹ میں کام کررہے ہیں اور ہمارے ہیرو کا کیا حال کردیا گیا ہے؟ عرفان صاحب! اب لکھا نہیں جارہا۔ دماغ شل ہوگیا ہے۔ کوئی تو کچھ کرے۔ یا اللہ تو ہی رحم کر (آمین)۔"

اب اصل قانون پر گفتگو، صرف ایک نکتے پر بحث

زنا کے انسداد کو حکومت کی ذمے داری سے نکال کر اسے انفرادی اور پرائیویٹ معاملہ قرار دے دیا گیا ہے، جیسے کسی کا کوئی نقصان ہو جائے، اس پر کوئی ظلم و زیادتی کرے، اس کی جائیداد پر ناجائز قبضہ کرے تو وہ عدالت میں مقدمہ دائر کرے اور وہاں سے سالہا سال کی مقدمہ بازی کے بعد اور وکیلوں کی بھاری فیسیں اور عدالتی اخراجات کے بعد حصولِ انصاف کی کوشش کرے۔

اسی لیے اس جرم کو پولیس کی مداخلت سے بالکل آزاد کردیا گیا ہے، جبکہ کوئی سگنل توڑ دے یا کسی گھر میں جعلی نوٹ چھاپنے کی پولیس کو اطلاع ملے تو اس قسم کے معمولی جرائم میں پولیس مداخلت کرسکتی ہے، پکڑ دھکڑ کرسکتی ہے۔ گھروں کے اندر چھاپے مار سکتی ہے لیکن زنا کاری اتنا ہلکا جرم ہے اور زنا کار مرد و عورت اتنے محترم ہیں کہ پولیس اس پر مطلع ہونے کے باوجود ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکتی۔ اس کی تفصیل

خوش تر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

کے مصداق، ایک محترم کالم نگار جناب ثروت جمال اصمعی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

''حقوق نسواں بل کی منظوری کے بعد جو صورت حال پیدا ہوگئی ہے وہ یہ ہے کہ فرض کیجیے خدانخواستہ آپ کے پڑوس میں بدکاری کا کوئی اڈہ کھل جاتا ہے۔تو اب آپ نہ تو اس کی رپورٹ مقامی تھانے میں کر سکتے ہیں، نہ پولیس ازخود اس کے خلاف کوئی کارروائی کرسکتی ہے۔آپ اس اڈے کو بند کرانا چاہتے ہیں تو آپ کو سیشن کورٹ سے رجوع کرنا ہوگا۔تاہم وہاں بھی محض کوئی رپورٹ درج کرانے سے کام نہیں بنے گا۔اگر آپ کے سر میں بدی کے خاتمے کا سودا سمایا ہے تو اس کے لیے پہلے چار ایسے افراد تیار کرنے ہوں گے جو تحریری اور حلفیہ گواہی دے سکیں کہ اس اڈے پر بدکاری ہوتے انھوں نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہے، پھر ان چاروں کو لے کر آپ کو عدالت جانا ہوگا۔عدالت کے طریق کار کے سارے تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔اس کے بعد یہ چاروں گواہ آپ کی مدعیت میں اپنے حلفیہ تحریری بیان جمع کرائیں گے۔اس کے باوجود جج صاحب کو اگر آپ کے دعوے اور گواہوں کے بیانات پر اطمینان نہیں ہوتا تو وہ آپ پانچوں کے خلاف کسی مزید ثبوت کے بغیر اور آپ کو اپنے دفاع کا کوئی موقع دیے بغیر محض اپنی صوابدید پر حد قذف جاری کرسکیں گے جو شرعاً تو اسی کوڑے ہے مگر نئے قانون میں پانچ سال قید مقرر کی گئی ہے، یعنی آپ میں سے ہر ایک کو معاشرے کو برائی سے پاک کرنے کے شوق کی پاداش میں پانچ سال قید کی سزا بھگتنی ہوگی۔گویا بدکاری اب ریاست کے خلاف کوئی جرم نہیں ہے۔ریاست اپنے طور پر اسے ختم کرنے کی ذمہ دار نہیں ہے۔فحاشی کے اڈوں کی روک تھام اب پولیس اور انتظامیہ کے فرائض میں شامل نہیں ہے۔اگر کسی کو اس سے تکلیف پہنچ رہی ہو تو وہ خود گواہ لے کر عدالت جائے اور مجرموں کو سزا دلانے سے

کہیں زیادہ یقینی طور پر خود سزا پانے کے لیے تیار ہو کر جائے۔ ظاہر ہے اس کے بعد اگر طوائفوں نے اس بل کی منظوری پر مٹھائیاں بانٹی ہیں تو انھیں ایسا کرنا ہی چاہیے تھا۔ یہی صورت حال اس شخص کو بھی پیش آئے گی جس کی کسی عزیزہ کے ساتھ جبراً زیادتی کی گئی ہو۔ مجرم کے خلاف چار گواہ تیار کر کے انھیں عدالت لے جانا ہوگا اور ان گواہوں کو بھی قذف کی سزا کا خطرہ مول لے کر گواہی دینی ہوگی۔ ریاست اور اس کی مشینری مجرم کے خلاف کسی تفتیش اور جرم کے ثبوت کی تلاش کی ذمہ داری سے مبرا ہوگی، پھر اگر کسی پر جرم مکمل طور پر ثابت بھی ہو جائے تو اسے قرآن وسنت میں مقرر کردہ سزا دینے کے بجائے جج اپنی صوابدید کے مطابق کچھ قید اور جرمانے کی سزا دے کر اس کی گلو خلاصی کر دے گا۔ اس طرح یہ قانون قرآن وسنت کی منشا کے بالکل برعکس مجرم کے لیے سہولتیں فراہم کرے گا جبکہ اس کی ہوس کا نشانہ بننے والی مظلوم عورت کی ریاست کوئی مدد نہیں کرے گی بلکہ اس کی دادرسی کی راہ میں تقریباً ناقابل عبور مشکلات حائل ہوں گی۔ اسی لیے علماء کرام اس قانون کو انسداد بدکاری کے بجائے قرآن وسنت سے صریحاً متصادم فروغ بدکاری کا قانون قرار دے رہے ہیں۔[1]

اس زنا کو پولیس کے دائرۂ کار سے نکالنے کے لیے عذر یہ تراشا گیا ہے کہ ایک تو پولیس لوگوں کو ہراساں کرتی ہے، دوسرے، گھروں کی حرمت پامال ہوتی ہے۔ سبحان اللہ۔ اسے کہتے ہیں ع

عذرِ گناہ بدتر از گناہ

کوئی ان سے پوچھے: کون سا قانون یا معاملہ ایسا ہے جس میں پولیس کا رویہ نامعقول نہیں ہوتا؟ پھر تو ہر معاملے میں ہی اور ہر قانون پر عمل درآمد کرانے میں ہی پولیس کا

1 روزنامہ ''جنگ'' لاہور۔ 10 دسمبر 2006ء۔

کردار ختم کرنا چاہیے نہ کہ صرف زنا کے معاملے ہی میں۔

اسی طرح گھر کی حرمت کا خیال زنا کاروں کے معاملے ہی میں کیوں؟ کسی بھی معاملے میں پولیس کو گھروں میں چھاپے مارنے کی اور گھروں کی حرمت پامال کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسئلہ نہ گھر کی حرمت کا ہے اور نہ پولیس کے ہراساں کرنے کا، اصل بات جو اس قانونِ زیر بحث کے خالقوں کے ذہنوں میں ہے وہ ہے بدکاری کو فروغ دینا اور اس راہ کی تمام رکاوٹوں کو دُور کرنا۔

■ مذکورہ تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ جرم زنا کو نا قابل دست اندازیٔ پولیس ہی قرار نہیں دیا گیا بلکہ مقدمے کے اندراج کا طریقہ بھی ایسا انوکھا ایجاد کیا ہے جو ساری دنیا سے نرالا ہے اور ایسا مشکل ہے کہ کوئی زنا کی شکایت درج ہی نہیں کرا سکے گا۔ گویا

نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی

■ پھر زنا کی تقسیم زنا بالرضا اور زنا بالجبر کا پس منظر بھی مغربی معاشرہ ہے۔ اسلام میں زنا کی یہ تقسیم نہیں، ہر دو صورت میں اجنبی مرد و عورت کا آپس میں جنسی تعلق قائم کرنا زنا ہے اور دونوں قسم کی سزا بھی ایک ہے، البتہ جبر کی صورت میں حد کا نفاذ صرف جبر کرنے والے پر ہوگا، مجبور مرد یا عورت مستثنیٰ ہوگی۔ اسلام میں زنا کی دو قسمیں نہیں، البتہ زنا کاروں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک شادی شدہ زانی۔ اور دوسرا غیر شادی شدہ (کنوارا) زانی اور ان دونوں کی سزاؤں میں بھی فرق ہے۔ شادی شدہ زانی مرد و عورت کی سزا سنگساری (رجم) ہے، یعنی نہایت عبرت ناک انداز سے پتھر مار مار کر اس کی زندگی ختم کر دینا ہے اور کنوارے زانی مرد و عورت کی سزا سو کوڑے ہیں۔

■ سب سے بڑا ظلم زنا کی اصل سزا کا خاتمہ ہے جو سو کوڑے یا رجم ہے جیسا کہ ابھی

وضاحت کی گئی۔ اسی طرح قذف کی اصل سزا بھی، جو اسّی کوڑے ہے، ختم کر دی گئی ہے اور ان کی جگہ دونوں جرموں کی سزا 5 سال تک قید اور 10 ہزار روپے تک جرمانہ ہے، البتہ زنا بالجبر کی سزا 45 سال قید یا موت ہے۔

یہ تبدیلی قرآن سے بغاوت اور کفر وارتداد کے مترادف ہے۔ ان تمام حضرات کو جنھوں نے اس کو معرض تحریر میں لانے، اس کی بابت فکری مواد مہیا کرنے، اس کی نوک پلک سنوارنے اور اس کو پاس کرانے میں، گونگے شیطان بنے، حصہ لیا۔ ان سب کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے اور اگر ایمان کی کوئی رمق ان کے اندر باقی ہے تو توبہ کر کے اپنے ایمان کی تجدید کرنی چاہیے۔ کیونکہ قرآن کا فیصلہ ہے:

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ ﴾

''آپ کے رب کی قسم! یہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو حَکَم (ثالث) تسلیم نہ کر لیں، پھر آپ کے فیصلوں پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور دل و جان سے اس کو تسلیم کر لیں۔''[1]

نیز فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِينًا ۝ ﴾

''کسی مومن مرد اور کسی مومنہ عورت کے یہ لائق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو (اس کے بعد) ان کے معاملے میں ان کا اختیار ہو۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے، یقیناً وہ کھلی گمراہی میں جا پڑا۔''[2]

1 النسآء 25:4 ۔ 2 الأحزاب 36:33 ۔

ایک اور ستم ظریفی یہ کی گئی ہے کہ 16 سال سے کم عمر کی لڑکی اگر بدکاری کا ارتکاب کرے گی تو ہمیشہ کے لیے یہ قطعی اور پیشگی فیصلہ کر دیا گیا ہے (گویا کہ اس قانون کے بنانے والے علام الغیوب ہیں) کہ یہ زنا بالجبر ہی ہوگا، اس لیے سولہ سال سے کم عمر کی بچی سزا سے مستثنیٰ ہوگی اور سزا صرف مرد کو ملے گی (اگر ملی تو)۔

ظاہر بات ہے کہ ایک تو قطعی فیصلہ یکسر غلط ہے، 15،14 سال کی بچیاں رضا مندی سے زنا کر سکتی ہیں۔ دوٹوک انداز میں اس کی نفی کر دینا ہر لحاظ سے غلط ہے۔

دوسرا، یہ باور کر لیا گیا ہے کہ لڑکی سولہ سال سے پہلے بالغ نہیں ہوتی۔ یہ بھی حقائق و واقعات کے یکسر خلاف ہے۔ بلوغت کا تعلق صرف عمر سے نہیں ہے بلکہ علامات سے زیادہ ہے جیسے احتلام، حیض وغیرہ۔ بالخصوص آج کل ہمارے ملک میں 12 سال سے 15 سال کے درمیان اکثر بچیاں بالغ ہو جاتی ہیں۔ بنا بریں اس عمر کی بچیوں کو جنسی خواہش سے مبرا قرار دے کر سزا سے مستثنیٰ کرنا نہایت تعجب خیز امر ہے۔

دراصل اس قانون کے خالق چاہتے یہ ہیں کہ ہمارا معاشرہ جنسی بے راہ روی میں مغرب کے معاشروں سے کسی طرح پیچھے نہ رہے۔ مغرب میں اس عمر کی بچیاں نوجوان لڑکوں سے جنسی تلذذ حاصل کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتیں، حتیٰ کہ ان کو حمل بھی ٹھہر جائے تو یہ بھی ان کے لیے عیب نہیں، نہ معاشرہ ہی ایسی نوعمر بچیوں کے بن بیاہی مائیں بننے پر کوئی حرف گیری یا انگشت نمائی کرتا ہے۔ مغرب کے مشرقی شاگرد بھی یہی چاہتے ہیں کہ یہاں بھی بن بیاہی ماؤں کا ایک طوفان آجائے جیسے مغرب میں یہ طوفان ساری حدوں کو توڑ چکا ہے۔

■ ایک اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ زیر بحث قانون کی ترمیم 5 کی رو سے اگر کوئی خاوند اپنی بیوی سے اُس وقت مباشرت کرے جب بیوی اس کام کے لیے آمادہ نہ ہو تو یہ بھی زنا

بالجبر کا ارتکاب ہوگا جس کی خود ساختہ سزا۔ سزائے موت یا سزائے قید جو کم سے کم دس سال اور زیادہ سے زیادہ 25 سال ہے،...... ہوسکتی ہے اور جرمانے کی سزا کا بھی مستوجب ہوگا۔ کیونکہ اس دفعہ کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

''کسی مرد کو زنا بالجبر کا مرتکب کہا جائے گا جب وہ کسی عورت کے ساتھ مندرجہ ذیل پانچ حالات میں سے کسی صورت میں جماع کرے۔

① اس کی مرضی کے خلاف

② اس کی رضامندی کے بغیر................''

کسی عورت کے عموم میں بیوی بھی شامل ہے کیونکہ حدود آرڈی نینس کے برعکس بیوی یا منکوحہ یا مملوکہ کا استثنا اس میں نہیں ہے، لہٰذا اپنی بیوی کے ساتھ بھی اس کی رضامندی کے بغیر جماع کرنا ایسا جرم ہوگا جس کی سزا، سزائے موت ہوسکتی ہے۔

یہ کوئی خوامخواہ کی موشگافی یا بذلہ سنجی یا لطیفہ گوئی نہیں ہے بلکہ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اظہار اس طبقے کی خواتین کی طرف سے ہوتا رہا ہے جس کی خوشنودی کے لیے امریکہ بہادر بھی ایڈ دے رہا ہے اور اسی کی خاطر یہ سارے پاپڑ بھی بیلے جارہے ہیں۔ مغرب زدہ بیگمات کی اس خواہش کو بھی قانون کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ کوئی مشرقی حیا و وفا کی پیکر عورت چاہے ایسا نہ کرے لیکن مغربی تہذیب کی والہ وشیدا عورت کی شکایت پر مستقبل قریب میں یورپ کی یہ روایت یہاں بھی دہرائی جاسکتی ہے کہ خاوند کے زبردستی جماع کی خواہش پوری کرنے پر خاوند میاں حوالۂ زنداں کر دیے جائیں گے کیونکہ وہاں ایسے مقدمات قائم ہو چکے ہیں اور شوہر میاں سزایاب۔

جبکہ اسلام کا حکم یہ ہے کہ عورت کی طبیعت آمادہ ہو یا نہ ہو، خاوند اگر جنسی خواہش کی تسکین چاہتا ہے تو عورت فوراً سرِ تسلیم خم کردے، خواہ وہ تنور ہی پر بیٹھی ہو۔ اگر وہ ایسا نہیں

کرے گی تو نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ ساری رات فرشتے اس عورت پر لعنت کرتے رہتے ہیں کہ اس نے خاوند کی خواہش کا احترام نہیں کیا۔

■ اسلام میں یہ بھی ہے کہ معاملہ عدالت میں جانے کے بعد یا مقدمے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد کسی کو معاف کرنے کا حق نہیں ہے۔ اللہ کے رسول کو بھی یہ حق حاصل نہیں تھا۔ لیکن زیرِ بحث قانون میں یہ حق صدر مملکت کے علاوہ صوبائی حکومتوں کو بھی دے دیا گیا ہے کہ وہ فیصلہ ہو جانے کے بعد مجرم کو معاف کرسکتی ہیں۔

گویا اول تو اثباتِ جرم کا طریقہ ایسا نرالا، اتنا مشکل اور ایسا پیچیدہ بنا دیا گیا ہے کہ کسی کو زانی ثابت ہی نہیں کیا جاسکے گا اور اگر کوئی کسی وجہ سے مجرم ثابت ہو بھی گیا تو سزا پھر بھی یقینی نہیں، البتہ اس کی بریت اور رہائی یقینی ہے کہ معاف کرنے والے اس کی معافی کا پروانہ جاری کر دیں گے۔

گویا عبرت ناک سزائیں اور اللہ رسول کی مقرر کردہ حدیں ہی ختم نہیں کیں بلکہ اس امر کا پورا اطمینان حاصل کرلیا گیا ہے کہ یہ خود ساختہ برائے نام سزائیں بھی کسی کو نہ مل سکیں اور یوں ہم اپنے مغربی آقاؤں کو یہ کہہ سکیں کہ ہم نے بھی آپ کی طرح زنا کو جرم نہیں بلکہ اس کا ارتکاب کرنے والوں کا ''حق'' سمجھا ہے، ہم بھی آپ ہی کی طرح لبرل اور روشن خیال ہیں، اپنا حق ''وصولنے'' پر سزا کا ہے کی؟ ''انتہا پسند'' بے شک شور مچائیں۔ لیکن کون سنتا ہے فغان درویش۔ یا ع

آوازِ سگاں کم نہ کند رزق گدا را

فتنۂ امامتِ زن

اور

استعمار اور اس کے کارندوں کا کردار

کچھ عرصہ قبل نیو یارک (امریکہ) میں چند مغرب زدہ خواتین و حضرات نے ایک چرچ میں جمع ہو کر ایک عورت کی امامت میں نماز پڑھی۔ ظاہر بات ہے کہ یہ حرکت اسلامی تعلیمات کے بھی یکسر خلاف تھی اور چودہ سو سالہ مسلماتِ اسلامیہ سے انحراف بھی، جس پر بجا طور پر عالم اسلام میں اضطراب وتشویش کی لہر دوڑ گئی اور اسے مغربی استعمار کی ایک سازش سمجھا گیا، نیز اس حرکت کا ارتکاب و اہتمام کرنے والوں کو ان کے کارندے قرار دیا گیا کیونکہ ہدایت کار (Producer) تو وہی تھے اور یہ ''نمازیانِ استعمار'' تو صرف اداکار (Actors) تھے۔

لیکن ہمارے ملک میں بھی متعدد گروہ ایسے ہیں جو یہاں بھی وہی کام کر رہے ہیں جو اسلام دشمن طاقتوں (مغربی استعمار) کا ایجنڈا ہے، ان کے کچھ گماشتے تو ایسے ہیں جو بالکل ظاہر ہیں اور وہ اپنے کو چھپاتے بھی نہیں ہیں، کیونکہ ان کو اپنی فرنگیت مآبی پر فخر بھی ہے اور اس کے پرچار (تبلیغ) کو وہ ملک وقوم کی ترقی کے لیے ناگزیر بھی سمجھتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو ان کے تنخواہ دار یا ''ایڈ'' یافتہ ایجنٹ ہیں۔ انھوں نے مختلف ناموں سے تعلیمی ادارے یا NGOs بنائی ہوئی ہیں اور ان کی آڑ میں مغرب کے مشن کو یہاں فروغ دے رہے ہیں اور بدقسمتی سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جس نے لبادہ مذہب کا اوڑھا ہوا ہے اور

علم و تحقیق کا فروغ، اس کا دعویٰ ہے لیکن کام اس کا بھی وہی ہے جو مذکورہ دو گروہوں کا ہے اور وہ اپنے نتائج ''تحقیق'' بھی وہی نکالتا ہے جو استعمار کو مطلوب ہیں، چنانچہ یہ گروہ ہر ایسے موضوع پر، جو استعمار کی ضرورت ہے، جس سے وہ اسلامی معاشرے کو اسلامی اقدار و روایات سے بیگانہ کر کے مغربی تہذیب و اقدار کا والہ وشیدا بنانا یا اس میں فکری انتشار پیدا کرنا چاہتا ہے، ''تحقیق'' کے نام پر اسے بال و پر مہیا کرتا ہے، اس کے نین نقش سنوارتا ہے اور اس کو ''دلائل'' سے آراستہ کر کے اس جرعۂ تلخ کو شیریں یا اس زہر ہلاہل کو آبِ حیات بنا کر پیش کرتا ہے۔

چنانچہ دیکھ لیجیے! مغربی استعمار، اسلامی سزاؤں کو (نعوذ باللہ) وحشیانہ سمجھتا اور قرار دیتا ہے تو اس گروہ نے بھی حد رجم کا انکار کر دیا، جبکہ یہ حد متواتر روایات سے ثابت ہے اور امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے لیکن یہ گروہ اس کے اسلامی حد ہونے کا انکار کرتا ہے اور اس پر دادِ تحقیق دیتا اور بہ زعم خویش ''دلائل'' کا انبار لگاتا ہے۔ یہ استعمار کی ایک خدمت ہے جو یہ گروہ علم و تحقیق کے نام پر اور مذہب کا لبادہ اوڑھ کر سرانجام دے رہا ہے۔

ناچ گانا اور موسیقی مغربی تہذیب کی روح اور اس کی غذا ہے۔ یہ گروہ ان بے حیائیوں کو بھی نہ صرف سند جواز مہیا کر رہا ہے بلکہ ان کوتاہ آستینوں کی دراز دستی کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے پیکر حیا نبیٔ آخر الزماں رسول اکرم ﷺ کو بھی، جنھوں نے اپنے مقاصد بعثت میں ایک مقصد معازف و مزامیر (گانے بجانے کے آلات) کا مٹانا بھی بتلایا ہے، (نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ) پیشہ ور مغنیات کا گانا سننے کا شوقین قرار دیا ہے۔

تصویر سازی بھی مغرب کی اخلاق سوز، ایمان شکن اور حیا باختہ تہذیب کا بنیادی ستون ہے۔ اس گروہ نے بہ زعم خویش اس حرام کو بھی ماشاءاللہ چشم بد دور اپنے زورِ قلم اور استدلال کی فن کاریوں سے حلال کر دکھایا ہے ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

انگریز کے خود کاشتہ پودے مرزا قادیانی علیہ ماعلیہ کو اپنی جعلی نبوت کے اثبات کے لیے ضرورت تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزولِ آسمانی کا انکار کیا جائے۔ اس گروہ نے بھی مرزا قادیانی کی ہم نوائی کرتے ہوئے اس متواتر عقیدۂ نزولِ مسیح کا انکار کر کے عالمی استعمار کی کھڑی کردہ جعلی نبوت کی عمارت کو سہارا دیا۔

ایک عورت کا مرد و زن کے مخلوط اجتماع میں، امامت کے فرائض ادا کرنا بھی ایک عظیم فتنہ اور اسلام کے صریح احکام سے انحراف و بغاوت کا شاخسانہ ہے۔ اس گروہ نے اس کی بھی تحسین کی اور مئی 2005ء کے ماہنامہ ''اشراق'' لاہور میں اس انحراف و بغاوت کے جواز کے دلائل بھی مہیا فرما دیے گئے ہیں ؎

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں میرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

بہر حال اس گروہ کے اس طرزِ عمل کو استعمار پسندی اور اس کے استعماری مفادات کی پاسبانی کہہ لیجیے یا اس مکھی کا سا رویہ جو صرف گندگی ہی کی تلاش میں رہتی اور اسی پر بیٹھتی ہے۔ یہ گروہ ہر اس بات کی تلاش میں رہتا ہے جس میں اسلام سے انحراف ہو یا اسلامی مسلمات کا انکار ہو، پھر اس کے جواز میں اس کا قلم خار اشگافی شروع کر دیتا ہے، اس کا دماغ شیطانی وحی کی طرح چل پڑتا ہے اور دلائل کو توڑ مروڑ کر یا تاویلات رکیکہ کے ذریعے سے استدلال کا تانا بانا اس طرح بنا جاتا ہے کہ حرام کو حلال اور حلال کو حرام باور کرا دیا جاتا ہے۔ مذکورہ تمام مثالوں میں اس کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔

فتنۂ امامتِ زن کی تحسین، بے مثال ''انصاف'' اور ''دانش و تحقیق'' کی مثال؟

''اشراق'' کے محولہ مضمون سے بھی ہماری باتوں کی تائید ہوتی ہے، مثلاً: دیکھیے!

مضمون کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوتا ہے:

''پچھلے دنوں ایک نیک سیرت اور پڑھی لکھی خاتون نے نیویارک میں جمعہ کی نماز میں مردوں اور عورتوں کی امامت کی۔ پاکستانی میڈیا میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا......''

''اشراق'' کے اس اقتباس اور حد رجم کے سلسلے میں لکھے گئے اہلِ اشراق کے مضامین پر غور کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ گروہ حد درجے کی دو رنگی اور تضادات کا شکار ہے۔ ذرا غور فرمائیے! اس گروہ کے نزدیک چودہ سو سالہ اسلامی مسلمات سے کھلم کھلا انحراف و بغاوت کرنے والی خاتون، جو انحرافی سوچ کی حامل بھی ہے اور اسلام دشمن طاقتوں کی ایجنٹ بھی (جس کی تفصیل ہفت روزہ ''ندائے ملت'' لاہور کے دو شماروں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کی ضروری تلخیص مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں) وہ تو نیک سیرت اور عہدِ رسالت مآب ﷺ میں رجم ہونے والے صحابی ماعز اور ایک خاتون رضی اللہ عنہما، اس گروہ کے سرخیل (اصلاحی صاحب) کے نزدیک (نعوذ باللہ) ''نہایت بدخصلت غنڈہ'' اور ''پیشہ ور طوائف۔''

حالانکہ یہ دونوں اتنے پاک باز اور خوفِ الٰہی سے لرزاں و ترساں تھے کہ خود بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر ان دونوں نے اپنے آپ کو دنیوی سزا کے لیے پیش کیا تاکہ وہ پاک ہو کر اللہ کے پاس جائیں اور نبی ﷺ نے ان کی پاکیزگی اور صدق توبہ کی گواہی بھی دی۔ لیکن وہ پھر بھی بدمعاش کے بدمعاش اور پیشہ ور بدکار (نعوذ باللہ من هذه الهذيانات) اور ان کی زیر بحث "امامن" یا اس تحریک کی سرغنہ ایک ولد الزنا کی ماں ہونے کے باوجود ''نیک سیرت۔''

بے مثال ''انصاف'' اور ''تحقیق'' کی دوسری مثال

دوسری مثال اس گروہ کے عدل و انصاف اور تحقیق کی یہ ہے کہ حد رجم، جو متواتر

احادیث سے بھی ثابت ہے اور اجماع امت سے بھی اور اس ''عملی تواتر امت'' سے بھی جسے یہ گروہ ''سنت'' سے تعبیر کرتا ہے، یعنی ان کے اپنے بنائے ہوئے پیمانے اور معیار سے بھی حد رجم ثابت ہوتی ہے لیکن اسے یہ نکال اور تعزیر کے طور پر تو مانتا ہے لیکن اسے حد شرعی ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ مگر دوسری طرف ایک ضعیف یا کم از کم ایک مختلف فیہ روایت کو بنیاد بنا کر عورتوں کی امامت کے فتنے کو جائز قرار دینے کی مذموم سعی کر رہا ہے، علاوہ ازیں اس روایت میں ایسے کوئی واضح الفاظ بھی نہیں ہیں جن سے یہ معلوم ہو کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے پیچھے نماز پڑھنے والے مقتدی مرد بھی ہوتے تھے (جیسا کہ آگے ہم ان شاء اللہ وضاحت کریں گے)

جبکہ رجم کی روایات اس امر میں واضح ہیں کہ جن کو بھی رجم کی سزا دی گئی، وہ شادی شدہ تھے اور شادی شدہ ہونے کے باوجود ارتکاب زنا کرنے ہی پر ان کو رجم کو سزا دی گئی تھی۔ لیکن یہ گروہ اس روزِ روشن سے زیادہ واضح حقیقت کا منکر ہے اور کہتا ہے کہ زنا کی سزا صرف ایک ہی ہے اور وہ سو کوڑے ہیں، زانی کنوارا ہو یا شادی شدہ۔

تیسری مثال

قرآن کریم میں ہے:

﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾

''زانی مرد اور زانی عورت، ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو۔''[1]

قرآن کا یہ حکم عام ہے، جس میں ہر قسم کے زانی شامل ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور فرمان سے قرآن کے اس عموم کی تخصیص ہوگئی اور یہ بات مسلم ہوگئی کہ قرآن کی بیان کردہ زنا کی یہ سزا ان زانیوں کے لیے ہے جو کنوارے ہوں اور شادی شدہ

1 النور 2:24 .

زانیوں کی سزا رجم ہے، جو حدیث سے ثابت ہے۔ پوری امت نے حدیث رسول سے قرآن کے اس عموم کی تخصیص کو تسلیم کیا اور اس پر امت کا اجماع ہو گیا۔ لیکن یہ گروہ کہتا ہے کہ "یہ تو قرآن کی توہین ہے۔ قرآن کا عموم، رسول اللہ ﷺ کے عمل یا فرمان سے خاص نہیں ہو سکتا۔" وہ اس عمل رسول اور حدیث رسول کو (نعوذ باللہ) قرآن پر زیادتی یا قرآن کا نسخ قرار دیتا اور کہتا ہے کہ یہ اختیار اللہ کے رسول ﷺ کو بھی حاصل نہیں۔

دوسری طرف دیکھیے! قرآن عورتوں کی بابت کہتا ہے:

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾

"تم اپنے گھروں میں ٹک کر رہو۔"[1]

یعنی بغیر ضروری حاجت کے گھر سے باہر نہ نکلو۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عورت کا دائرۂ عمل، امور سیاست و جہاں بانی نہیں، معاشی جھمیلے نہیں، امامت و خطابت کے فرائض ادا کرنے نہیں بلکہ گھر کی چار دیواری کے اندر رہ کر امور خانہ داری سرانجام دینا ہے۔

لیکن یہاں یہ گروہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے، جس کی صحت بھی متفق علیہ نہیں، قرآنی حکم کے برعکس عورت کی امامت و خطابت کا اثبات کر رہا ہے۔ رجم کی متواتر اور متفق علیہ روایات کے ماننے سے ان کے نزدیک قرآن کی برتری مجروح ہوتی ہے لیکن ایک مختلف فیہ روایت کی بنیاد پر حکم قرآنی سے انحراف سے شاید، اس لیے قرآن کی برتری مجروح نہیں ہوتی کہ اس انحراف سے فقیہانِ "اشراق" یا استعمار کے مقاصد کی آب یاری ہوتی ہے۔

حضرت اُم ورقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث اور اس سے استدلال کی حقیقت

بہر حال ان چند مثالوں سے مقصود اس "عدل و انصاف" کی وضاحت کرنا ہے جس کا مظاہرہ مذکورہ منحرفین کا گروہ کر رہا ہے اور اس "علم و تحقیق" کو آشکارا کرنا ہے جس پر

[1] الأحزاب 33:33.

مدعیانِ علم و تحقیق کا یہ گروہ فخر کا اظہار کرتا ہے۔ ورنہ قرآن و حدیث کا دلی احترام صحیح معنوں میں موجود ہو اور مسلماتِ اسلامیہ سے گریز و انحراف بھی ناپسندیدہ ہو تو پھر زیرِ بحث واقعۂ امامت زن کی ناپسندیدگی اور اس کے اسلامی تعلیمات کے یکسر خلاف ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہوسکتا۔

اس نکتے کی وضاحت کے لیے چند باتیں پیش خدمت ہیں۔

■ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث میں، جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نماز پڑھانے کی اجازت دی اور ان کے لیے ایک مؤذن بھی مقرر فرمایا، کئی امور قابل غور ہیں۔

اوّل تو اس حدیث کی صحت متفق علیہ نہیں، محققین حدیث کی اکثریت نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، تاہم بعض نے اسے ''حسن'' تسلیم کیا ہے۔ ہم فی الحال اس کی اسنادی تحقیق سے گریز کرتے ہوئے اور اس کو حسن درجے کی روایت تسلیم کرتے ہوئے یہ عرض کریں گے کہ یہ ایک استثنائی واقعہ ہے یا اس میں عموم ہے؟ ظاہر بات ہے کہ یہ ایک استثنائی صورت ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی حضرت ام ورقہ کے علاوہ کسی اور عورت کو اپنے محلے میں یا اپنے گھر میں نماز پڑھانے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اسی طرح عہد صحابہ و تابعین سے لے کر آج تک امت مسلمہ میں اس کا کہیں اہتمام نہیں کیا گیا، اس لیے ایک استثنائی واقعے کی بنیاد پر مغرب کے نظریۂ مساوات مرد وزن کے ثابت کرنے کا اور اسے ''آزادیٔ نسواں'' کی تحریک کا پیش خیمہ بنانے کا جواز کیا ہے؟ اور کیا اس سے واقعی مغرب کے نظریۂ مساوات کا یا آزادیٔ نسواں کا اثبات ہوتا ہے؟ جن مردوں اور عورتوں نے یا اس کے پس پردہ ہدایت کاروں نے یہ کھٹ راگ رچایا ہے، ان کا مقصد تو اس امامت زن سے نظریۂ مساوات مرد وزن یا تحریک آزادیٔ نسواں ہی کا اثبات ہے۔

اسی لیے اس واقعے میں ''انھیں ریاستی طاقت کی آشیر باد حاصل تھی ...... اس چرچ کے، جہاں یہ نماز ادا کی گئی، چاروں اطراف امریکی پولیس پہرے دار بن کر کھڑے رہی۔''[1]

اس سے واضح ہے کہ اس سازش کو استعمار کی حمایت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں اس میں جس قسم کے لوگ پیش پیش تھے، ان کی تفصیل بھی عائشہ سروری نامی ایک خاتون کے ذریعے سے سنیے! اس خاتون نے امریکا جا کر اور براہِ راست اصل لوگوں سے مل کر یہ تفصیل بیان کی ہے۔ یہ خاتون لکھتی ہے:

''اسریٰ نعمانی امریکی شہری اور طلاق یافتہ ہے اور دو بیسٹ سیلر کتابوں کی مصنفہ بھی۔ اسریٰ نعمانی مورگن ٹاؤن اور ورجینیا میں مقیم مسلمانوں کے نزدیک، اس لیے زیادہ ناپسندیدہ ہے کہ ایک تو وہ مسلمان عورتوں کے حقوق کی متشدد حامی ہے اور دوسرا یہ کہ اس نے طلاق کے چند سال بعد ایک بیٹے کو بغیر نکاح کے جنم دیا...... اسریٰ نعمانی نے ڈاکٹر امینہ ودود سے مل کر مسجدوں میں مردوں کے برابر حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد کا آغاز کیا، جس سے مقامی مسلمانوں میں بہت شدید رنج اور ناراضی کی لہر دوڑ گئی...... نماز جمعہ کی امامت کرانے میں اسریٰ نعمانی اور ڈاکٹر امینہ ودود نے اکٹھے مل کر جدوجہد کی ہے۔ امریکی قوانین انھیں اس سمت میں آگے بڑھنے میں بھرپور مدد فراہم کر رہے ہیں۔''[2]

عائشہ سروری کی بیان کردہ اس تفصیل سے وہ تکون سامنے آجاتی ہے جو اس سازش کی روح رواں ہیں اور وہ ہیں: ایک بدکار عورت اور حرامی بچے کی ماں۔ دوسری خود ڈاکٹر امینہ ودود (امامن اور خطیبن) اور تیسری امریکی حکومت۔ اور اب خود امامن اور خطیبن کا وہ بیان ملاحظہ فرمائیں جو اس نے جمعے کے خطبے میں دیا، اس نے اپنے دیا کھان میں کہا:

---

[1] روزنامہ پاکستان میگزین، ہفت روزہ زندگی، ص:27,3، مارچ 2005ء. [2] بحوالہ اخبار مذکور ''زندگی'' 27 مارچ 2005ء۔

''قرآن نے عورت اور مرد کو برابر کے حقوق عنایت فرمائے ہیں لیکن مسلمان مردوں نے اسلامی تعلیمات کا چہرہ مسخ کر دیا ہے اور عورت کو اس کے حقوق سے محروم کر رکھا ہے۔ یہ مرد عورت کو محض جنسی تفریح سمجھتے ہیں۔''[1]

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث کو، جو ایک استثنائی صورت کی حامل ہے، امریکہ میں پیش آنے والے واقعے کے جواز میں پیش کرنا، قیاس مع الفارق ہے۔ اس واقعے کے اداکار و ہدایت کار تو مسجدوں میں مخلوط نماز کو رواج دے کر مغرب کے نظریۂ مساوات مرد و زن کو، مسلمان معاشروں ہی میں نہیں بلکہ مسجدوں کے اندر بھی نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

کیا فقیہانِ ''اشراق'' جو ان باغیانِ اسلام کی اس مذموم حرکت کو سندِ جواز مہیا کرنے کے لیے کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدانِ صحافت میں اتر آئے ہیں، اس مساوات کے حامی ہیں جس کے قائل امامت زن کے حامی یا اس کے بانی ہیں؟ اگر وہ اس مغربی مساوات کے قائل ہیں، پھر تو ان کی ہم نوائی قابل فہم ہے اور اگر وہ اس مساوات کے قائل نہیں ہیں تو پھر ان کی ہم نوائی کیوں؟ اور اس کی حمایت میں یہ سرگرمی کیوں؟

دوسرا قابل غور پہلو حدیث زیر بحث میں یہ ہے کہ اس کے کسی بھی لفظ سے اس بات کا اثبات نہیں ہوتا کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے پیچھے کوئی مرد بھی نماز پڑھتا تھا۔ محض اس بات سے کہ ایک بہت بوڑھا شخص (شیخ کبیر) ان کے لیے اذان کہتا تھا، یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نماز بھی حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے پیچھے پڑھتا ہوگا۔ اگرچہ بعض لوگوں نے یہ احتمال پیش کیا ہے لیکن محض احتمال سے استدلال جائز نہیں کیونکہ ایک دوسرا احتمال یہ بھی تو ہے کہ اذان دینے کے بعد وہ شیخ کبیر نماز مسجد نبوی ہی میں آ کر پڑھتے ہوں اور یہ

1 اخبار مذکور۔

احتمال زیادہ قوی ہے کیونکہ مسجد نبوی میں نماز کی جو فضیلت ہے، وہ گھر میں نماز پڑھنے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ جب اس میں دونوں ہی احتمال ہیں تو پھر اس احتمال کو ترجیح کیوں نہ دی جائے جو اسلامی تعلیمات کے مطابق بھی ہے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مزاج و سیرت کے موافق بھی۔

پھر اس واقعے سے عورتوں کا مردوں کی امامت کرنے کا جواز کس طرح ثابت ہو سکتا ہے؟

تیسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ حدیث کی جس جس کتاب میں بھی حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث آئی ہے، ان سب کو دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کسی بھی محدث نے اس سے یہ استدلال نہیں کیا کہ عورت مردوں کی امامت کر سکتی ہے۔ اگر اس واقعے میں ایسا کوئی پہلو ہوتا تو کوئی محدث اس پہلو کا بھی اثبات کرتا لیکن کسی ایک محدث نے بھی اس سے یہ مفہوم نہیں سمجھا جو ایک استعمار زدہ ٹولہ یا منحرفین کا گروہ اس سے کر رہا ہے۔ یہ حدیث ابو داود کے علاوہ السنن الکبریٰ للبیہقی، معرفۃ السنن والآثار للبیہقی، سنن دارقطنی، ابن خزیمہ اور مسند احمد کی تبویب الفتح الربانی وغیرہ میں موجود ہے، کسی نے بھی اس حدیث پر ایسا باب قائم نہیں کیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ عورت مردوں کی امام ہو سکتی ہے یا حضرت اُمِّ ورقہ رضی اللہ عنہا کے پیچھے مرد بھی نماز پڑھتے تھے۔

چوتھا قابل غور پہلو، حدیث کے الفاظ أَنْ تَؤُمَّ أَهْلَ دَارِهَا (وہ اپنے گھر والوں کی امامت کرائے) کا مفہوم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دار کا لفظ کئی معنوں کے لیے آتا ہے، گھر کے لیے بھی، حویلی یا محلے کے مفہوم کے لیے بھی اور قبیلے کے لیے بھی۔ سیاق و سباق اور قرینے سے یہ تعین ہوگا کہ کس جگہ یہ لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے، اس لیے یہ کہنا کہ گھر کے لیے یہ الفاظ استعمال ہی نہیں ہوتا، یکسر غلط ہے۔ اس حدیث میں بھی یہ لفظ گھر ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اہل دار سے مراد صرف حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا

کے گھر کی عورتیں ہیں جیسے کہ سنن دارقطنی کے ایک مقام پر یہ روایت ان تؤم اهل دارها کے بجائے أن تؤم أهل نساء ها کے الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔ اور حدیث کا مفہوم اس کے سارے طرق کی روشنی ہی میں متعین ہوتا ہے۔ اسی طرح الموسوعة الفقهية (کویت) میں بھی یہ روایت أَنْ تَؤُمَّ نِسَاءَ أَهْلِ دَارِهَا کے الفاظ کے ساتھ آئی ہے، جس کے لیے انھوں نے سنن ابی داود (397) کے اس نسخے کا حوالہ دیا ہے جو ابو عبید وعاّس کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

سنن دارقطنی اور سنن ابی داود کے نسخے کے یہ الفاظ أن تؤم نساء ها، اور تؤم نساء أهل دارها سے، دوسرے نسخے کے الفاظ أن تؤم أهل دارها کا مفہوم واضح اور متعین ہو جاتا ہے کہ نبی ﷺ نے انھیں اپنے گھر کی عورتوں کی امامت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ اگر دار کو محلے یا حویلی کے معنی میں بھی لیا جائے، تب بھی یہی معنی ہوں گے کہ وہ محلے یا حویلی کی عورتوں کی امامت کرائے۔ اس میں مردوں کی شمولیت کا مفہوم تو پھر بھی شامل نہیں ہوگا۔ اور یہ مسئلہ کہ عورت، عورتوں کی امامت کرے، اس کو سوائے چند ایک فقہاء کے، سب تسلیم کرتے ہیں، اس لیے کہ اس کا ثبوت حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ وغیرہما صحابیات رضی اللہ عنہن سے ملتا ہے، تاہم اس صورت میں عورت، مرد امام کی طرح، صف کے آگے اکیلی کھڑی نہیں ہوگی بلکہ صف کے درمیان کھڑی ہوگی۔

گم راہی اور کج روی کی بنیاد، محدثانہ نقطۂ نظر سے انحراف ہے

بہر حال حدیث سے استدلال کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو محدثین کا ہے (جو استدلال کا واحد صحیح طریقہ ہے) تو اس حدیث ام ورقہ رضی اللہ عنہا سے قطعاً اس بات کا اثبات نہیں ہوتا جو منحرفین کا گروہ یا استعماری مقاصد کے لیے سرگرم ٹولہ اس سے ثابت کرنے

[1] دیکھیے، موسوعہ مذکورہ: 204/6.

کی مذموم کوشش کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس گروہ کے بھی کچھ ذہنی تحفظات ہوتے ہیں، وہ اپنے ذہنی تحفظات ہی کی روشنی میں حدیث سے اخذ و استفادہ کرتا ہے، وہ محدثین کی طرح حدیث کو محض حدیث کے طور پر نہیں مانتا، یعنی اس سے جس مسئلے کا اثبات ہوتا ہے، اگر وہ اس کے ذہنی تحفظات سے متصادم ہوتی ہے تو وہ اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے سارے گروہ نہایت قوی اور صحیح ترین روایت کو تو مسترد کر دیتے ہیں اور نہایت گری پڑی روایت کو اپنا لیتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ محض اس لیے کہ حدیث رسول کو ماننا ان کے پیش نظر نہیں ہوتا بلکہ ان کے اپنے مخصوص مفادات اور ذہنی تحفظات ہوتے ہیں۔ صحیح السند اور قوی روایت اگر ان کے مفروضوں کا ساتھ نہیں دیتی تو وہ مردود اور کوئی ضعیف روایت ان کے مفروضوں کو سہارا دینے والی ہو تو وہ مقبول۔ حتیٰ کہ حدیث سے مطلب برآری کی یہ لَے یہاں تک بڑھتی ہے کہ کسی حدیث کے ایک جز سے اگر ان کا مقصد پورا ہوتا ہے تو وہ تو صحیح قرار پاتا ہے اور اسی حدیث کا دوسرا جز اگر ان کے مقصد سے ہم آہنگ نہیں ہوتا تو وہ غلط قرار پاتا ہے یا پھر اس جز کی کوئی مضحکہ خیز تاویل کر کے اسے بھی اپنے مطلب کا بنانے کی سعی کی جاتی ہے۔

اسی ذہنی تحفظ یا مطلب برآری کا ایک عجیب مظاہرہ ''اشراق'' کے مضمون نگار نے بھی کیا ہے۔ دیکھیے سنن دارقطنی کی روایت کے الفاظ أن تؤم نساء ھا، محدثین کے طریقے کے مطابق، اس روایت کے دوسرے الفاظ (أھل دارھا وغیرہ) کے مفہوم کو متعین اور واضح کر دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ مقصود حدیث سے استفادہ اور اس سے ثابت شدہ بات کو ماننا نہیں ہے بلکہ توڑ مروڑ کر حدیث سے اپنی بات کا اثبات کرنا ہے، اس لیے دارقطنی کی اس روایت کو ''اشراق'' کے مضمون نگار نے بھی پیش کیا ہے۔ لیکن اس نے ترجمے اور مطلب بیان کرنے میں جو گھپلے کیے ہیں، ملاحظہ فرمائیں: پہلے ترجمہ دیکھیں:

''ام ورقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول نے اجازت دے دی تھی کہ اس کے لیے اذان دی جائے اور اقامت کہی جائے اور وہ اپنی عورتوں کی امامت کیا کرتی تھیں۔''[1]

ترجمے کے گھپلے کو سمجھنے کے لیے حدیث کے اصل عربی الفاظ کا سامنے ہونا ضروری ہے۔ یہ الفاظ ہیں:

أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ أَذِنَ لَهَا أَنْ يُّؤَذَّنَ وَيُقَامَ وَتَؤُمَّ نِسَآءَ هَا

اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین حکموں کا بیان ہے۔ ① اس کے لیے اذان دی جائے، ② اقامت کہی جائے ③ اور یہ کہ وہ اپنی عورتوں کی امامت کرے۔[2]

یہ اس کا صحیح ترجمہ بھی ہے اور جس سے صحیح مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ان کو اس بات کی اجازت دی گئی تھی کہ وہ اپنی عورتوں کی امامت کر لیا کریں۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی امامت میں مرد نہیں ہوتے تھے، صرف عورتیں ہوتی تھی۔ لیکن چونکہ مضمون نگار کے پیش نظر تو حدیث ام ورقہ رضی اللہ عنہا سے مردوں اور عورتوں کی مشترکہ امامت کا اثبات ہے، اس لیے اس نے پہلے تو ترجمے میں یہ تصرف کیا کہ ''وہ اپنی عورتوں کی امامت کرے'' کے بجائے ترجمہ کیا ہے:

''اور وہ اپنی عورتوں کی امامت کیا کرتی تھیں۔''

حالانکہ یہ ترجمہ اس وقت ہو سکتا تھا، جب اس میں کانت کا لفظ ہوتا، یعنی وَكَانَتْ تَؤُمُّ النِّسَاءَ۔ یہ غلط ترجمہ، اس لیے کیا کہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا حصہ شمار نہ ہونے دیا جائے، حالانکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان ہی کا ایک حصہ ہے، پھر اس غلط

---

[1] اشراق، ص: 38، مئی 2005ء۔ [2] سنن الدارقطني، باب في ذكر الجماعة وأهلها وصفة الإمام، حديث:1071۔

ترجمے کے ردّے پر دوسرا ردّا یہ چڑھایا، مضمون نگار لکھتا ہے:

''اس روایت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ وہ اپنی عورتوں کی امامت کیا کرتی تھی۔ یہ دار قطنی کے اپنے الفاظ ہیں، حدیث کے الفاظ نہیں، یہ ان کی اپنی رائے ہے، سنن دار قطنی کے علاوہ حدیث کی کسی کتاب میں یہ اضافہ نہیں، اس لیے اس اضافے کو بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا۔'' [1]

یعنی مسئلۂ زیرِ بحث میں جو الفاظ نص قطعی کی حیثیت رکھتے ہیں، پہلے اس کا ترجمہ غلط کیا تا کہ اسے رسول اللہ ﷺ کے فرمان سے الگ باور کرایا جا سکے، پھر اس پر دوسرا ردّا یہ چڑھایا کہ یہ ''دار قطنی کے اپنے الفاظ ہیں، حدیث کے نہیں'' تیسرا ردّا یہ چڑھایا کہ ''یہ ان کی اپنی رائے ہے۔'' چوتھا ردّا کہ ''یہ اضافہ ہے جو دار قطنی کے علاوہ حدیث کی کسی کتاب میں نہیں ہے۔'' اور پھر ٹیپ کا بند، جو اصل مقصود ہے:

''اس لیے اس اضافے کو بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا۔'' [2]

سبحان اللہ، ماشاء اللہ! کیا خوب استدلال ہے، سب کچھ اپنی طرف سے۔ پہلے اپنے ذہن میں ایک نظریہ قائم کیا کہ عورت کا مردوں کی امامت کرنا جائز ہونا چاہیے، پھر جن الفاظ سے اس نظریے کی بیخ کنی ہوتی تھی، ان کا ترجمہ غلط کیا اور انھیں فرمانِ رسول ماننے سے انکار کر دیا اور ان کو بلا دلیل امام دار قطنی رحمہ اللہ کا اضافہ قرار دے کر اسے مسترد کر دیا اور قطعی اعلان کر دیا کہ اس اضافے کو بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا۔

حالانکہ یہ سارے دعوے غلط اور یکسر بے بنیاد ہیں۔ ان الفاظ کا وہی ترجمہ صحیح ہے۔ جو ہم نے کیا ہے اور یہ الفاظ نبی ﷺ ہی کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ہیں، یہ امام دار قطنی رحمہ اللہ کے الفاظ نہیں ہیں، نہ یہ کوئی اضافہ ہے بلکہ نفس مسئلہ میں نص قطعی اور دلیل

---

[1] ''اشراق'' لاہور، مئی 2005ء، ص: 39,38۔ [2] حوالۂ مذکور۔

واضح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ نظر بھی محدثانہ ہو، منہج بھی محدثانہ ہو اور مقصد بھی محدثانہ ہو، یعنی حدیث میں اپنے نظریے کو گھسیڑنا نہیں بلکہ حدیث کی روشنی میں ہر بات کو سمجھنا اور نظریہ قائم کرنا ہو۔ ورنہ وہی بات ہو گی ع

دیدۂ کور کو کیا آئے نظر، کیا دیکھے

فتنۂ امامت زن کی بانی ومحرک اور اس کا کردار، حقائق کی روشنی میں

اس کے بعد ''اشراق'' کے مضمون نگار نے بعض فقہاء کے اقوال امامت زن کے جواز میں نقل کیے ہیں اور اس میں بھی گھپلے کیے ہیں لیکن حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث اور اس سے استدلال کی حقیقت واضح کرنے کے بعد ہم اقوال فقہاء پر بحث کو ضروری نہیں سمجھتے۔ تاہم فتنۂ امامت زن کے برپا کرنے والوں کی بابت اور بہت سی باتیں نہایت مستند ذرائع سے سامنے آئی ہیں، ہم چاہتے ہیں، وہ بھی پیش کر دی جائیں تا کہ اس تحریک کا سارا کچھا چٹھا سامنے آجائے۔

ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری، ڈائریکٹر اسلامی سینٹر، کنکٹی کٹ، اسمٹفرڈ امریکا، لکھتے ہیں:

''عورت کی امامت اور مسجد میں مردوں کے شانہ بشانہ عورتوں کی نماز کی تحریک کی اصل محرکہ اور روح رواں مارگن ٹاؤن، ویسٹ ورجینیا کی ایک نام نہاد مسلمان اسریٰ نعمانی ہے۔ چار سال قبل اسریٰ نعمانی نے عورت کی امامت کے فتنے کی بنیاد اس طرح رکھی کہ وہ اپنی چند ہم خیال عورتوں کو لے کر مارگن ٹاؤن، ویسٹ ورجینیا کی مسجد میں گھس گئی اور ان عورتوں نے مطالبہ کیا کہ انھیں مردوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ مسجد میں انتظامیہ نے انھیں مردوں کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی اجازت دے دی لیکن

مردوں کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے منع کر دیا اسریٰ نعمانی یہ معاملہ عدالت تک لے گئی۔ عدالت نے اسریٰ نعمانی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس عدالتی فیصلے کے بعد سے اسریٰ نعمانی اور اس کے ساتھیوں کا یہ طریقہ کار ہے کہ وہ اعلان کر دیتے ہیں کہ وہ فلاں دن فلاں مسجد میں مخلوط نماز پڑھیں گے، پھر اس دن وہ اس مسجد میں گھس جاتے ہیں، باہر پولیس ان کے تحفظ کے لیے موجود ہوتی ہے......اس اسریٰ نعمانی کے ساتھ ایسے ایسے واقعات وحقائق منسوب ہیں کہ جن کو بیان نہ کرنا ہی بہتر ہے لیکن وہ پوشیدہ نہیں ہیں۔'' [1]

ہفت روزہ ''ندائے ملت'' لاہور کے ایک مضمون نگار نے 31 مارچ 2005ء کے شمارے میں ایک تفصیلی مضمون شائع کیا ہے جس میں اسریٰ نعمانی کی بابت بتلایا گیا ہے کہ یہ سی آئی اے، اسرائیل اور موساد کی ایجنٹ ہے اور ڈینئل پرل (امریکی صحافی) کے ساتھ مل کر بھی اس نے پاکستان میں پاکستانی مفادات کے خلاف کام کیا ہے جس کے دستاویزی ثبوت اس مضمون میں شامل ہیں، ہم ان تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے اس شمارے سے صرف وہ دس سوالات یہاں نقل کرتے ہیں جو مضمون نگار نے اسریٰ نعمانی کو بھیجے ہیں لیکن ابھی تک اس کی طرف سے ان کا جواب نہیں آیا، البتہ اتنا جواب اس نے دیا ہے کہ مجھے آپ کے سوالات مل گئے ہیں اور میں ان کا جواب تیار کر رہی ہوں۔

① یہ سوالات آپ بھی ملاحظہ فرمائیں (دیگر تفصیلات کے لیے مذکورہ شمارہ ملاحظہ فرمائیں)
کیا آپ اللہ اور قرآن کی تشریح کر سکتی ہیں؟

② مسلمان خواتین اپنے والد، بھائیوں اور خاوند سے یہ مطالبہ نہیں کرتیں کہ وہ ان کے

---

[1] ماہ نامہ ''تعمیر افکار'' کراچی، ص: 41,40، مئی 2005ء۔

ساتھ مساجد میں نماز پڑھنا چاہتی ہیں۔ لیکن آپ کی سوچ اور جدوجہد اس سے مختلف ہے، آپ اس کی وضاحت کریں گی؟

③ آپ کی جدوجہد اور کوششوں کے بارے میں یہ رائے بنتی ہے کہ اس کی ڈائریکشن ٹھیک نہیں ہے، آپ کا اس سلسلے میں موقف کیا ہے؟

④ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کی جدوجہد کی روشنی میں مسلمان خواتین کی سوچ تبدیل ہو سکتی ہے؟ اگر آپ اسے ممکن سمجھتی ہیں تو یہ کیسے کریں گی؟

⑤ آپ کی کوششوں اور ''جدوجہد'' کو دیکھتے ہوئے بہت سے ''کھلے ذہن'' کے لوگ آپ کے ساتھ مل گئے ہوں گے، کیا آپ ان کے نام بتا سکتی ہیں؟

⑥ علمائے دین نے آپ کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا ہے، اس بارے میں کچھ کہنا چاہیں گی؟

⑦ کیا آپ شادی شدہ ہیں؟ اگر نہیں تو براہِ کرم اس بات کا جواب دیجیے کہ آپ کے بچے کی پیدائش ناجائز نہیں؟''

ان سوالات کی بابت مضمون نگار نے لکھا ہے:

''اسریٰ نعمانی نے ان سوالات کے جوابات دینے کا وعدہ کیا ہے، جیسے ہی ان کا موقف موصول ہوا، شائع کر دیا جائے گا۔''[1]

ندائے ملت کے اسی شمارے میں مخلوط نماز کی امامت کا فوٹو بھی شائع ہوا ہے، جس میں یہ اسریٰ نعمانی شرٹ پینٹ میں ملبوس کھلے بالوں کے ساتھ نمایاں ہے۔

اس کے بعد ''ندائے ملت'' میں ایک اور مضمون شائع ہوا ہے، یہ سارا مضمون ہی قابل مطالعہ ہے علاوہ ازیں اس میں اس کی جدوجہد کے وہ دس نکتے بھی شامل ہیں جو عورتوں

[1] ہفت روزہ ''ندائے ملت'' لاہور، 31 مارچ 2005ء، ص:11۔

کے ''اسلامی حقوق'' کے پرفریب عنوان پر اس نے مرتب کیے ہیں۔ یہ پورا مضمون بھی ملاحظہ فرمائیں:

''امریکہ میں نماز جمعہ کے مخلوط اجتماع کی امامت کر کے ''شہرت'' حاصل کرنے والی بھارتی نژاد خاتون اسراء نعمانی کے ''کھیل'' کی حقیقت اب کھل کر سامنے آگئی ہے۔ ڈینئل پرل کیس میں ایک ملزمہ کے طور پر سامنے آنے اور پاکستان کے مفادات کے خلاف کام کرنے والی اسراء نعمانی اگرچہ اب یہ کوشش کر رہی ہے کہ کسی طرح امریکہ کے دیگر شہروں میں بھی خاتون کی امامت میں ہی نمازِ جمعہ کے مخلوط اجتماعات کروائے جائیں۔ لیکن اس ایک واقعہ سے ہی لگتا ہے کہ اسراء نعمانی جو بظاہر اسلامی تعلیمات میں تبدیلیوں کے لیے کوشش کر رہی ہے، درحقیقت کیا عزائم رکھتی ہے؟

نیو یارک سٹی کے ایک چرچ میں ادا کی جانے والی نماز جمعہ کے موقع پر اسراء نعمانی کے ''کھیل'' کا بھانڈہ اس وقت پھوٹ گیا جب وہاں اسراء نعمانی سے یہ پوچھا گیا کہ معمول کی اپنی زندگی میں جمعہ کے علاوہ ایک دن میں فرض کی گئی پانچ نمازوں میں سے کتنی نمازیں پڑھتی ہیں؟ اسراء نعمانی اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکی اور غصے کی حالت میں اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کے علاوہ ''ندائے ملت'' نے بھی اس سے جن سوالات کے جوابات پوچھے تھے اُن کا جواب بھی اسراء نے نہیں دیا۔ تاہم اپنی دوسری ای میل میں اسراء نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں آپ کے سوالات کے جوابات پر کام کر رہی ہوں۔

اسراء نعمانی جو ایک طرف تو اسلام میں اکیسویں صدی کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیوں اور خواتین کے حقوق کی جدوجہد کر رہی ہے جبکہ دوسری طرف وہ انھی سوالات کے جوابات دینے سے گریز کر رہی ہے۔ اسراء نعمانی کے بارے میں اور بھی بہت سے

دلچسپ اور انکشاف انگیز حقائق سامنے آئے ہیں جو اس کی سرگرمیوں اور عزائم سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

اسراء نعمانی کے بارے میں بعض ذرائع یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کا اصل نام قرۃ العین نعمانی ہے، تین سال کی عمر میں اس کے والد ظفر نعمانی اسے لے کر امریکی ریاست ورجینیا آ گئے تھے جہاں انھوں نے جنوبی ورجینیا کی ایک یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کر دیا۔ اسراء نعمانی نے بھی بعد میں اسی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ اسراء یونیورسٹی لائف کے دوران اور بعدازاں ایک صحافی کی حیثیت سے اپنے کیریئر کے دوران اپنی روشن خیالی اور کھلے ڈھلے ماحول کی وجہ سے جانی جاتی ہے۔ صحافتی کیریئر کے آغاز میں ہی اس نے افغانستان، تاجکستان اور بھارت کے دورے کیے۔ پاکستان جب وہ پہلی دفعہ آئی تو اس نے اپنے آپ کو ایک طالب علم ظاہر کیا، تاہم یہاں اس کی آمد کا مقصد پاکستان کے مذہبی اور جہادی گروپوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھا۔ اس کام میں اس کی مدد اسرائیل کے دو دوروں کے حوالے سے مشہور ایک مذہبی رہنما نے کی۔ ذرائع کے مطابق اسراء نعمانی نے لاہور میں اپنے ایک انکل اظہر نعمانی کے گھر قیام کیا جن کی رہائش علامہ اقبال ٹاؤن میں ہے اور وہ واپڈا کے ایک اعلیٰ ریٹائرڈ افسر ہیں۔ لاہور کے قیام کے بعد اسراء کراچی چلی گئی۔

اسراء نعمانی کے بارے میں جو مزید انکشاف انگیز حقائق معلوم ہوئے، ان میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جنھیں اخلاقیات کے پیش نظر تحریر بھی نہیں کیا جا سکتا، تاہم اسراء نعمانی کے بارے میں یہ باتیں ضرور قارئین کو بتاتے چلیں کہ مسلمان خواتین کی امامت کرنے والی یہ آزاد خیال خاتون تمام مسلم اور غیر مسلم خواتین کے لیے ہم جنس پرستی، شادی کے بغیر تعلقات، اسقاطِ حمل اور جنسی تجربات کی حامی ہے اور ناجائز بچے کی پیدائش کے بعد

یہی حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ اسراء نعمانی خود اس بارے میں کہتی ہے کہ اس کی جدوجہد خواتین کو بیڈروم میں اسلامی حقوق دلانے کے لیے ہے۔

اسراء کا اس حوالے سے کہنا ہے:

" I offer two charaters of musloms justicc -- an islamrc bill of rights for women in mosques and in islamic bill of raghts for women in the bedroom."

''ان امور کی وضاحت کرتے ہوئے اسراء نے دس ایسی وجوہات بیان کی ہیں جو اس کی خواتین کے لیے ''جدوجہد'' کو بے نقاب کرتی ہیں۔

I. women have an islamic right to respectful and pleasureable sexual experriences.
2. Women have an islamic right to make independent decisions about thier bodies, including the right to say no to sex.
3. Women have an islamic right to make independent decisions about thier partner, including the right to say no to a husband marrying a second wife.
4. Women have an islamic right to make independent dicisions about their choice of a partner.
5. Women have an islamic right to protection form physical, emotional nad sexual abuse.
7. Women have an islamic right to exemption from ceiminalization or punishment for consensual adult sex.
9. Women have an islamic right to exemption from gossip and slander.
10. Women have an islamic right to sexual health care and sex education."

اسراء نعمانی کے ان خیالات اور خواتین کے حقوق کے لیے جدوجہد کی کوششوں کی حقیقت سامنے آنے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسراء نعمانی کا اصل ایجنڈا کیا ہے؟ وہ خواتین کے جن حقوق کے لیے جدوجہد کر رہی ہے اس کے پیچھے کون لوگ ہیں؟

اسراء نعمانی اور ڈاکٹر امینہ ودود ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اسلام کی جو تصویر پیش کر رہی ہیں اس کے خلاف مسلم کمیونٹی میں شدید جذبات پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر امینہ ودود نے نماز جمعہ کی امامت کے دوران عربی میں پڑھے جانے والے خطبہ کی کتاب اپنے پاؤں میں رکھ دی۔ اسراء نعمانی نے اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ خواتین کو مسجد میں داخل ہونے کا، صف میں بیٹھنے کا اور منبر پر کھڑے ہونے کا حق ہے اور ان حقوق کے لیے کوششیں کی جائیں گی۔

اسراء نعمانی مغربی ایجنڈے کو آگے بڑھاتے اور مسلم کمیونٹی کے جذبات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی سی کوششیں کر رہی ہے تاہم اب اس کی پر اسراریت بے نقاب ہونی شروع ہوگئی ہے۔''

مذکورہ دس نکات کا اردو ترجمہ

''ندائے ملت'' کے مضمون نگار نے اسراء کے جن دس نکات کا انگریزی متن نقل کیا ہے، انھوں نے اس کا اردو ترجمہ نہیں دیا، ہم ذیل میں اس کا ترجمہ بھی دے رہے ہیں۔

> ''میں مسلمانوں کے انصاف کے دو منشور پیش کرتی ہوں...... ایک مساجد میں خواتین کے حقوق کا اسلامک بل اور ایک بیڈ روم میں خواتین کے حقوق کا اسلامک بل۔''

مضمون نگار کے بقول ''ان امور کی وضاحت کرتے ہوئے اسراء نے دس ایسی وجوہات بیان کی ہیں جو اس کی خواتین کے لیے ''جدوجہد'' کو بے نقاب کرتی ہیں۔'' (اب اسریٰ کے دس نکات کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے):

① ''عورتوں کا یہ اسلامی حق ہے کہ ان کا جنسی تجربہ احترام پر مبنی اور خوش گوار ہو۔

② عورتوں کا یہ اسلامی حق ہے کہ وہ اپنے جسم کے بارے میں آزادانہ فیصلے کریں اور اس

میں ہم بستری سے انکار کرنے کا حق بھی شامل ہے۔

③ عورتوں کا اسلامی حق ہے کہ وہ اپنے پارٹنر (شریک حیات) کے بارے میں آزادانہ فیصلے کریں اور اس میں دوسری بیوی سے شادی کرنے کے سلسلے میں شوہر کو ''نہ'' کہنے کا حق بھی شامل ہے۔

④ عورتوں کا اسلامی حق ہے کہ وہ اپنے پارٹنر (شریک حیات) کے انتخاب کے بارے میں آزادانہ فیصلے کریں۔

⑤ عورتوں کا اسلامی حق ہے کہ وہ مانع حمل ادویات استعمال کریں اور تولید کے بارے میں آزادانہ فیصلے کریں۔

⑥ عورتوں کا اسلامی حق ہے کہ انھیں جسمانی، جذباتی اور جنسی استحصال سے تحفظ حاصل ہو۔

⑦ عورتوں کا اسلامی حق ہے کہ انھیں جنسی خلوت حاصل ہو۔

⑧ عورتوں کا اسلامی حق ہے کہ انھیں بلوغت پر باہمی رضامندی سے ہم بستری کی صورت میں مجرم بنائے جانے یا سزا یابی سے استثنا حاصل ہو۔

⑨ عورتوں کا اسلامی حق ہے کہ انھیں بدگوئی اور تضحیک و توہین سے استثنا حاصل ہو۔

⑩ عورتوں کا اسلامی حق ہے کہ انھیں جنسی صحت کے اہتمام اور جنسی تعلیم کا حق حاصل ہو۔''

ان ساری دفعات کو دیکھ لیں کہ ان میں کوئی بھی ایسی بات ہے جس کا تعلق واقعی مسلمان عورت کی معاشرتی زندگی کی بہتری سے ہو؟ یا مسلمانوں کی دین سے بے خبری کی وجہ سے مسلمان عورت کو جن ابتلاؤں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، ان کا کوئی حل ان میں ہو؟ یا ان سے ان کا معاشرتی رتبہ بلند ہو سکتا ہو؟ ان میں سے کوئی ایک بات بھی ان میں نہیں ہے۔ ان دفعات میں سارا زور اس امر پر دیا گیا ہے کہ مسلمان عورت بھی مغرب کی حیا باختہ عورت کی طرح آزاد ہو، وہ خود ہی تجربے کر کے اپنے شریک حیات کا انتخاب کرے

اور اس کے بعد بھی اس کا شریک حیات (پارٹنر) اس کے ماتحت رہ کر اپنا وقت پاس کرے، حتی کہ وہ بدکاری کا ارتکاب بھی کر لے تو اسے مستوجب سزا نہ ٹھہرایا جائے (کیونکہ پاک دامنی کا تصور اب فرسودہ ہو گیا ہے اور یہ روشن خیالی کا دور ہے جس میں دیدار یار ہی کا اذنِ عام نہیں بلکہ شادی سے بھی پہلے سب کچھ کرنے کا حق ہے) اسی طرح عورت کو یہ حق بھی حاصل ہو کہ وہ اپنی مرضی سے جتنے چاہے بچے پیدا کرے، بچوں کی پیدائش کے بجائے اس کی صحت زیادہ عزیز ہونی چاہیے۔ علاوہ ازیں اسے یہ حق بھی ہو کہ وہ خاوند کو دوسری شادی کرنے کی اجازت نہ دے۔

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ مغرب کے ان تصورات کو، جو اسلامی تعلیمات کے یکسر خلاف، بے حیائی اور بدکاری کی کھلی چھوٹ کے مترادف اور مسلمان عورت کی عزت و وقار کے یکسر منافی ہیں، انھیں ''اسلامی حقوق'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فإنا للّٰہ و إنا إلیہ راجعون ۔

خرد کا نام رکھ دیا جنوں، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

نام نہاد ''مسلمانوں'' کی وہ نسل نو، جو مغربی ماحول کی پروردہ، انھی کے تعلیمی اداروں کی پرداختہ ہے اور انگریزوں اور غیر مسلموں کے بوائے فرینڈ یا گرل فرینڈ ہیں، ان میں سے بعض مرد وزن کا اس فتراک کا نخچیر بن جانا، اس دام ہم رنگ زمین کا شکار ہو جانا اور استعمار کی اس سازش میں پھنس جانا، ناقابل فہم نہیں ہے کہ وہ تو اسلام اور اس کی تعلیمات سے یکسر ناآشنا ہیں۔ لیکن ان مذہبی خرقہ پوشوں کو کیا کہیے جو تمام فقہائے امت سے زیادہ اپنے آپ کو ''فقیہ'' تمام مفسرین امت سے زیادہ اپنے آپ کو ''مفسر'' اور تمام علمائے امت سے زیادہ اپنے آپ کو ''عالم'' اور تمام محققین امت سے بڑھ کر اپنے آپ کو ''محقق''

سمجھتے ہیں کہ وہ بھی اس گروہ نابنجار کی حمایت میں آستینیں چڑھا کر میدان میں نکل آئے ہیں۔ اس گروہ کے اس رویے ہی سے بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کی اس ''تحقیق'' کے پس پشت کیا مفادات کارفرما ہیں اور ان کی یہ ''فقاہت'' ان کے کس ذہن کی غماز ہے؟ ع

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی!

چودہ صدیاں پہلے خاتم النبیین ﷺ نے عورتوں کے حقوق اور احترام کے تحفظ کا جو چارٹر عطا کیا، اس کے بغیر ہم ان کے سماجی اور معاشرتی رتبے میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ شریعت نے عورتوں کی صنفی اور معاشرتی حیثیت کی مناسبت سے ان کے جو امتیازی مسائل بیان کیے ہیں۔ ان میں بہت سی حکمتیں اور فوائد شامل ہیں۔

عبادت، وراثت، شہادت اور نکاح و طلاق کے علاوہ دیگر مسائل پر عورتوں کے امتیازی حقوق کے سلسلے میں ممتاز دینی مفکر حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے یہ بلند پایہ تحقیقی کتاب پیش کی ہے۔ اس کے مطالعہ و عمل سے ہماری محترم خواتین تعظیم و تکریم کی اونچی سے اونچی مسند پر فائز ہو سکتی ہیں۔

یہ کتاب ایک طرف اسلام کے معاشرتی نظام میں عورت کی اہمیت اور عظمت پر روشنی ڈالتی ہے اور دوسری طرف ان کے مسائل پر شریعت کی حکمت و افادیت بھی واضح کرتی ہے۔ اس کے برعکس مغربی تہذیب نے عورت کو جس طرح رُسوا کیا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ہم سب کی فلاح اسلام کے دامن میں ہے۔ ہمیں مغربی تہذیب کو یکسر خیر باد کہہ دینا چاہیے اور اسلام کی فلاحی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے۔ یہ کتاب اسی دعوت کی آئینہ دار ہے۔

969574054-5
9 789695 740545

ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور • کراچی
اسلام آباد • لندن • ہیوسٹن • نیو یارک